میمونہ خورشید علی کی دو بہت خوبصورت تحریریں......جو ان کی پہچان اور وجہ شہرت بنی

پیش لفظ

کسی بھی فنکار کی کوئی نہ کوئی ایک تخلیق ضرور وجہ شہرت بنتی ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا ''تیری راہ میں رُل گئی وے'' کو اتنی پذیرائی ملے گی کہ مجھے اسے دوبارہ اشاعت کے لیے سوچنا پڑے گا اور یہی تحریر ادبی حلقوں میں میرے لیے وجہ شہرت بن جائے گی۔ اس کہانی میں تو بظاہر کچھ خاص نہیں ہے لیکن اسے ایک بار پڑھنے کے بعد لوگ اسے بھولتے بھی نہیں۔ آپ سب کی محبتوں کا دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔

میں اس رب جلیل کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے ایسے گھرانے میں پیدا کیا جہاں میں نے آنکھ کھولتے ہی ہر قسم کا سکون، آسائش، توجہ اور بے پناہ محبتیں پائیں۔ یہ میرے گھر کے ماحول کا اثر تھا جو میری شخصیت میں اعتماد، حوصلہ اور لکھنے کی صلاحیتوں میں ڈھل گیا۔ ''تیری راہ میں رُل گئی وے'' میرا یہ ناول بے حد پسند کیا گیا۔ اب کتابی شکل میں آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس تحریر کو جو پذیرائی اور اعزاز حاصل ہوا اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ آپ لوگوں کی محبت، دلچسپی اور محنت کا ثمر ہے۔

میں ان سب لوگوں کی مشکور ہوں جنہوں نے اسے پڑھا، سراہا، اور کتابی شکل میں لانے پر اصرار کیا اور اتنی محبت دی کہ دوسری بار اسکی اشاعت کا میں نے سوچا۔

اس کہانی کے بارے میں کہنا بے معنی ہے۔ کیونکہ کہانیاں اپنا مفہوم و معنی خود بیان کرتی ہیں۔ جو کہانی اپنا مفہوم خود واضح نہ کر سکے، وہ کہانی نہیں معمہ ہوتی ہے۔ جو قاری کے ذہن پہ بوجھ ہی ڈال سکتا ہے۔ تفریح مہیا نہیں کرتا۔

اس کتاب میں ایک کہانی اور بھی ہے۔ ''ہوں ناں پھر پگلی''۔ دونوں کہانیوں میں جو چیز مشترک ہے وہ ہے یک طرفہ جنونی محبت اور ایسی محبت کسی کو بھی ہو سکتی ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت......

اور پھر اس بے لوث محبت کا اثر دوسرے فرد پر کس طرح ہوتا ہے۔ یہ دونوں کہانیاں اسی جذبے کو عیاں کرتی نظر آتی ہیں۔ محبت، طاقت، ہٹ دھرمی یا دولت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ واقعی اس کے لیے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور اگر جذبہ صادق ہو تو اثر انداز ہو ہی جاتے ہیں۔

ذاتی طور پر مجھے خود ایسی محبت کرنے والے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو کسی ایک کو ''خاص'' بنا لیتے ہیں۔

میں سمجھتی ہوں میری یہ کتاب ادب کی دنیا میں کوئی اضافہ نہیں ہے بلکہ ان دلوں کے لیے ایک نئے تحفے کا اہتمام ہے جو صرف ایک دوسرے کے لیے دھڑکتے ہیں۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔پچھلے کچھ عرصہ میں میری کتابوں کے حقوقِ اشاعت حاصل کرنے کے بعد ادارہ علم وعرفان نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

دعاؤں کی طالب

میمونہ خورشید علی

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

انتساب!

جان سے پیارے

ابا جی اور امی جی کے نام

آج میں جو کچھ ہوں

ان ہی کی بدولت ہوں

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سپائس گرلز Wanna be may love فلم والیم ڈیک پہ چل رہا تھا اور وہ گاڑی کا اسٹیرنگ تھامے نور جہاں کا گیت گاتے ہوئے مسلسل جھوم رہی تھی۔

سونے دی تویڈری جے میں ہوندی ڈھولنا

سونے دی تویڈری

رہندے گلے نال لگ کے تیرے

''خدا کے واسطے زیبی! میرے حال پہ رحم کرو۔'' ورشہ نے چلا کر کیسٹ پلیئر آف کر دیا۔ ''رحم نہیں آتا تو کچھ شرم کرو۔ انگلش میوزک پہ پنجابی گیت کی آخر تک ہی کیا بنتی ہے۔ میری سمجھ میں تمہارا یہ فارمولا کبھی نہیں آیا۔ بس میری شامت نے دھکا دے دیا تھا جو میں صبح صبح تمہارے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔''

''اوہ! تو گویا تمہیں میرا انتخاب پسند نہیں آ رہا؟'' زیبی نے شرارت سے ہونٹ سیکڑے ''چلو پھر دوسرا گیت سنو۔''

سجناں وے تینوں ساری دنیا پورلاواں گی

کرواے پیار کیوں

تینوں بھی سکھلاواں گی سجناں وے

سجناں وے......

''اوہ۔ شٹ اپ ذوبا یا احمد!'' ورشہ نے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھ کر چلائی۔

اسی لمحے گاڑی غیر متوازن ہو کر دائیں بائیں ڈول گئی۔ زیبی کو بری طرح تاؤ آ گیا۔

''کمینہ! سامنے کیا آنکھیں بند کر کے آ رہا تھا، اتنی بڑی گاڑی بھی دکھائی نہیں دی۔'' اس نے مہارت سے گاڑی کو سنبھالا۔

ورشہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، وہ ابھی تک اسے مہذب گالیوں سے نواز رہی تھی۔

''اب جانے بھی دو۔ میری طرح شاید اس غریب کو بھی علم نہیں تھا کہ گاڑی میں دھمال ڈالتے ہوئے شہزادی التمش تشریف لا رہی ہیں ورنہ اس گستاخی کا ارتکاب ہرگز نہ کرتا۔''

اس کے دیرینہ خطاب پہ وہ ہنس پڑی۔

اور فوراً ہی اپنے سابقہ موڈ میں آنے کی کوشش کرنے لگی۔

تب ہی ورشہ اس کا ارادہ بھانپ کر غرائی۔

''جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟''

''ضرور، ضرور۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولی۔

''اب اگر تم نے گانا گانے کی کوشش کی ناں تو میں تمہیں کسی حجام کی دکان پہ چھوڑ آؤں گی استرا تھام کر محبت سے شوق کو پروان چڑھانا، سمجھیں۔''

''ہاہاہا انتہائی بدذوق کڑی ہے تو۔''

''میں اس اعلیٰ ذوق کی حامل کبھی ہو بھی نہیں سکتی۔''

''سنو'' اسے نئی شرارت سوجھی۔

''کیوں نہ ایسا کریں ریس لگاتے ہیں۔''

کس سے؟''

''اوں...... ہاں...... کسی سے بھی چیلنج کرو۔ کس گاڑی کو پیچھے چھوڑوں؟''

''مجھے فی الحال تم کالج چھوڑ دو۔ پھر اپنے سارے شوق پورے کر لینا۔'' اسکی بات پہ کان دھرے بنا ہی اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

''گرے ٹویوٹا کرولا دیکھ رہی ہو۔ ہمارا پہلا ٹارگٹ یہی ہے۔'' اس کا جنون اور بھاگتی ہوئی سوئی۔ ورشہ نے ہول کر اپنا دل تھام لیا۔

''وہ تو بہت آگے ہے۔'' وہ گھگھیا گئی۔

''بے وقوف ہمیشہ مقابلہ آگے والوں سے ہی کیا جاتا ہے۔'' وہ پرسکون تھی۔

رینگتی دوڑتی گاڑیوں کے درمیان سے ان کی گاڑی زناٹے بھرتی ہوئی نکل رہی تھی۔ ایسے جیسے فوجی بکتر بند گاڑی کا تعاقب کر رہی ہو۔

دوسرے ہی لمحے گاڑی گرے ٹویوٹا کرولا کے ساتھ آ گئی اور پھر اگلے ہی لمحے اس سے بھی آگے نکل گئی۔

''کہو کیسی رہی؟'' وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔

''سرخ فیتا تو توڑ دیا۔ اب کیا مجھ سے نوبل پرائز بھی لوگی۔''

ورشہ نے بج پڑتے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں مسلا۔

دفعتاً بلیک کاواسا کی گولی کی سی رفتار سے ان کے پاس سے گزری۔ دونوں نے یکلخت اس کی طرف دیکھا۔ ورشہ نے کوئی توجہ نہ دی۔ جب کہ وہ جل بھن کر بولی۔

''یہ کمینہ ہمیں ریس کا سگنل دے کر بھاگا ہے۔''

''مگر میں نے تو اس کے ہاتھ میں کوئی جھنڈی نہیں دیکھی۔''

ورشہ اس کے خطرناک ارادے سے خوفزدہ ہو کر پناہ مانگنے لگی۔

''مگر میں نے دیکھی ہے۔'' اس نے اسپیڈ بڑھا دی۔

ٹریفک کا ایک اژدھام سڑک پر رواں دواں تھا۔ ننھے ننھے بچے لاابالی پن سے سڑکوں پہ بھاگتے ہوئے اسکولوں کی طرف جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ موسم میں بلا کی خنکی تھی۔ شفق کی لالی میں برستا ہوا کہر عجیب دلفریب منظر پیدا کر رہا تھا۔ وہ اپنی پسندیدہ سواری پہ اپنی دھن میں مگن، دوڑتے بھاگتے مناظر سے لطف اندوز ہوتا اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔

''فور وہیل کا مقابلہ ٹو وہیل سے کرنا کہاں کا انصاف ہے زیبی۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں احتجاج کیا۔ پھر اسے جتنی بھی قرآنی آیات آتی تھیں۔ اس عرصے میں وہ سب کچھ پڑھ ڈالی تھیں۔

''مقابلہ جرات کا ہے سائیں! وہیل کا نہیں۔''

اس نے مزید اسپیڈ بڑھا دی۔ ورشہ کا بلڈ پریشر اس سے بھی کہیں زیادہ اوپر چلا گیا۔

اچانک ہی اسے احساس ہوا۔ پیچھے آتی گاڑی مسلسل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ شاید اس کا وہم ہو...... وہ معمول کی طرح اپنی پسندیدہ اسپیڈ سے بائیں طرف چلا رہا تھا جو کسی حد تک تیز رفتاری کے زمرہ میں آتی تھی۔

''اگر ہم اسے نہ ہرا سکے تو؟'' ورشہ نڈھال سی ہو کر بولی۔

''ایسا کبھی ہوا ہے کہ ذوبار یہ احمد کسی میدان میں ہار جائے۔''

وہ دو تین گاڑیوں کے درمیان میں اس طرح نکلی کہ وہ چونک گیا۔

چونکہ اس کی منزل آ گئی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی سواری کی رفتار قدرے دھیمی کر لی۔ اور وہ زن سے اسے وکٹری کا نشان دکھاتے ہوئے با آسانی اس کے پاس سے گزر گئی۔

جہاں داد نے بے حد حیرانی سے میرون ہنڈا کار کو دیکھا جس میں ہنستا مسکراتا نسوانی چہرہ جھانک رہا تھا اور پھر لمحوں میں ہی سب کچھ منظر سے غائب ہو گیا۔

''آہا'' وہ خوشی سے فاتح کی طرح جھوم رہی تھی۔ ''داد نہیں دو گی؟''

''لعنت دوں گی۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ اس نورا کشتی کے چکر میں ہم کالج سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔''

''ہائیں کیا واقعی؟'' اس نے آنکھیں سکیڑیں۔

''باپ رے'' یہ جان کر کہ کالج پیچھے رہ گیا ہے اس نے جلدی جلدی گاڑی ریورس کی۔

☆ ☆ ☆

پرنسپل صاحب کسی طویل میٹنگ میں مصروف تھے، اور وہ اس عرصے میں ان کے آفس کا اچھی طرح سے جائزہ لے چکا تھا وہی گورنمنٹ کے اداروں جیسا عام سا آفس تھا۔

سبز چادر سے ڈھکی ہوئی بڑی سی میز۔ لکڑی کی کرسی، جس کی پشت والی دیوار پہ قائداعظم کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔

یہ معمہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ ہمیشہ ہی آفیسر کے کمرے میں یہ تصویر اس کی پشت پہ ہی کیوں لگتی ہے۔ یہ بھی یقیناً انگریزوں کی ہی ڈالی گئی داغ بیل ہوگی وہ تو یہاں سے نقل مکانی کر گئے اور ہم اب تک ان کی نقل کر رہے ہیں۔ دیوار پہ جا بجا قائداعظم اور علامہ اقبال کے اقوال زریں جگمگا رہے تھے ساتھ ہی کالج کے اساتذہ، پرنسپل اور دوسری سیاسی مشہور شخصیات کی کالج کے ہونہار طلبہ وطلبات کی تصاویر بھی نمایاں تھیں۔

اس کے علاوہ وہ طلبہ وطالبات جو یقیناً زیادہ ہونہار تھے، ان کی تصاویر علیحدہ علیحدہ اپنے میڈل اور تمغوں کے ساتھ جگمگا رہی تھیں، ایک چہرہ ہر تصویر میں نمایاں تھا جو اسے دیکھا بھالا لگا۔ مگر وہ بوجھ نہیں پایا کہ یہ چہرہ کہاں دیکھا ہے۔

تمام لڑکیاں ہی ایک جیسی ہوتی ہیں۔

تصویروں کا جائزہ ترک کر کے اس نے فرنیچر اور پردوں پہ غور فرمانا شروع کر دیا جس کی بدولت اس کمرہ میں کچھ جدت اور تازگی کا احساس تھا پھر اس نے وال کلاک پہ نگاہ ڈالی۔

تقریباً پونے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔

وہ پہلو بدل کر پھر پڑھی پڑھائی خبریں پڑھنے لگا۔

اگر وہ گھر سے اخبار پڑھ کر نہ نکلتا تو یہ بوسیدہ خبریں اسے یقیناً طویل بوریت سے بچا سکتی تھیں۔

بوریت سے بچنے کے لیے تو جیب میں سگریٹ بھی رکھا تھا لیکن سامنے ہی میز پہ لکھا ہوا رکھا تھا۔

''سگریٹ نوشی منع ہے۔'' کتنی عجیب بات تھی اس کے ساتھ ہی کرسٹل کا نفیس سا ایش ٹرے بھی رکھا ہوا تھا۔ جب سگریٹ نوشی منع تھی تو پھر یقیناً پرنسپل صاحب کنگھی کرتے ہوئے اس میں اپنی صورت دیکھتے ہوں گے۔

اس نے حیرت سے صاف ستھرے ایش ٹرے کی طرف دیکھا۔

اتنے میں چپراسی دوسرا کپ چائے کا لے آیا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ پہلے کپ کی چائے میں مکھی تیر رہی ہے اور صاحب اخبار سے شغل فرما رہے ہیں۔

''سر! آپ نے ابھی تک چائے نہیں پی، یہ لیجئے میں دوسری چائے لے آیا ہوں۔'' چپراسی نے پرانی چائے اٹھا کر بھاپ اڑاتی چائے سامنے رکھ دی۔

''نہیں شکریہ، یہ لیجاؤ۔ میں چائے نہیں پیتا۔'' چپراسی کو شک ہوا صاحب جھوٹ بول رہے ہیں۔

''حیرت کی بات ہے کہ آپ پروفیسر ہو کر چائے نہیں پیتے۔''

''تم نے کتنا پڑھا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں سر۔''

''چائے پیتے ہو؟''

''کیوں سر؟''

''کیوں کہ تم مجھ سے بڑے پروفیسر لگتے ہو۔''

''سر! آپ تو ناراض ہو گئے، میں تو یونہی۔''

''میں نے کہا ناں واقعی میں چائے نہیں پیتا۔''

چپراسی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ نہ ناک پہ عینک تھی، نہ چائے کا شوق، یہ کیسا پروفیسر تھا۔

''لے جاؤ یار! اسے، اس سے قبل دوسری مکھی اس میں تیرنے لگے۔'' اس نے جھنجھلا کر کہا اور اخبار رول کر کے میز پر پٹخ دیا۔

چپراسی چائے لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسی لمحے پرنسپل صاحب کمرے میں تشریف لے آئے۔

''السلام علیکم سر!'' وہ اپنی نشست سے اٹھا۔

''والسلام۔''

''مجھے آپ کا پیغام مل گیا تھا۔ تشریف رکھیے۔ آئی ایم سوری میں میٹنگ چھوڑ کر نہیں آ سکتا تھا'' پرنسپل صاحب کرسی پہ بیٹھ گئے۔

''اینی وے سر۔'' اس نے گویا فارمیلیٹی ادا کی۔

''بیگ صاحب سے ملاقات ہوئی؟ ارے ہاں وہ تو خود میٹنگ میں شامل تھے۔'' ساتھ ہی انہوں نے انٹرکام پہ انگلی رکھ دی۔

''چپراسی بوتل کے جن کی طرح حاضر تھا۔

''بیگ صاحب کو بلائیے۔''

''اور سنیں اگلی بار جب آئیں تو ساتھ چائے بھی ہو۔''

''اور سر، آپ کے لیے کیا لاؤں؟''

جہاں داد کو لگا جیسے چپراسی نے اسے چڑایا ہو۔

''چائے کے علاوہ کچھ بھی۔'' اس نے جان چھڑائی۔

''جہاں داد صاحب! آپ چائے نہیں پیتے؟''

پرنسپل کو تعجب ہوا۔

''نہیں سر'' وہ سادگی سے مسکرایا۔ ''دیہاتی ماحول کا پروردہ ہوں ناں اس لیے۔'' اس نے ''کیوں'' کا جواب دیا۔

''تو پھران کا پسندیدہ مشروب لے آئیے۔''

''سر! لسی نہیں مل سکتی۔''

جہاں داد نے گھور کر چپراسی کی طرف دیکھا۔

''انار کا جوس مل سکتا ہے۔''

''اس سردی میں انار کا جوس۔'' چپراسی دانت بجاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

''میرا خیال ہے۔ آپ آج ہی سے چارج سنبھال لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' پروفیسر سلطان بیگ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''کیونکہ کل میری لاسٹ ڈیٹ ہے۔ نیکسٹ ویک تک مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ میری ہی موجودگی میں اسٹوڈینٹس سے متعارف ہو جائیں اس طرح اسٹوڈینٹس کا رسپانس بھی ہمیں مل جائے گا۔ بے شک آپ کی قابلیت پہ تو ہمیں شک نہیں لیکن چونکہ سٹیٹ خاصا خشک سبجیکٹ ہے اور کسی حد تک ٹف بھی۔ اس میں آپ کی ذہانت کا اندازہ اس امر سے لگایا جائے گا کہ آپ اس ذہانت کو اسٹوڈینٹس میں کس طرح منتقل کرتے ہیں۔ کیونکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ قابل سے قابل استاد بھی عام طالب علم تک اپنی سوچ کی رسائی پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتا'' سلطان بیگ اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ انہیں آکسفورڈ یونیورسٹی نے بلایا تھا۔

''کیوں نہیں سر۔'' جہاں داد آمادگی سے مسکرایا۔ ''بے شک آپ میرا کسی بھی طرح امتحان لے سکتے ہیں۔ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔''

سلطان بیگ اسے توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''آپ تو پہلی ہی جست میں انٹرویو پاس کر گئے تھے۔ یہ تو محض فارمیلیٹی سمجھئے ہمارے پرنسپل صاحب نے تو آپ کے ڈاکومینٹس دیکھ کر ہی سلیکٹ کر لیا تھا۔''

''ظاہر ہے سر! ایک ہونہار پروفیسر کے جانے کے بعد انہیں کسی نہ کسی کو فوری طور پہ رکھنا ہی تھا۔''

''ایسی بات نہیں ہے جہاں داد صاحب! اکیس امیدواروں میں سے آپ نامزد ہوئے ہیں اور یہ محض آپ کی قابلیت ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔''

''جہاں داد آہستہ سے مسکرا دیا۔

''در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آدمی کبھی ایسی بات کر جائے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔''

بیگ صاحب مسکرا دیے۔

''یہی تو المیہ ہے اس معاشرے کا...... اس سے پہلے کتنی جگہ اپلائی کیا تھا؟''

''جتنے بھی اس شہر میں بینک ہیں۔اس کے بعد خواتین کالجز بھی ٹرائی کیے۔'' وہ شانے اچکا کر تلخی سے ہنسا۔

''اب تو آپ خوش ہیں؟''

''میں خوش نہیں ہوں۔ کیونکہ آپ مجھے برطانیہ کا مشکور کر کے جا رہے ہیں جنہوں نے مسلمانوں پہ نصف صدی سے زائد حکومت کی تھی۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

''اگر آپ کو آکسفورڈ یونیورسٹی سے بلاوا نہ آتا تو میری گنجائش کبھی بھی ادھر نہ نکلتی۔''

''بالکل درست ہے آپ کی بات۔لیکن اب یہ بھی تو دیکھئے وہی برطانیہ اب اسلام کی تعلیمات دینے کے لیے مسلمانوں کو اپنے ہاں مدعو کر رہا ہے۔''

''اسلام کی تعلیمات دینے کے لیے نہیں محض اپنے انسٹی ٹیوٹ کی ساکھ کو بحال رکھنے کے لیے، ایک معمولی پرزے کی ضرورت ہے انہیں ...... جسے آپ اپنی ترقی سمجھتے ہیں۔لیکن میں سمجھتا ہوں درحقیقت وہ ہر شعبے میں اپنا علم بلند رکھنا چاہتے ہیں ...... آکسفورڈ یونیورسٹی جس کی شہرت دنیا بھر میں ہے یہ کیسے ممکن ہے وہاں ایسے علم کو نہ سکھلایا جائے جس کے ماننے والوں کی تعداد یہودیوں کے برابر ہے۔''

بیگ صاحب اس کی مدلل گفتگو پہ نرمی سے مسکرا دیے۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

منور کر گوشہ جہاں بھی تیرا قیام ہو

تو جہاں داد صاحب! اسلام تو ایک چراغ کی طرح ہے۔ہم یہ کیوں دیکھیں کہ کوئی ہمیں کس طرح استعمال کر رہا ہے ...... ہمیں تو تبلیغ کرنی ہے دم آخر تک ...... تمام تر اغراض و مفاد سے بالاتر ہو کر کہیں بھی کسی بھی مقام پہ بہرحال اگر آپ واقعی برطانیہ کے مشکور ہیں تو آپ کو چاہیے جلد از جلد شکریے کا خط لکھیں ...... میں پہلی فرصت میں برطانیہ والوں تک پہنچاؤں گا۔''

جہاں داد ہنس پڑا۔

''چلیے کلاس ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔'' انہوں نے ریسٹ واچ گھمائی۔

☆ ☆ ☆

دونوں یکے بعد دیگرے کلاس روم میں داخل ہوئے۔معمول کی طرح کلاس انتہائی نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے احترام سے کھڑی ہوگئی۔

''سٹ ڈاؤن کلاس!'' سر بیگ نے معمول کی طرح کہا۔

اسٹوڈینٹس بیٹھ گئے، لیکن ان کی پرشوق نگاہیں نوواردِ ہستی پہ جمی تھیں۔

''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کچھ عرصہ کے لیے مجھے انگلستان بلایا جا رہا ہے، اسلامیات پڑھانے کے لیے یہ ہماری خوش نصیبی ہے

کہ عالمی شہرت یافتہ جامعہ نے ہمیں یہ اعزاز بخشا ہے۔ کالج میں اسلامیات کے اساتذہ تو اور بھی بہت ہیں، لیکن شماریات کے معاملے میں ہم خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ اب یہ پریشانی بھی حل ہو گئی۔"

"انہوں نے جہاں داد کی طرف ستائشی انداز میں دیکھ کر کہا۔

"یہ آپ کے نئے پروفیسر ہیں؟ آج سے یہ آپ کو اسٹیٹ پڑھائیں گے۔ بلکہ سمجھائیں گے ان کا نام جہاں داد ملک ہے۔ یہ ان کا پہلا تجربہ ہے۔ امید ہے آپ ان کے ساتھ ٹھیک ٹھاک تعاون کریں گے۔" کلاس متحیر سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"تو پھر کیسے لگے آپ کو اپنے نئے ٹیچر؟"

انہوں نے کلاس کو کھلے دل سے اظہار رائے کا موقع دیا۔

"بہت اچھے۔"

"بہت ہینڈسم۔"

"نام بہت یونیک سا ہے۔"

"ہمیں یہ اس خشک مضمون کے پروفیسر لگ ہی نہیں رہے۔"

"کیا واقعی یہ ہمارے نئے استاد ہیں؟"

"کلاس سے رنگ برنگی آوازیں اور جملے سننے کو ملے۔

جہاں داد اس قدر بولڈ رسپانس پہ خفیف سا ہو گیا۔

سر بیگ، کلاس کی شرارت پہ مسکرا رہے تھے۔

"اب یہ آپ کو خود ثبوت دیں گے کہ واقعی یہ آپ کے نئے استاد ہیں یا میں مذاق کر رہا تھا۔"

"او کے جہاں داد صاحب! میں اب چلتا ہوں۔ آپ اپنی کلاس سے نمٹیے باقی کلاسز کا ٹائم ٹیبل آپ اسٹاف روم سے لے لیجئے گا۔ او کے کلاس بہت لمبے عرصے کے لیے خدا حافظ۔"

"سر آپ جا رہے ہیں؟" کلاس ایک دم ہی رنجیدہ دکھائی دینے لگی۔

"سر! ہم آپ کو بہت مس کریں گے۔"

"سر! انگلستان میں اسلامیات پڑھانے کا فائدہ ہی کیا ہے؟"

"سر! حقیقتاً ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔"

"ہم آپ کو کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔"

"سر جب آپ آئیں گے تو نجانے ہم کہاں ہوں گے۔"

کلاس کی والہانہ محبت پہ سربیگ کی آنکھیں پانیوں میں چمک گئیں۔

کلاس کے چہرے بجھے ہوئے تھے۔

''واقعی میں بھی آپ لوگوں کو بہت مس کروں گا۔'' وہ اداسی سے مسکرائے۔ جہاں داد، استاد اور طالب علموں کے مابین دلی لگاؤ سے متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

''جہاں داد صاحب! یہ میری بہت عزیز کلاس ہے...... شاید مجھے کبھی ایسے اسٹوڈینٹس نہ ملیں اور خاص طور پہ ایک طالبہ جسے میں ہمیشہ ہر مقام پہ یاد رکھوں گا۔''

وہ شفقت وشرارت سے ذوباریہ کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ جو کبھی بھی اس طرح منہ لٹکا کر نہیں بیٹھی تھی۔

جہاں داد نے اس پہ نگاہ ڈالی۔ یہ وہی چہرہ تھا جو پرنسپل کے آفس کی دیواروں پہ جگہ جگہ چسپاں تھا اپنے اعزاز اور تمغوں سمیت۔

''مسلسل چار سال سے یہ ہر فیلڈ میں کامیابی کے جھنڈے گاڑتی چلی آ رہی ہیں...... کالج کی نہ صرف ہونہار بلکہ دلیر ترین طالبہ ہیں۔''

ذوباریہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سربیگ سے اس قدر شدید ناراضگی تھی کہ ابھی تک اس نے چہرہ اٹھا کر نئے سر کو بھی نہیں دیکھا تھا۔

غصہ تھا سربیگ پہ کہ انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے ہی کیسے کر لیا تھا۔

کالج میں آتے ہی اس خبر نے اسے شدید دھچکے سے دوچار کیا تھا جو اس کے لیے انتہائی غیر یقینی تھی۔

''کھڑی ہو جایئے ذوباریہ احمد!'' سربیگ نے اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے اٹھنے کو کہا مگر وہ روٹھے سے انداز میں بیٹھی رہی۔

''میں چاہتا ہوں، آج کے اس اہم دن پر تم سب سے زیادہ بہادری اور خوش دلی کا مظاہرہ کرو اور پھر رخصت کرنے والے کو خوش دلی سے رخصت کرنا چاہیے تا کہ سفر تازگی سے گزرے۔''

وہ خود آبدیدہ ہونے لگے مگر ذوباریہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ایک سینئر کے ساتھ طالب علم کی ایسی گستاخی جہاں داد کو کچھ عجیب سا لگا اس نے روسٹرم پہ ہلکا سا پین بجایا۔

''پلیز اسٹینڈ اپ ذوباریہ احمد!'' اس کا انداز تادیبی تھا۔

ذوباریہ چاروناچار کھڑی ہو گئی۔

''اینڈ پلیز اسٹینڈ اپ آل کلاس۔'' تمام لڑکے لڑکیاں بھی فوراً کھڑے ہو گئے۔

''ایک اچھا استاد عظیم محسن کی طرح ہوتا ہے۔ اپنے محسن کو مسکرا کر خدا حافظ کیجیے تا کہ وہ آپ کو ہمیشہ یاد کر کے خوش ہوں۔''

''کلاس جبراً چہروں کے زاویے بدلنے لگی ذوباریہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو رواں ہو گئے وہ ضبط کرنے کی کوشش میں چہرہ جھکائے کھڑی رہی۔

''وش یو بیسٹ آف لک کلاس!'' سربیگ خود آبدیدہ ہو گئے تھے، پھر انہوں نے مسکرا کر جہاں داد سے مصافحہ کیا اور کلاس روم سے باہر نکل

گئے۔

کلاس کا ماحول افسردہ اور بوجھل سا ہو رہا تھا۔

''سٹ ڈاؤن پلیز'' سب بیٹھ گئے مگر ذوباریہ کھڑی رہی۔

ورشہ نے پلو کھینچ کر اسے بٹھایا۔ ذوباریہ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ اس نے آنسوؤں کے ریلے کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑ دیا۔ آخر اسے ضرورت ہی کیا ہے اتنا جذباتی ہونے کی۔ جاتے ہیں تو جائیں۔ میری بلا سے۔'' اس نے خود کو ملامت کرتے ہوئے ہتھیلی سے آنسو رگڑے۔

''جایئے پانی پی کر آیئے۔'' جہاں داد نے ایک نگاہ غلط اس پہ ڈالی اور رجسٹر دیکھنے لگا۔

ذوباریہ اس حکم پہ چڑ گئی...... سخت غضب ناک حالت میں چہرہ اوپر کیا اور پھر جیسے نگاہیں جھکانا بھول گئی۔ دوسرے ہی لمحے جہاں داد نے رجسٹر بند کر دیا، جیسے اس بور فضا سے سخت اکتا گیا ہو......

''اوکے کلاس! انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی...... فریش موڈ اور فریش ماحول میں۔''

وہ کمرے سے نکل گیا...... کلاس بیک وقت دو طرح کے موڈ میں باتیں کرنے لگی۔ لیکن وہ اسی موڈ میں مبتلا ایک نئے ماحول میں داخل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو واقعے ایک ہی وقت میں اس طرح رونما ہوتے ہیں کہ انسان خود بھی اندازہ نہیں لگا پاتا کہ وہ کس واقعہ کے زیرِ اثر زیادہ دیر تک رہا ہے۔

کون سی بات خوشگوار ثابت ہوئی اور کون سی ناخوشگوار...... عجیب طرز کی خاموشی سی چھا جاتی ہے۔

وہ محض اداس نہیں تھی، بلکہ گہری یاسیت میں مبتلا تھی۔

''پلیز زیبو! خود کو نارمل کرو میں تمہاری لٹکی ہوئی شکل دیکھ کر اکتا گئی ہوں۔ ٹھیک ہے وہ ہمارے بہت پیارے استاد ہیں، سب ہی کو ان کے جانے کا بے حد افسوس ہو رہا ہے مگر خدارا اتنا افسوس بھی مت کرو کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے۔''

وہ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتی رہی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

''اگر تمہیں ان کے جانے کا اتنا ہی افسوس ہو رہا ہے تو مائیگریشن کرلو۔ برطانیہ جانا ویسے بھی تم جیسے لوگوں کے لیے اتنا مشکل اور ناممکن...... نہیں ہے مگر پھر تم ہم سب کو مس کرو گی۔''

مگر ادھر ہنوز خاموشی ہی کا راج تھا۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہی لڑکی ہے جو صبح کالج میں ایک ہنگامہ کرتی ہوئی آرہی تھی۔

''اوہ یار گاڑی کی کچھ اسپیڈ تو بڑھاؤ تمہارے ساتھ سفر کرتے ہوئے عادت سی پڑ گئی ہے، ریس کا گھوڑا بننے کی۔ نارمل اسپیڈ میں مزہ ہی نہیں آتا اور ویسے بھی اگر میں درست حالت میں گھر گئی تو گھر والے مجھ پہ شک کریں گے کہ میں کسی اور کے ساتھ آئی ہوں۔ اس لیے بہتر ہے تم مجھے اپنی شریکِ سفر ہونے کا ثبوت دو۔''

بہت دیر کے بعد وہ مسکرائی تو ورشہ نے سکون کا سانس لیا۔

''تھینکس گاڈ کہ تم نارمل ہوئیں۔'' اس نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی لیکن چونکہ صبح کی نسبت اب سڑک پہ رش زیادہ تھا۔ اس لیے اسے اسپیڈ کم کرنا پڑی۔ بڑی احتیاط سے بچا بچا کر گاڑی رش میں سے نکالی۔ لیکن اچانک ہی مڈگارڈ کسی چیز سے ٹکرایا

فوراً ہی بریک نہ لگاتی تو بائیک پر سوار اپنی سواری سمیت دور جا پڑتا۔

''ارے، سر آپ؟'' دونوں نے حیرت سے جہاں داد کی طرف دیکھا وہ اگر فوری طور پر سیدھا پاؤں زمین پہ نہ لگاتا تو اس حادثے کا شکار ہو جاتا۔

''سوری سر...... چوٹ تو نہیں لگی؟'' وہ دونوں گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے باہر نکل آئیں۔

''نہیں، البتہ نمبر پلیٹ ضرور ٹوٹ گئی ہے۔'' وہ کچھ چڑچڑے سے انداز میں بولا، لیکن پھر انہیں پہچانتے ہی تھوڑا سا مسکرا دیا...... مگر وہ پشیمان ہو گئیں۔

''سوری سر......'' ورشہ نے پشیمانی کا اظہار کیا۔

''اینی وے......اس میں آپ کا بھی کیا قصور، یہ گاڑی چیز ہی ایسی ہے کہ اس میں بیٹھ کر آدمی کا خوامخواہ پرواز کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

''نہیں سر! واقعی یہ سب اچانک اور خود بخود ہوا ہے......ورنہ ذوباریہ ڈرائیو بہت اچھی کرتی ہے......''

''وہ میں صبح دیکھ چکا ہوں۔ غالباً یہی میرون اکارڈ صبح اسی سڑک پہ فائر بریگیڈ بنی ہوئی تھی۔ ایک بار تو مجھے ایسا لگا جیسے میرا ہی پیچھا کر رہی ہو۔''

''اوہ......تو سر وہ آپ تھے؟'' دونوں بے ساختہ اپنی بے وقوفی پہ ہنس پڑیں۔ ''دراصل صبح دھند زیادہ تھی ناں، اسلیے چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔''

''اگر آپ کو معلوم ہو جاتا کہ میں آپ کا نیا پروفیسر ہوں تو کیا آپ میرا پیچھا نہ کرتیں؟''

''ہم شریف لڑکیاں ہیں سر! مردوں کا پیچھا نہیں کرتیں......وہ تو آپ کی بائیک کی اسپیڈ سے متاثر ہو کر ذوباریہ نے آپ سے ریس کی شرط باندھ لی تھی، ورنہ تو کوئی بات نہیں تھی۔''

دونوں ہی سنجیدہ ہو گئیں۔

''اچھی بات ہے، مگر آئندہ ایسا نہ کیجئے گا کیونکہ یہ ایک خطرناک کھیل ہے......نہ صرف آپ کی جان کو خطرہ ہوتا ہے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اور پھر لڑکیوں کو تو ویسے بھی سیدھے راستوں پر چلنا چاہیے......کیونکہ اگر وہ اکیلی ہوں تو ان کے ساتھ شیطان سفر کرتا ہے اور پھر یہ تو بازیگروں کے کام ہیں جو سرکس کے میدانوں میں ہی سجتے ہیں۔'' وہ استہزائیہ مسکرایا۔ ذوباریہ جل بھن گئی اپنے آپ کو بازیگر کہلائے جانا اسے سخت ناگوار گزرا۔

''اتنی پیاری لڑکی کو ایسے خطاب سے کوئی اندھا ہی نواز سکتا ہے، یہ یقیناً بدذوق ہی نہیں حد سے زیادہ مغرور بھی ہے۔''

''جس اسپیڈ سے آپ موٹر بائیک چلاتے ہیں یہ بھی بازیگروں کا شوق ہے سر اور ایسے شوقین اکثر موت کے کنوؤں میں پائے جاتے ہیں۔'' وہ اپنی ناگواری کو چھپا نہ سکی۔

ورشہ منہ پہ ہاتھ کر ہنسی روکنے لگی۔

جبکہ جہاں داد نے دل کھول کر اس بات سے لطف لیا۔

''غالباً عجیب و حیرت انگیز کام کرنے والے کو بازیگر کہتے ہیں......عجیب یہ نہیں کہ آپ بائیک اسی کی اسپیڈ پہ چلا رہے ہیں عجیب تو یہ ہے کہ آپ فور وہیل کا مقابلہ ٹو وہیل سے کر رہی ہیں اور وہ بھی بے انتشارش میں......لیکن خیر، یہ آپ کا مسئلہ ہے......بہرکیف اب اگر آپ کا آئندہ شرط لگانے کا جی چاہے تو اسی سواری کا انتخاب کیجئے گا جس پہ آپ کا حریف سوار ہوتا ہے کہ آپ کو ہرانے والا شرمندگی سے دوچار نہ ہو سکے اور آپ کو ہارنے میں بھی مزہ چلتا ہوں۔''

اس نے ادھ جلا سگریٹ جوتے کے نیچے مسلا اور اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا۔ جبکہ ذوباریہ اس کی آخری بات پہ بری طرح تلملا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

کالج جوائن کیے اسے ہفتہ ہی گزرا تھا اور اس معمولی سے عرصے میں اس کی شہرت پورے کالج میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

ذوباریہ آج چودہ دن کے بعد کالج میں آئی تو کلاس کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یہ وہی کلاس تھی جس میں بمشکل بیس لڑکے لڑکیاں ہوا کرتے تھے۔ آج ساٹھ کے قریب تعداد لگ رہی تھی۔ تمام تر حالات اور واقعات سے آگاہی تو اسے گاہے بگاہے ملتی رہتی تھی لیکن چشم حقیقت سے جو نظارہ دیکھا وہ زیادہ دلفریب تھا۔

''سنو وہ بھوری بلی بھی اپنی کلاس میں آگئی ہے۔۔۔۔۔۔جس کے پیچھے کالج کے تمام لڑکے مرتے تھے۔۔۔۔۔'' ورشہ کی تازہ اطلاع پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ فارینہ دوسری رو میں پہلی نشست پر براجمان تھی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔

''حیرت کی بات ہے۔۔۔۔۔کالج کے سارے نکھے لڑکے اسی کلاس میں آگئے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''چپ کرو۔۔۔۔۔کلاس میں خاموشی ہے۔'' ورشہ نے ٹھوکا دیا۔

''سنو فارینہ! تمہارے میتھ سمجھ میں آرہا ہے؟'' وہ چھیڑنے سے باز نہیں آئی۔

''ہاں بالکل آسان تو ہے تم نے تو خوامخواہ ہی ہوا بنا رکھا ہے۔'' فارینہ نے کاندھے اچکا کر جواب دیا تو ذوباریہ ہنس پڑی۔

''تمہارے خیال سے زیادہ کیا آسان ہے، سبجیکٹ یا سبجیکٹ کا پڑھانے والا''

فارینہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ کلاس قہقہوں سے گونجنے لگی۔

اسی لمحے جہاں داد نے کمرے میں قدم رکھا، یکلخت ہی سناٹا چھا گیا۔ ذوباریہ کو وہ پہلے دن سے بہت زیادہ مختلف دکھائی دیا۔

چہرے پہ بالکل استادوں والی سختی تھی اور انداز بھی بہت پر تکلف تھا۔

وہ تیزی سے رول کال لینے لگا لیکن پانچویں ہی رول نمبر پہ اس کا قلم ٹھہر گیا، جب اس نے چودہ دن کے بعد پریزنٹ کی آواز سنی۔

''پلیز اسٹینڈ اپ۔۔۔۔۔'' ذوباریہ کھڑی ہوگئی۔

''آپ پچھلے چودہ دن سے کہاں تھیں؟''

''سر! اپنے گھر میں۔۔۔۔۔'' جواب سادگی سے آیا۔۔۔۔۔کلاس میں دبے دبے قہقہے ابھرے۔

''ود آؤٹ اینی ایپلیکیشن۔'' وہ ناراضگی سے بولا۔

''میں نے ورشہ سے کہا تھا کہ سر کہ وہ میری رول نمبر پہ پریزنٹ کہتی رہے۔ لیکن یہ نکمی آپ کو دیکھنے میں اس قدر محو ہوا کرتی تھی کہ اکثر اپنی رول کال پہ بھی پریزنٹ ہونے کا اظہار نہ کرسکی۔''

کلاس ایک بار پھر ہنس پڑی۔

''دس از ٹو مچ'' اس نے غضبناک کیفیت میں روسٹرم پہ ہاتھ مارا۔ کلاس میں فوری طور پر سناٹا چھا گیا۔

''میں آپ کو مسخرہ نظر آرہا ہوں یا آپ اپنے آپ کو بھانڈ محسوس کرتے ہیں کیا مجبوری ہے آپ لوگوں کی جو آپ بار بار ہنستے ہیں۔ یہ کلاس

روم ہے اور میں آپ کا استاد ہوں...... آئندہ میں اس قسم کی بدتمیزی قطعی برداشت نہیں کروں گا اور نہ ہی دیکھوں گا کہ آپ کالج کی سنیئر کلاس ہیں۔ سمجھے آپ لوگ...... اور مس ذوباریہ احمد! آپ کلاس روم سے باہر جا سکتی ہیں کیونکہ مسلسل ایبسنٹ کی وجہ سے میں آپ کا نام کلاس سے نکال چکا ہوں۔ یہ جواز جا کر آپ پرنسپل کو بتایئے، شاید، انہیں اس بات پہ ہنسی آجائے...... مہربانی سے اب آپ جا سکتی ہیں......''

اس قدر شدید انسلٹ پہ ذوباریہ کا چہرہ غصے وخفت سے لال بھبھوکا ہو گیا...... کلاس کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا...... وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کلاس سے باہر نکل گئی۔ وہ نئے سرے سے حاضری لینے لگا۔ پھر چاک اٹھا کر بلیک بورڈ پہ گراف بنایا اور سوال سمجھانے لگا، اسی لمحے، کلاس روم کا دروازہ آہستہ سے بجا۔ جہاں داد نے مڑ کر دیکھا کلاس بھی ادھر متوجہ ہوگئی۔ چپراسی انتہائی مودب انداز میں کھڑا تھا۔ پھر اجازت سے اندر آیا اور ایک پرچی اسے تھما دی۔ پرچی پہ نگاہ پڑتے ہی اس کی پیشانی پہ ناگواری کی لکیر کھنچ گئی۔

''ایکسکیوزمی کلاس۔'' وہ چاک زمین پہ اچھال کر ہاتھ جھاڑتا ہوا چپراسی کے پیچھے کلاس روم سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

''مے آئی کم آن سر!'' لہجہ سخت نروٹھا تھا۔

''آیئے آیئے جہاں داد صاحب!'' پرنسپل صاحب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ سر جھکائے صوفے پہ بیٹھی تھی۔

''آئی ایم سوری جہاں داد صاحب! میں نے آپ کو زحمت دی آیئے بیٹھیے۔'' پرنسپل نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے سامنے والی کرسی پہ بیٹھنے کی پیش کش کی وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''ذوباریہ! ادھر آئیں آپ۔'' وہ ان کے قریب کھڑی ہو گئی۔

''اپنے ٹیچر سے ایکسکیوز کریں آپ اور ان کی اجازت سے کلاس روم میں جائیں۔''

''مگر سر! میں نے تو کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ انہوں نے وجہ پوچھی میں نے بتا دی۔''

اس کی ڈھٹائی پہ جہاں داد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''کیا شاگرد کو زیب دیتا ہے کہ وہ استاد کو اتنی لاپروائی سے جواب دے۔'' پرنسپل صاحب کا لہجہ ملائم اور انداز سمجھانے والا تھا۔

وہ خاموش ہوگئی۔

''سوری کیجیے۔'' انہوں نے سختی سے حکم دیا مگر لہجہ دھیما تھا۔

''کیا یہ اتنی نواب زادی ہے کہ پوری کلاس کے سامنے سوری کرتے ہوئے اس کی شان گھٹ جاتی۔ جو پرنسپل صاحب یہاں علیحدگی میں اسے بلا کر سوری کرا رہے ہیں۔''

جہاں داد کو پرنسپل کا انداز سراسر خوشامدی اور غیر منصفانہ لگا۔

اس کے تن بدن میں چنگاریاں سلگ گئیں اور وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔

''میں نے کیا کہا ہے ذوبار یہ آپ سے؟'' پرنسپل نے اصرار کیا جہاں داد نے تیزسی نگاہ اس پہ ڈالی۔

''سوری سر!'' وہ گردن جھکا کر بالآخر آہستگی سے بول ہی پڑی۔

پرنسپل صاحب دھیرے سے مسکرا دیے، ایسے جیسے کسی بزرگ نے دو بچوں کے مابین صلاح کرادی ہو۔

''اب آپ کلاس روم میں جائیے آپ کے ٹیچر ابھی تھوڑی دیر میں آرہے ہیں۔'' ذوباریہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

پرنسپل اس کی متوجہ ہوگئے۔

''دراصل پروفیسر جہاں داد صاحب! یہ لڑکی ہمارے کالج کی سب سے ہونہار طالبہ ہے۔ بہت ہی لائق، بہت ہی جینیس بچی ہے۔ یہ تصاویر دیکھ رہے ہیں آپ، سب اس کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ حالیہ جو اس کی غیر حاضری ہوئی ہے وہ محض پروفیسر بیگ صاحب کی وجہ سے ہوئی ہے۔ بہت زیادہ مس کر رہی ہے وہ پروفیسر سلطان کو، وہ نہ صرف اس کے استاد تھے بلکہ ان سے فیملی تعلقات بھی بہت زیادہ تھے۔''

''یہ بات وہ بھی خود بیان کر سکتی تھی سر!'' وہ بہت دیر کے بعد ناراض سے لہجے میں بولا، گویا جیسے پرنسپل کی وضاحت پسند نہ آرہی ہو۔

پرنسپل صاحب مسکرا دیے''بعض لوگ رشتوں سے تعلق چھپا کر رکھنے کے عادی ہوتے ہیں، بہر حال یہ اس کی غلطی ہے، انشاءاللہ اب آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''شکایت تو تب دور ہوتی سر جب آپ اسے کلاس روم میں سوری کرنے کو کہتے۔''

وہ کرسی دھکیل کر اٹھ گیا۔''او کے سر چلتا ہوں کلاس انتظار کر رہی ہوگی۔''

''ضرور کیوں نہیں۔'' انہوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا وہ ان کے کمرے سے باہر آگیا۔

''کلاس اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے بلیک بورڈ پہ حل کیا گیا ادھورا سوال مٹا دیا۔

پچھلے ہفتے جو ہم نے چیپٹر پڑھا تھا۔ اس کے چند فارمولوں کا میں آپ سے ٹیسٹ لینا چاہتا ہوں کہ وہ آپ لوگوں کی سمجھ میں کس حد تک آیا ہے، پھر ہم آگے بڑھیں گے۔''

پھر اس نے کتاب کھول کر ایک نظر دیکھا اور بلیک بورڈ پہ سوال لکھ دیا۔

پوری کلاس نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ لیکن چند نکموں کے ہاتھ ابھی نیچے تھے اور سر بھی جھک رہے تھے۔

''نواز! ادھر آئیں اور یہ سوال حل کریں۔ اس فارمولے کے تحت۔''

''آئی ایم سوری سر!'' نواز نے کھڑے ہو کر شرمندگی سے معذرت کی۔

''نیکسٹ۔''

''سوری سر!'' ایک اور لڑکا کھڑا ہو گیا۔

''فارینہ آپ؟''

''سوری سر!'' وہ مچل کر سوری کرنے لگی۔

''یو۔''

''سوری سر......'' اگلی لڑکی کھڑی ہو گئی۔

''ذوباریہ احمد آپ!'' اسے سو فیصد امید تھی کہ وہ بھی اٹھ کر یہی لفظ کہے گی۔ سوری سر۔

لیکن وہ بڑی احتیاط سے اٹھی اس کے قریب آئی پھر چاک اٹھایا اور سوال حل کرنے لگی۔

چونکہ اس نے اپنے قد کی مناسبت سے سوال بہت اونچائی پہ لکھا تھا۔ اس لئے ذوباریہ کو پنجوں پہ زور دے کر سوال کے قریب سے ہی جواب شروع کرنا پڑا۔ وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا اور اس کی کارکردگی چیک کرنے لگا۔ وہ بڑی تیزی سے سوال حل کر رہی تھی۔ جہاں داد کی نگاہیں اس کے سراپے سے الجھ گئیں بلیک ہائی نیک پہ ڈارک براؤن جیکٹ، بلیک پینٹ اور بلیک ہی ڈان کارلوس کا جوتا۔

براؤن شولڈر کٹ بالوں کی پونی اور برائے نام شانے پہ جھولتا کالا اسکارف۔

عجیب مردانہ وضع کا حلیہ تھا۔ اس نے تین منٹ میں سوال حل کر کے ''سر'' کی طرف دیکھا۔ ''اینی کوئسچن سر۔''

سوال میں بلا کا اعتماد تھا۔

جہاں داد اس کی ذہانت سے متاثر نظر آنے لگا لیکن اس نے ذہانت کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا۔

''بیٹھ جایئے پلیز۔'' وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اپنی نشست کی طرف بڑھ گئی۔

Now sit down please other people باقی لڑکے لڑکیاں بھی بیٹھ گئے۔ وہ نیا چیپٹر کھول کر سمجھانے لگا، ذوباریہ دل ہی دل میں اس کی ناکام سازش پہ ہنس رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہت ساری گاڑیوں کے درمیان اس نے اپنی موٹر بائیک نکالی اور اسے سیدھے رخ کھڑی کر کے اسٹارٹ کرنے لگا۔ اسی لمحے زوں زوں کی پاٹ دار آواز اسے انتہائی قریب سے آئی اور کھٹ سے ہنڈا سی ڈی 70 موٹر بائیک اس کے ساتھ آ کر کھڑی ہوگئی۔

اس نے چونک کر گردن موڑی، اور پھر گنگ رہ گیا۔

کالے اسکارف کو چہرے اور سر پہ لپیٹے، آنکھوں پہ سن گلاسز چڑھائے وہ بڑے اعتماد سے ایکسلیٹر اور کلچ مٹھیوں میں دبائے بیٹھی تھی۔

پھر ایک پاؤں زمین پہ ٹکا کر اس نے چشمہ اُتارا اور اعتماد سے بولی۔

''چلیں سر!'' اس کی آنکھوں میں بے پناہ چیلنج تھا۔

جہاں داد نے حیرت سے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ تھوڑا سا مسکرائی۔

I like to live in battle feild for all the time (مجھے ہر وقت حالت جنگ میں رہنا اچھا لگتا ہے)۔

جہاں داد نے ایک بار پھر نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''حیرت کی بات ہے سر! آپ کو یاد ہی نہیں آپ نے کیا کہا تھا کہ آئندہ اگر میرا شرط لگانے کو جی چاہے تو میں اس سواری کا انتخاب کروں، جس پہ میرا حریف سوار ہو مگر افسوس کہ مجھے بائیک چلانا نہیں آتی تھی۔ میں پچھلے چودہ دن تک اس لیے کالج میں حاضر نہیں ہو سکی کہ میں بائیک چلانا سیکھ رہی تھی۔ امید ہے اب آپ کو ہار کر شرمندگی نہیں ہوگی۔''

اس نے پھر سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھا لیے۔

جہاں داد نے اس کے چہرے پہ پہلی بار عمیق نگاہ ڈالی ہر نقش اپنی جگہ پہ بے حد متوازن اور دلکش تھا۔

اس کا جارحانہ انداز اور حلیہ کس قدر متضاد تھا بہ نسبت چہرے کے...... لگتا ہی نہ تھا اس نازک وجود میں ایسے عزائم بھی ہوں گے۔ حالانکہ پہلی بار جب اس نے اسے دیکھا تھا تو وہ روتی ہوئی بے حد دلچسپ لگی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا یہ روتی ہوئی لڑکی محض روتی نہیں لڑتی بھی ہوگی۔

اتنی سی لڑکی اور اس سے مقابلہ کر رہی تھی۔ نادانی کی انتہا ہی تو تھی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چہرے پہ تمسخر پھیل گیا۔

اس نے چہرہ بالکل سیدھا کر لیا اور سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں خواتین سے مقابلہ نہیں کرتا، اس لیے یہی کہوں گا، لیڈیز فرسٹ پلیز۔'' اس نے تھوڑی سی بائیک پیچھے کی اس کے انداز پہ ذوباریہ تلملا گئی۔

''مقابلہ کرتے ہوئے میں جنس کا احساس نہیں کرتی۔'' وہ چیخ گئی۔

''لیکن مردوں کو کرنا پڑتا ہے۔'' وہ مسکرایا ''کیونکہ انہیں خواتین کو ہرا کر بھی شرمندگی ہوتی ہے اور جیت کر بھی۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بائیک کا رخ مخالف سمت کر لیا یعنی جس طرح اس کی پیٹھ تھی۔

''دھیان سے گھر جائیے گا، چودہ دن کی پریکٹس اتنی زیادہ بھی نہیں ہوتی۔''

وہ زن سے اپنی بائیک اڑا لے گیا۔ ذوبار یہ پہ دھول کے مرغولوں میں اس کے وجود کو مدغم ہوتا دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

''صاحب! یہ آج کی ڈاک ہے۔''

صفدر نے مختلف رنگوں کے لفافے اس کے سامنے رکھے۔

جہاں داد نے جیب سے لائٹر نکالا اور ان لفافوں کو نذر آتش کرنے لگا۔ اسے پتا تھا کہ یہ کالج کی بیوقوف لڑکیوں کے خط ہوں گے۔ جن میں اس کی بے پناہ تعریفیں کی گئی ہوں گی۔

''صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اس میں بجلی کا بل بھی ہے اور اماں جی کا خط بھی۔'' اس کا ہاتھ رک گیا۔ بجلی کا بل اور اماں جی کا خط اس نے نکال لیا۔

باقی لفافے ایک طرف پھینک دیے ''یہ سب غیر ضروری خط ہیں۔ آئندہ ایسی ڈاک میری انتظار میں مت رکھنا، میرے آنے سے پہلے جلا دیا کرو۔''

''صاحب! ایک بات پوچھوں؟''

''ہوں۔''

''آپ ان خطوط کے جواب کیوں نہیں دیتے؟''

''اماں نے بچپن میں منع کیا تھا پلٹ کر جواب دینے والے لوگ گستاخ ہوتے ہیں۔ تب سے نصیحت پلو میں باندھ رکھی ہے۔ یہ پیسے اور بل اپنے پاس رکھو۔ صبح پہلی فرصت میں جمع کرا دینا اور ہاں میری غیر موجودگی میں ٹی وی کم دیکھا کرو۔ سارا بل اسی خرچے کا ہے۔ سی این این تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا۔ اس سے اچھے پروگرام تمہیں نیچے چائے والے کی دکان پہ مل سکتے ہیں۔ اچھا ہمسایہ وہی ہے جو ہمسایوں کی خبر رکھے اب تم جا سکتے ہو۔''

لڑکا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''عجیب مولانا مزاج آدمی ہیں یہ جہاں داد صاحب بھی...... دینے پہ آئیں تو لاکھ لٹا دیں۔ حساب رکھیں تو سوئیاں گننے لگتے ہیں۔''

اماں جی کا خط کھولنے سے پہلے اس نے سگریٹ بجھا دیا پھر بڑے احترام اور تقدس سے خط کھولا۔

صفحہ قرطاس پہ لفظوں کے موتی بکھرے پڑے تھے۔

یہ یقیناً زہرہ کی لکھائی تھی۔ سارے پنڈ کی عورتیں اسی سے خط لکھواتی تھیں اور وہ بڑے شوق سے یہ کام کرتی تھی۔

اور وہ کتنی حیرانی سے اسے دیکھتا رہتا تھا اور پھر کیسے کیسے نئے نئے سوال کرتا تھا اس سے۔

''یہ خط کیا ہوتا ہے بھرجائی؟'' وہ اس کے پہلو سے چپک کر بیٹھا تھا۔

وہ اس کے سوال پہ ہنس پڑی۔ ”ایک پیغام ہوتا ہے جب کوئی پیارا کسی سے دور چلا جاتا ہے تو اسے اپنی خیریت کے لفظ لکھ کر بھیجتے ہیں اور وہ خط بن جاتا ہے۔“

”کیا ہر دور چلے جانے والے کو خط بھیجا جا سکتا ہے؟“ وہ معصومیت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ زہرہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

”جو لوگ واپس آنے کا کہہ کر جاتے ہیں۔ صرف پردیسی ہوتے ہیں جو کبھی نہ آنے کے لیے چلے جائیں۔ ان کے پاس خط نہیں جاتے وہ ہمیں اپنے پاس بلا لیتے ہیں۔“

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی بات سے وہ اداس ہو گئی تھی۔ اس نے بات بدل دی۔

”تمہاری لکھائی بہت اچھی ہے بھرجائی۔“

”اچھا!“ وہ آنسو صاف کر کے ہنس پڑی۔

”تم سب کو خط لکھتی ہو، مجھے بھی خط لکھا کرو گی؟“

”تو تو میرے پاس ہے۔ خط تو پردیسیوں کو لکھے جاتے ہیں۔“

”ایک دن میں بھی پردیسی بن جاؤں گا، تب تو خط لکھو گی ناں مجھے؟“

”تب نہیں لکھوں گی۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”کیوں؟“ وہ ناراض ہوا۔

”کیونکہ تب تک تو اتنا پڑھ لکھ جائے گا کہ تجھے میری لکھائی بھی بری لگنے لگے گی۔“

”اچھا!“ وہ اداس ہو گیا۔ ”میں زیادہ نہیں پڑھوں گا۔ جب مجھے خط لکھنا آ جائے گا۔ میں پڑھائی چھوڑ دوں گا۔“

”اچھا، وعدہ؟“ وہ ہنس پڑی۔

”وعدہ!“ اس نے جوش سے کہا۔

”صاحب جی! یہ دودھ۔“ صفدر کی آواز پہ وہ چونک پڑا۔

”رکھ دو۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

صفدر دودھ رکھ کر چلا گیا۔

جہاں داد نے خط تہہ کر کے میز پہ رکھ دیا نوکری مل جانے پہ اماں جی نے ڈھیروں مبارکباد دی تھی۔

بار بار کھانے پینے کی تلقین کی تھی۔

لیکن زہرہ نے اپنی طرف سے ایک جملہ بھی نہیں لکھا تھا۔

بس اتنا لکھا تھا کہ ”سگریٹ کم پینا۔“

وہ مسکرا دیا اور سگریٹ جیب سے نکال کر سلگانے لگا۔ دھوئیں کے مرغولے اسے مرضی کے گرداب میں دھکیلنے لگے۔

''میرے بیٹے نے آج پوری چودہ کلاس پاس کر لی ہیں پورے پنڈ میں دیکھنا مٹھائی بانٹوں گی۔''

ماں جی کا خوشی سے برا حال تھا۔ زہرہ بڑے سے مٹکے میں مدھانی ڈالے مکھن نکال رہی تھی۔ ماں جی کی بات سن کر مدھانی روک لی۔

''سارے پنڈ والے تھوتھو کریں گے۔''

وہ جھک کر نل سے ہاتھ دھو رہا تھا، اسی کیفیت میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیوں تھوتھو کریں گے؟'' ماں جی کو غصہ آ گیا۔

''پتر کو آج تک خط تو لکھنا نہیں آیا۔ ماں چلی ہے مٹھائی بانٹنے۔''

وہ مسکرا کر سیدھا ہو گیا، وہ پھر مدھانی چلانے لگی۔

''رب سوہنا خیر کرے۔ کیوں نہیں آتا خط لکھنا۔ لکھوا کے دیکھ لے بے شک کوئی۔'' ماں جی اس بات سے ناواقف تھیں۔

''وعدہ خلاف کے ساتھ رب سوہنا خیر نہیں کرتا۔'' وہ مدھانی چھوڑ کر بھینسوں کے تھان کی طرف چلی گئی اور چارہ الٹ پلٹ کرنے لگی۔

وہ ماں کے پلو سے ہاتھ منہ پونچھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

''پردیسی کو کسی نے خط ہی نہیں لکھا، پھر بھلا وہ کیا جواب دیتا۔''

''ماں جی نے پورے دس خط مجھ سے لکھوا کر بھیجے تھے۔''

''مگر اس میں ایک بھی خط خاص نہیں تھا۔'' وہ اس کے جھمکوں کی طرف دیکھ رہا تھا، جو ابھی کچھ دیر قبل مدھانی چلانے کے لیے ساتھ ساتھ ہل رہے تھے۔ زہرہ کی توجہ چارے کی طرف تھی۔

وہ ابھی کچھ اور بات کرتا کہ ماں جی نے آواز دے لی۔ ''جہاں داد پتر! روٹی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

وہ ماں جی کی طرف آ گیا۔

''آج سردی بہت ہے دھیئے! جہاں داد کے لیے پیٹی میں سے لحاف نکال دینا۔''

''میں بروکیڈ کا لحاف نہیں اوڑھوں گا۔'' وہ روٹی کھا رہا تھا لقمہ روک کر بولا۔

''لے آنا پھر اپنے لیے شہر سے سوتی لحاف۔'' اکبر ملک کو ناگوار گزرا۔

پچھلے برس دو کمبل لے کر آیا تھا میں۔

''وہ تیری ماں نے اپنی بیٹیوں کو دے دیئے ہیں۔''

''پتر، یہاں کی سردی کمبلوں سے نہیں رکتی۔ تو کہے تو تیرے پیو کا کمبل رکھا ہے وہ دے دوں؟''

ماں، باپ بیٹے کے درمیان مفاہمت سے بولی۔ باپ کی طرح اسے باپ کا کمبل بھی سخت اور کھردرا محسوس ہوا، کسی بھی قسم کی نرماہٹ و

گرماہٹ سے عاری۔

''سوجاؤں گا میں ایسے ہی۔'' روکھا سا جواب آیا۔

''انگریزی پڑھ رہا ہے۔ انگلینڈ کے کمبل ہی پسند کرے گا، پاکستانی کمبل تو اسے گدھے کی کھال کی طرح لگتے ہیں۔'' جہاں داد چپ چاپ لقمے چباتا رہا۔

زہرہ اپنے جہیز کا سب سے قیمتی لحاف نکال لائی اور لا کر چپ چاپ اس کے پاس رکھ دیا، شنیل کا میرون نرم و ملائم لحاف، کسی امپورٹڈ کمبل کی طرح لگ رہا تھا۔

''یہ تو نہیں کاٹے گا تمہیں بروکیڈ کی طرح۔'' اس نے اپنی نرم مسکراہٹ سے پوچھا۔ جہاں داد کا لقمہ رک گیا۔

''یہ کیوں لے آئی؟ یہ تو تیرے جہیز کی چیز تھی۔'' ماں جی کو بے حد افسوس ہوا۔

''لے جاؤ دھیئے اسے، یہ تو میرے دلدار کی نشانی ہے۔''

اکبر ملک جو ابھی بیٹے پہ گرج برس رہا تھا یک لخت ہی رنجیدہ دکھائی دینے لگا۔

''جب انسان ہی نہیں رہے تو پھر نشانیوں کا کیا ہے بابا!'' وہ لحاف رکھ کر رسوئی میں چلی گئی۔ بہت دیر تک ماحول پہ افسردگی چھائی رہی۔

رات جب وہ سونے کے لیے بستر پہ لیٹا تو لحاف اپنے اوپر پھیلا لیا، لحاف میں ایک عجیب طرح کی خوشبو تھی۔ ایسی جیسی نئی دلہنوں میں سے آتی ہے۔ اس نے وہ لحاف اپنے اوپر سے ہٹا دیا۔ جیسے اس پہ بچھو رینگنے لگے ہوں۔

بھائی کی جدائی کا دکھ اس پہ نئے سرے سے طاری ہو گیا۔ وہ شہر سے فصلوں کے لیے اسپرے لینے گیا تھا اور پھر اس کا مردہ وجود لوٹ کر آیا۔ ایک کار کے حادثے نے اسے سب سے دور کر دیا تھا۔

آج بھی وہ منظر یاد کر کے اس کا رواں رواں لوہے کی میخیں بن جاتا۔

بھرجائی کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری تھی۔ سہاگ کی چوڑیوں کے رنگ بھی ماند نہیں ہوئے تھے۔

سہرے کے پھول جو اماں نے پیٹی میں رکھ دیئے تھے۔ وہ بھی ابھی تازہ تھے، جب بھرا (بھائی) کے جنازے پہ پھولوں کی چادر ڈالی گئی۔ ان کے بعد گھر میں جیسے ہر وقت دھول اڑنے لگی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ سب کچھ اپنی جگہ پہ آ گیا۔ مگر بھائی کی کمی کوئی بھی پوری نہیں کر سکا۔ اس نے یہاں آنا بہت کم کر دیا۔

یہی فرار باپ بیٹے کے درمیان نفرت کی خلیج بن گیا۔

دلدار گیارہ پنڈوں کا سرپنچ تھا۔

بابا چاہتے تھے، دلدار کے اس سانحہ کے بعد اس گھر کی عظمت ویسے ہی برقرار رہے اور چھوٹا بیٹا یہ گدی سنبھالے اور ان کاموں میں دلچسپی لے لیکن جہاں داد کو ان روایتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابا کو اس کی دستار بندی کی فکر تھی لیکن اس کی عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے یہ عہدہ ان کے شریکوں کے پاس چلا گیا۔ اکبر ملک کو اس بات کی بہت دکھن تھی۔ ایک روز اسے پتا چلا کہ بھرجائی تاعمر ایسے ہی بیوگی کی چادر میں لپٹی رہے گی کیونکہ وہ ایک عام آدمی کی بیوہ نہیں تھی جو دوبارہ بیاہی جاتی۔ ایک ولی عہد کی بیوہ تھی۔

جس کی تعظیم سب پہ لازم تھی۔ مگر اس سے نکاح کے بارے میں کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ ایسی صورت میں سنگسار کر دیا جاتا۔ وہ بہت عرصے تک دکھی رہا۔ آخر ایسا کیوں ہے بھرجائی پہاڑ جیسی زندگی تنہا کیسے گزارے گی۔

یہی ہمدردی نجانے کب محبت میں تبدیل ہوگئی۔ وہ اس سے گہرا لگاؤ محسوس کرنے لگا تھا۔

شباب کی منزل میں قدم رکھا تو اس سے کسی قسم کی لگاوٹ کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس ہونے لگی۔ بچپن کی وہ بے تکلفی جو دونوں کے درمیان تھی۔ سب ختم ہوگئی۔

گاؤں آنے سے بھی وحشت ہونے لگی۔ زندگی کے کتنے ہی دن، کتنی ہی راتیں اپنے آپ سے الجھتے، لڑتے، جھگڑتے گزار دیں، مگر دل کی بے قراری کو قرار نہیں آیا۔ کوئی مناسب حل، کوئی جواب نہیں ملا خود کو پڑھائی میں منہمک کر لیا۔

تعلیمی مدارج طے کرتے کرتے شعور کے در وا ہوئے۔ شدتوں میں کمی واقع ہوئی۔ دل کو سمجھانے کا ڈھنگ آ گیا، مگر یہ محض وقتی بہلاوے تھے۔ جس روز اسے ادراک ہوا کہ یہ پابندی کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتی گاؤں والوں کی خود ساختہ روایت ہے۔ دل سرشاری سے جھوم اٹھا۔

والدین کے سامنے ابھی آواز اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ البتہ اس کو آزادی کا احساس دلانے کی کوشش کی جو بنا جرم ہی عمر قید کی سزا کاٹنے کو تیار تھی۔

''بھرجائی تو کام بہت کرتی ہے۔''

وہ گھاس سے سرکنڈے علیحدہ کر رہی تھی، وہیں ہاتھ رک گئے۔

''یہ بھی بھلا کوئی کام ہے۔'' مسکرا کر جواب دیا۔

''تو تھکتی نہیں روزانہ یہی کام کر کے۔'' وہ اکتا گیا۔

''بالکل بھی نہیں۔''

''کیسی ہے تو؟'' اس نے افسوس سے زہرہ کی طرف دیکھا۔ ''بالکل اس بھوری کی طرح جو ایک کھونٹے سے بندھ کر رہ گئی ہے۔''

زہرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تجھے کس نے کہا، میں بندھی ہوئی ہوں۔''

''بندھی تو ہوئی ہے ورنہ اب ہے ہی کیا تیرا اس گھر میں؟''

''تو، تو کیا چاہتا ہے۔ چلی جاؤں یہاں سے؟'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا بھر جائی!'' وہ نادم ہوگیا۔

''تو پھر کیا مطلب تھا تیرا؟''

''میرا مطلب یہ تھا بھر جائی کہ تو بہت اکیلی رہ گئی ہے۔''

''جانتی ہوں مگر ماں جی اور بابا ہیں میرے پاس'' میں نے جتلا دیا۔

''جب وہ نہیں ہوں گے؟'' اس نے اٹل لہجے میں پوچھا۔

''زہرہ چونکی۔'' اب بھی اللہ سائیں ہے۔ تب بھی اللہ وارث ہوگا''

''لیکن اسی اللہ سائیں کا حکم ہے۔ عورت اگر جوانی میں بیوہ ہو جائے تو عدت پوری کرنے کے بعد دوسری شادی کر سکتی ہے۔''

زہرہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں جانتی ہوں۔'' اس کا لہجہ سخت ہوگیا۔

''تو پھر تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔''

زہرہ کے چہرے پہ ناگواری پھیل گئی۔

''اب تو منے کہہ دیا ہے ایسا، لیکن آئندہ ایسا مت کہنا۔''

وہ گھڑونچی پہ سے مٹکے اٹھا کر نیچے رکھنے لگی۔ جن پہ دھوپ آنے لگی تھی۔

''کیوں نہ کہوں؟'' وہ سامنے ڈٹ گیا۔

زہرہ اس کی ضد سے چڑ گئی۔ ہاتھ میں پکڑا گھڑا زمین پہ پھینک دیا۔ گھڑا چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ اس کی ٹھیکریاں ادھر ادھر گر گئیں۔ پانی سارے فرش پہ پھیل گیا۔

''کیا اب تو پانی کو کسی دوسرے گھڑے میں ڈال سکتا ہے؟'' جہاں داد نے حیرت سے زہرہ کی طرف دیکھا۔

''یہی ہے تیرے سوال کا جواب۔''

''میں کسی عام مرد کی بیوہ نہیں ہوں، جو دوبارہ بیاہی جاؤں۔ نہ ہی کوئی مرد میری برابری کر سکتا ہے۔''

وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔

وہ ٹانگیں سیکٹرے بستر پہ بیٹھا تھا اور ماضی کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''کیا میں بھی نہیں؟'' اس نے سرگوشی کے انداز میں ماضی سے سوال کیا اور پھر اس رضائی کو اپنے اوپر ڈال لیا۔ جس میں زہرہ اور دلدار دونوں کی ہی مہک تھی۔

☆ ☆ ☆

''گنے کی فصل اتر رہی ہے اور مکھی کا زور بہت زیادہ ہے۔''

''اس موسم میں تو میں یہاں کبھی بھی نہ آتا بس تو نے لکھ بھیجا تھا، بھرجائی (بہن) زلیخا کے سسر کا انتقال ہوگیا ہے تو مجھے آنا پڑا۔''

''ہاں تو لگا بھرا (بھائی) ہے زلیخا کا، تو ایک ہی تو بھرا ہے تو تیرا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا تیرے پیو کا۔ ان گاؤں والوں کو تو نہیں جانتا ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے تو سو باتیں بناتے ہیں دھیاں یونہی نہیں بستیں ڈاڈا جان داغداب اے۔ چنگا ہویا کہ توں آ گیا۔''

''مگر میرا تو حرج ہو گیا ناں امتحان سر پہ کھڑے ہیں۔''

اماں جی کو دھچکا لگا۔ ''ابھی تو تو امتحان سے فارغ ہوا تھا، ول کون سے امتحان آ گئے؟''

''پندرہویں کے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''ول۔'' اماں جی نے غصے سے پوچھا۔

''ول، سولہویں دے۔'' وہ پھر ہنسا

''ول۔''

''ول۔''

''ختم شد۔''

زہرہ بھینسوں کا چارہ بناتے ہوئے ماں بیٹے کی گفتگو پر ہنس رہی تھی۔

''شکر الحمدللہ۔'' اماں جی نے ہاتھ بلند کیے۔

''جلدی سے فارغ ہو جا، بڑا ارمان ہے مجھے تیرے سر پہ سہرا سجانے کا۔ میرا دلدار تو مجھے دھوکا دے کر چلا گیا۔ اب تو عرصہ ہوا اس گھر میں کوئی خوشی نہیں آئی۔ دلدار ہوتا تو اس آنگن میں پھول ہی پھول مہک رہے ہوتے۔ اب تو جیسے ہر چیز اجاڑ ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک ہی نشانی ہے اس کی جسے سینے سے لگائے بیٹھی ہوں۔''

ماں جی آبدیدہ ہو کر زہرہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

زہرہ ہاتھ دھو کر ماں جی کے پاس آ گئی۔

ماں جی متواتر رو رہی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں میں نہ کوئی تاثر تھا نہ ہی کوئی اشک۔ وہ چپ چاپ ماں جی کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔ جیسے پتھرا گئی ہو۔ وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا۔

اس بار جب وہ آیا تو اس میں ایک نئی تبدیلی تھی، جسے زہرہ صاحب محسوس کر سکتی تھی۔ یعنی باپ بیٹے کے تعلقات خوشگوار جا رہے تھے حالانکہ باپ بیٹے کے تعلقات بہت عرصے سے وہ سرد ہی دیکھتی آ رہی تھی۔ اکبر ہمیشہ بیٹے سے نالاں ہی رہتا۔

جہاں داد کو خود باپ کی ناراضگی سے کچھ سروکار نہ تھا۔

ماں کی گود میں سر رکھ کر آج بھی سو جاتا۔ مگر باپ کے ساتھ اس کی چارپائی پہ بھی نہ بیٹھتا۔

اکبر علی بیٹے کی اس حرکت پر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔

سوکھے اپلے لے کر زہرہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس نے بڑے اچنبھے سے جہاں داد کو دیکھا جو باپ کے پاؤں دبا رہا تھا۔

اکبر علی لیٹا ہوا حقہ گڑگڑا رہا تھا ساتھ ساتھ کوئی قصہ بھی سناتا جا رہا تھا۔

جسے جہاں داد بہت خوش ہو کر سن رہا تھا، حالانکہ وہ کبھی باپ کی کسی بات پہ خوش نہیں ہوتا تھا زہرہ کے چہرے پہ معنی خیز تبسم بکھر گیا۔ وہ دو پٹہ دانتوں میں دبائے سہج سہج نیچے اتر آئی۔

''زہرہ پتر! ذرا چلم تو گرم کر دے۔'' اکبر نے بہو کو آواز دی۔

زہرہ ابھی صحن میں آئی تھی کہ جہاں داد چلم گرم کرنے کے لیے خود اٹھ گیا۔

''دھیان سے پتر! ہاتھ نہ جلا لینا۔'' اناڑی پن سے چلم نکالتے دیکھ کر ماں نے دور سے کہا۔

وہ چلم لے کر رسوئی میں چلا گیا۔ مگر چولہا ٹھنڈا پڑا ہوا تھا جسے زہرہ نئے سرے سے ایندھن ڈال کر جلا رہی تھی۔

''کتنی دیر میں آگ جلے گی؟''

زہرہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ میں چلم دیکھی۔ پھر ہنس کر سر جھکا لیا۔

بابا سے کہو ابھی دیر لگے گی، انتظار کرے۔''

تو ہنس کیوں رہی ہے؟'' اس نے گھور کر زہرہ کو دیکھا۔

''تجھے اعتراض ہے کیا؟''

''ہاں۔'' وہ چلم پٹخ کر وہیں بیٹھ گیا۔

زہرہ پھر ہنس پڑی۔ پھر پھونکنی سے چولہے میں پھونک مارتے ہوئے بولی۔

''باہر جا کر بیٹھ۔ لکڑی گیلی ہے دھواں اٹھے گا تو رونے لگ جائے گا۔ پھر دلدار کی طرح بابا بھی یہی سمجھے گا کہ میں نے تجھے مارا ہوگا۔''

جہاں داد حیرت سے زہرہ کی صورت دیکھنے لگا جو اسے بچپن کی بات سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ دانستہ ایسا کر رہی تھی۔ یا شعوری طور پہ اس کے منہ سے پھسلا تھا۔ وہ الجھ گیا۔ تھوڑی سی ندامت ہوئی (مگر اب اس میں ندامت کا کیا سوال بھرا مر چکا ہے۔ بھرا زندہ ہوتا تو میں ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب بھرا نہیں ہے۔ تو کیا کوئی بھی کچھ نہیں سوچے گا؟)

زہرہ نے آگ سلگا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں دھوئیں سے لمحے میں سرخ ہو گئی تھیں اور پانی آنے لگا تھا۔

زہرہ کو وہ چھوٹا سا گول مٹول سا بچہ یاد آ گیا جو اس کے پہلو سے لگ کر یونہی بیٹھا رہتا تھا اس کے کاموں میں دخل اندازی کرتا رہتا۔ کبھی جھاڑو کے تنکے چولہے میں جلا کر گول گول گھماتا اور کبھی جلتی لکڑی نکال لیتا اور وہ اسے اپنی گود میں لٹا لیتی۔ اب بھی اس کا چہرہ آگ کی حدت سے

سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں پانیوں سے بھر رہی تھیں۔ زہرہ نے اس کے ہاتھ سے چلم لے لی پھر اپنے دوپٹے سے اس کی آنکھیں پونچھ دیں۔ اس کے اس اچانک عمل پہ جہاں داد کو جیسے کرنٹ لگا۔

"جا، جا کر باہر بیٹھ۔ میں آگ لے کر آ رہی ہوں۔" اس نے ہمیشہ کی طرح بڑے پن سے کہا اور آگ سلگانے لگی۔

جہاں داد اٹھ کر باہر آ گیا۔ لیکن اس کا تن اس لمس سے لمحوں میں دہک اٹھا تھا کسی آتش جوالہ کی طرح کیسی آگ تھی جو اس کے تن بدن میں آج تک سلگ رہی تھی۔

لیکن زہرہ اس آنچ سے بے خبر تھی اور جب وہ خبردار ہوئی تب۔

اچانک ننھا آگ کا شعلہ اس کی انگلیوں پہ لگا تو وہ چونک پڑا۔ سوچوں کے گرداب میں اتنا منہمک تھا کہ سگریٹ کے ختم ہونے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ قریب تھا کہ ہونٹ جل جاتے۔ اس نے وہ سگریٹ پھینک دیا اور نیا سگریٹ جلانے لگا۔

اسی لمحے قریب سے زہرہ کی آواز آئی۔

تیری بھی عجیب عادت ہے۔ سگریٹ پہ سگریٹ پیتا چلا جاتا ہے۔ ابھی ایک کا تو دھواں پھیپھڑوں سے نکلنے دے۔ اتنا آرام تو بھٹے والا بھی اپنی چمنی کو دے دیتا ہے۔"

وہ ماچس کی تیلی بجھاتے ہوئے ہنس پڑا۔ پھر ایک گہرا کش لگایا اور بہت سا دھواں فضا میں چھوڑ دیا۔ فضا میں زہرہ کی صورت بننے لگی۔ جو ناراضگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بچپن سے تجھے آگ سے کھیلنے کا شوق تھا۔ اب یہ آگ ہونٹوں سے لگا لی۔ کیوں پیتا ہے تو اتنی سگریٹ؟"

وہ تلخی سے ہنس پڑا اور دھوئیں کے بادل فضا میں بنانے لگا۔

"جس بات کا جواب نہ دینا ہو ناں تجھے تو یونہی دانت دکھانے لگتا ہے۔" زہرہ کے لفظ سماعتوں میں گونج رہے تھے۔

"بھلا کیا جواب دوں۔ بس اچھا لگتا ہے مجھے آگ سے کھیلنا۔" وہ خود سے ہمکلام ہوا۔

(تو بھی تو آگ ہی ہے، ٹھنڈی راکھ میں چھپی ہوئی)

"میرے پاس جب بیٹھا کر تو اس منحوس کو مت جلایا کر۔ زہر لگتی ہے مجھے اس کی بو۔ چھوٹا تھا تو تجھے جس چیز سے روکتی تھی رک جاتا تھا۔ اب تو دھمکا بھی نہیں سکتی۔" زہرہ نے ناک پہ دوپٹا رکھا۔

"اب بھی روک کر دیکھ لے، شاید رک جاؤں۔"

"ہونہہ ایسا ہی بھلا ہے تو۔ کب سے اماں جی شادی پہ اصرار کر رہی ہیں۔ دس لڑکیاں تیرے لیے دیکھ آئی ہوں۔ میرے کہنے پہ ایک پہ بھی راضی نہیں ہوا۔ یہ چھوڑے گا...... ایسا بھی مان نہیں ہے مجھے تجھ پہ۔"

جہاں داد جلتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیوں نہیں ہے تجھے مجھ پہ مان؟"

ساگ کاٹتے ہوئے زہرہ کے ہاتھ رُک گئے، وہ شکوے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ مسکرا دی۔ پھر پیار سے بولی۔

''ناراض ہو گیا؟''

''کبھی تو نے لائق سمجھا ہے مجھے اس بات کے۔'' وہ اینٹھا۔

''کیا مطلب؟'' زہرہ ہنس پڑی مگر سمجھی نہیں۔

''ہمیشہ تو ڈانٹتی رہتی ہے۔''

''کیا کروں۔ بچپن سے عادت جو ہے تجھے ڈانٹنے کی اب چھوٹتی نہیں۔''

''مگر اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔''

''لیکن میرے لیے تو اتنا سا ہی ہے۔'' اس کے انداز میں بڑا اپنا پن تھا۔

''خود کو بڑی اماں سمجھتی ہے۔'' وہ جل کر بڑبڑایا۔

''اتنا بڑا ہو گیا ہوں میں۔ ذرا کھڑی ہو کر دیکھ میرے پاس۔ اتنی سی لگے گی۔ بڑی بنتی ہے۔''

''بڑا ہو گیا ہے۔ تب ہی تو کہہ رہی ہوں شادی کر لے۔ اماں کا بھی آدھا دکھ کم ہو گا۔ میں بھی دیورانی پہ تھوڑا راج کر لوں گی۔''

''راج کرانے والا سلامت ہے۔ مگر تیرا راج کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔''

''کام کرتے کرتے زہرہ کے ہاتھ رک گئے۔ وہ مٹھیوں میں ساگ پکڑے بیٹھا تھا۔ ایسے جیسے اپنی ہی بات پہ اس کا سر جھک گیا ہو۔ زہرہ نے اس کے معصوم چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اور کچھ بھی اندازہ نہ لگا سکی۔

''سوہنا رب تجھے لمبی حیاتی دے۔ میرے بھی ویروں کو سلامت رکھے۔ تمہارے صدقے سے تمہارے دشمن بھی جئیں۔ عورت کا راج تو بس یہی ہوتا ہے۔ مرد خواہ کسی روپ میں ہو اس کی خدمت کرتی رہے۔ رب سوہنا میرے بادشاہوں کو مجھ سے خوش رکھے۔''

''عورت کا بس ایک ہی بادشاہ ہوتا ہے'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔'' وہ نہ رہے تو باقیوں کی خدمت چاہے وہ کتنی بھی کرے۔ بے مول لونڈی ہی کہلاتی ہے۔''

وہ ساگ کی ''جوٹی'' (سنورا ہوا ساگ) پھینک کر وہاں سے اٹھ گیا۔ زہرہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی بات نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

اس کی بات سے گہرا دکھ ہوا۔ نجانے وہ کیا جتانا چاہتا تھا سمجھ نہیں پائی اور دو روز تک اس سے نہیں بولی۔

تیسرے روز شام کو وہ سب کے بستر لگا کر فارغ ہوئی تو اس کے پلنگ کی ادوائن ڈھیلی محسوس ہوئی۔ بستر اٹھا کر اس کا پلنگ کسنے لگی۔ جانتی تھی کہ اسے سخت ترین پلنگ پہ سونے کی عادت ہے۔ ذرا سا بان ڈھیلا ہو جائے تو شور مچانے لگتا ہے۔ کتنا واقف تھی وہ اس کی ایک ایک بات سے۔ اور کتنا خیال رکھتی تھی اس کا۔ لیکن وہ تھا کہ ایک لمحے میں اس کا جگر چھلنی کر جاتا۔ کیوں کرتا ہے وہ ایسی باتیں۔

وہ افسردگی سے سوچوں میں غرق پلنگ کی رسیاں کھینچ رہی تھی اس لمحے جہاں داد کمرے میں داخل ہوا۔ ایک پاؤں پلنگ کی پٹی پہ رکھے دوسرا زمین پر جمائے وہ مستعدی سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ آہٹ پہ نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ چہرے کے نقوش تن گئے، اس کے چہرے کو دیکھا۔ پھر اسکے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ناراض ہو مجھ سے؟''

''وہ کچھ نہیں بولی۔ غصے سے رسیاں کھینچتی رہی۔

جہاں داد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ پلنگ ایک جاٹ کا ہے۔ جو اس پہ سوتا ہی نہیں دنگل بھی مچاتا ہے۔ یہ نازک ہاتھ بھلا اسے کب تک کسیں گے۔''

''زہرہ نے تحیر سے اس کی طرف دیکھا۔ جہاں ننھا معصوم بچہ نہیں تھا۔

اونچا لمبا چوڑا۔ مکمل مرد۔ مدمقابل کھڑا تھا۔

اس کے دیکھنے کا انداز، کلائی پکڑنے کی جرات، لفظوں کا ہیر پھیر۔

زہرہ لمحوں میں اس ننھے معصوم بچے کی جوان ہوتی امنگوں سے واقف ہو گئی۔

تنک کر کلائی چھڑائی۔ اس کی سابقہ باتوں کا مفہوم اب سمجھ میں آیا تھا۔

''اس جاٹ کو ان ہی نازک ہاتھوں نے اپنی گود میں پالا پوسا ہے۔ جوان کیا ہے۔''

نجانے اس نے کیا جتانے کی کوشش کی تھی۔ جہاں داد سکون سے اس کے مشتعل ہوتے چہرے اور نگاہوں کی طرف دیکھتا رہا۔ زہرہ بھڑک گئی۔ اس کے انداز میں کسی بھی قسم کی ندامت و شرمندگی نہیں تھی۔

''انگریزی تعلیم نے تجھے یہ ادب سکھلایا ہے؟'' اس کی رگوں میں خون لاوے کی طرح دوڑنے لگا۔

''ماں جیسی ہوں میں تیری، سنا تو نے؟''

وہ سینے پہ ہاتھ باندھے بغور دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اتنا سا تھا تو اتنا سا'' اس نے زمین کی طرف ہتھیلی کی۔ ''جب میں اس گھر میں آئی تھی۔ آج تو میری طرف اس نگاہ سے دیکھے گا۔ جبکہ میں نے تجھے ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح......''

جہاں داد نے تلملا کر اس کی بات کاٹ دی۔

''اتنا سا نہیں تھا۔ میں آٹھ سال کا تھا اور تو...... تو سولہ سال کی بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی۔ صرف آٹھ سال کا ہی فرق ہے تیری اور میری عمر میں۔''

زہرہ متوحش سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر بہت دیر کے بعد بولی۔

''کیوں سوچی تونے ایسی بات؟''

''اس لیے کہ یہ تیرا حق ہے۔''

''ہمدردی کی چادر ڈالنا چاہتا ہے مجھ پہ؟'' جہاں داد نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا۔

''محبت ہے مجھے تجھ سے۔''

اسے امید تھی کہ زہرہ پوری قوت سے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارے گی۔

لیکن زہرہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اچانک ہنس پڑی۔

''پاگل!'' وہ سر جھٹک کر مسکرائی اور کمرے سے نکل گئی۔ جہاں داد اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا اور بے چین سا ہو کے اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔

وہ رسوئی میں چلی گئی۔ وہ دروازے میں اڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''میری بات سنو زہرہ!''

زہرہ مٹکے سے پانی نکال رہی تھی۔ ایڑیوں کے بل گھوم گئی۔ غصے، نفرت و ناراضگی سے اس کی طرف دیکھا لیکن بے حد رسان سے تادیبی لہجے میں بولی۔ ''بھرجائی ہوں میں تیری۔''

''بھرا مر چکا ہے۔ انیس سال سے تو بیوگی کی زندگی گھر میں گزار رہی ہے۔ کیا مل رہا ہے تجھے ایسی زندگی گزار کر۔ زندگی پہ تیرا ابھی کچھ حق ہے۔ اسے استعمال کر۔ غلط مت سمجھ مجھے۔'' وہ بھڑک گیا۔

زہرہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسکے قریب آ کر رک گئی۔

اگر دلدار زندہ ہوتا تو میں تیرا منہ نوچ لیتی۔'' زہرہ کے انداز میں نفرت ہی نفرت تھی۔

''بھرا اگر زندہ ہوتا تو میں تجھے ماں کی طرح سمجھتا۔ تیرے بارے میں ایسا کیوں سوچتا۔ مگر اب جو حالات ہیں وہ کچھ اور ہیں۔ یہی سچ ہے، یہی حقیقت ہے، جسے تو سمجھنا نہیں چاہتی۔ برباد کر رہی ہے تو اپنی زندگی۔ ساری عمر اسطرح کیسے گزرے گی۔ ذرا سوچ۔''

وہ جذباتی ہونے لگا۔ مگر زہرہ پرسکون تھی۔

''جب میں نے جوانی میں یہ قدم نہیں اٹھایا تو اب تو سمجھتا ہے اس ڈھلتی ہوئی عمر میں یہ قدم اٹھاؤں گی۔ شرم کر۔'' وہ غرائی۔

''کتنی عمر ہے تیری۔ زیادہ سے زیادہ سینتیس سال۔ خدا نے صورت اتنی اچھی دی ہے کہ اپنی عمر سے کئی گنا کم اور معصوم لگتی ہے۔ گاؤں کی عورتوں کی طرح بے ڈول جسم نہیں ہے تیرا۔ اس خوبصورت عمر کو تو ڈھلتی جوانی کہتے ہیں؟''

اس کے تعریف کرنے کے انداز پہ زہرہ کے اندر آگ ہی آگ بھر گئی۔ لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیا۔

''غلطی تیری نہیں میری ہے۔ تجھ سے پردہ کرنا میرا شرعی حق تھا۔ لیکن میں نے تجھ سے پردہ نہیں کیا۔ میری بے حجابی کی یہی سزا ہونا چاہیے

تھی۔''

شدید تاسف سے اس کی آواز رندھ گئی۔

جہاں داد تڑپ گیا۔

''کس طرح سمجھاؤں۔ کس طرح سمجھاؤں تجھے۔ مجھے غلط مت سمجھ۔''

''چلا جا تو یہاں سے۔ شرم آنے لگی ہے مجھے اپنے آپ سے۔'' زہرہ موڑھے پہ بیٹھ گئی اور چہرہ گود میں چھپا کر رونے لگی۔ جہاں داد کئی لمحے احساس جرم میں مبتلا اسے سسکتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

کئی روز کے بعد آیا تو زہرہ کے انداز پہ اسے عجیب الجھن ہونے لگی۔

جب یہاں سے گیا تو زہرہ کے رویے میں ناگواری اور نفرت تھی۔ امید تھی کہ اس کا رویہ سابقہ ہوگا۔ لیکن وہ بالکل عام سے انداز میں اس سے ملی۔ جیسے وہ کچھ بات کر کے ہی نہ گیا ہو۔ اس کی ہر بات کا خیال رکھنا۔ وجہ بے وجہ اسے ٹوکنا غرض اس کے انداز میں بھی معمول کا بڑا پن تھا۔

جو جہاں داد کے لیے چڑ کا باعث بنتا جا رہا تھا۔

''اماں بابا شادی کے لیے بہت اصرار کر رہے ہیں۔'' وہ اکھڑے اکھڑے سے انداز میں اس سے مخاطب تھا زہرہ زمین پہ بیٹھی ازار بند بنا رہی تھی۔

''تو پھر ہاں کیوں نہیں کر دیتے؟'' وہ ''کانے'' سے تانے بناتے ہوئے بولی۔

وہ اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''پچھلی بار میں نے تم سے کوئی بات کی تھی۔'' وہ بہت قریب سے اس کے احساسات دیکھنا چاہتا تھا۔

''جو مجھے بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔'' وہ اپنے کام میں مگن تھی انداز میں ناگواری، بختی اور تحکم کچھ بھی نہیں تھا۔

جہاں داد کا حوصلہ بڑھا۔

''زہرہ!'' اس نے آہستہ سے پکارا۔

''ہوں!'' اس نے متعجب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ نام لیے جانے پہ بھی نہیں بھڑی تھی۔

''زہرہ!'' شک کو یقین میں بدلنا چاہا۔

''سن رہی ہوں۔'' انداز بے حد مصروف تھا۔

''تمہیں اعتراض نہیں میں تمہارا نام لے رہا ہوں؟''

''میں نے کہا ہے نا، میری یہی سزا ہونا چاہیے تھی۔ رکھوالا مر جائے تو قیمتی سے قیمتی مال بھی مالِ غنیمت بن جاتا ہے۔ شاید تو بھی مالِ مجھے غنیمت ہی سمجھتا ہے۔''

جہاں داد کا چہرہ تذلیل کے احساس سے سرخ ہو گیا۔

''کیوں سمجھتی ہے اتنا غلط مجھے۔ کیوں کبھی تیری عزت میں کمی کی میں نے۔ غیریت کا احساس دلایا تجھے کبھی میں نے...... کبھی بدلحاظی نہیں کی۔ ہمیشہ سر جھکا بات کی تجھ سے۔ لیکن تب بھی میرے دل میں تیری محبت تھی اور اب بھی اس دل میں صرف تو ہے۔ جب یہ زبان تیرے سامنے اظہار کر چکی ہے۔'' وہ جذباتی ہونے لگا۔

زہرہ نے بات کاٹ دی۔

''پہلے تو میری عزت کرتا تھا، اب تجھے مجھ سے محبت ہو گئی، کتنی عجیب بات ہے۔ جب تو میری عزت کرتا تھا، تب کیا تجھے مجھ سے محبت نہیں تھی۔ جب محبت ہوئی تو تو نے عزت و لحاظ بالائے طاق رکھ دیا۔ محبت آدمی کی توقیر میں اضافہ کرتی ہے۔ گھٹاتی نہیں ہے۔''

''تیری توقیر میں اضافہ ہی تو کرنا چاہتا ہوں۔''

زہرہ استہزائیہ مسکرا دی۔ پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔

''بات محبت یا توقیر کی نہیں ہے۔ اس عمر کے ساتھ کی ہے جو ہم نے ایک ساتھ گزاری۔ میں اس آنگن میں لگی ایسی ہری بھری بیل تھی جسے تو بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا۔ پہلے تو اس کی چھاؤں میں کھیلتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ تو اس چھتنار کا اس قدر عادی ہوا کہ اس سے غلط توقعات وابستہ کر بیٹھا۔ اس میں تیرا قصور نہیں، تیری عمر کا قصور ہے۔ اب بھی یہ چھتنار تجھ پہ یونہی سایہ فگن ہے مگر تیرے تقاضے بدل رہے ہیں۔ اس بیل سے پرے بہت بڑی دنیا ہے۔ بڑی ہریالی ہے۔ جو تو نے نہیں دیکھی۔ جس وقت وہ سب دیکھ لے گا پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اسے محبت نہیں کہتے وقتی جذبات کہتے ہیں۔ کیونکہ عمر کا ایک کڑا وقت میں نے طویل دھوپ میں جلا دیا ہے۔ میں جانتی ہوں، یہ محض وقتی اور جذباتی باتیں ہیں۔ بہت دن کے بعد تجھے خود بھی ان باتوں پہ ہنسی آئے گی۔ ہو سکتا ہے شرم بھی آ جائے۔ اس لیے تو خود کو یہاں مایوس نہ کر اور کوئی اور راستہ اپنا لے۔''

''میں تجھے جھٹلا کر دکھاؤں گا کیونکہ میرے تمام راستے صرف تیری طرف آتے ہیں۔ میری منزل صرف ایک تو ہے۔ جس جذبے کو تو وقتی جذبات کہہ رہی ہے۔ وہ تیری بھول ہے۔ خود سے آنکھ مچولی کا کھیل تو بہت دیر تک نہیں کھیل سکتی آخر عورت ہے تو بھی۔ اور تیرے بھی بہت سارے ارمان ہیں۔ تو خود کو تھپک تھپک کر سلا سکتی ہے۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

زہرہ سر جھکا کر مسکرانے لگی۔

''تو میری باتوں کا مذاق اڑا رہی ہے۔''

''شکر کر۔ تیرے سر پہ جوتیاں مار کر دھول نہیں اڑا رہی۔'' وہ اس کا مذاق اڑانے والے انداز میں بولی۔

جہاں داد سخت کبیدہ خاطر ہو کر وہاں سے اٹھ گیا۔

''میں اماں سے بات کروں گا۔'' زہرہ یکلخت سناٹے میں آ گئی۔

''اگر تو نے ایسا کیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔''

''کیوں کیا نا جائز کر رہا ہوں میں؟''

''ہاں۔ یہ نا جائز ہے۔'' زہرہ چلا پڑی۔ ''میں ایک عام مرد کی بیوہ نہیں ہوں۔ جس کی ڈولی دوبارہ سجائی جائے۔ ایسے مرد کی بیوہ ہوں جو سب کے لیے باعث احترام تھا۔ کوئی میری برابری نہیں کر سکتا۔''

''سب جھوٹ ہے، بکواس ہے، ڈھونگ ہے۔ یہ حکم صرف پیغمبروں کی بیویوں کے لیے نازل ہوا تھا کہ ان کی...... بیویاں تمام نبی آدم کے لیے باعث احترام ہیں۔ کوئی بھی ان سے شادی کا تصور نہ کرے۔ دلدار نعوذ باللہ ولی یا پیر نہیں تھا۔ ایک عام آدمی تھا۔ اس کی بیوہ کسی کی بھی بیوی بن سکتی ہے اور پھر میں تو اس کا سگا بھائی ہوں۔ جائز حق دے رہا ہوں تجھے۔''

''بے غیرت، بے شرم، بے حجاب، تیری یہ جرات تو گھر میں ہی ڈاکہ زنی کر رہا ہے۔''

اکبر ملک نجانے کب سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ بپھر کر سامنے آیا تو دونوں ہی بھونچکا رہ گئے۔

''یہ سبق سیکھ کر آیا ہے تو شہر سے؟''

''اکبر ملک نے مشتعل ہو کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ جہاں داد کو سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔

''بول بے غیرت۔'' اکبر ملک نے بری طرح اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اماں کے لیے خود یہ واردات بالکل نئی تھی۔

''بابا! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''بھاوج کو برائی پہ راغب کر رہا تھا، اب مجھے سمجھائے گا۔'' اکبر ملک نے پوری قوت سے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

جہاں داد دو قدم اچھل کر پیچھے چلا گیا۔

اکبر ملک پہ وحشت سوار تھی۔ اماں تڑپ کر دونوں کے درمیان میں آ گئی۔

''جوان پتر ہے ہوش کر۔''

''سب تیری ڈھیل کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔''

''میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔''

''جس شخص نے گھر کی عزت ہی داغدار کرنا چاہی اس سے کیا توقع رکھ سکتی ہے تو۔'' اکبر ملک بیوی پہ غرایا۔

''بابا!'' جہاں داد کی غیرت میں بھونچال آ گیا۔ ''کیا بے غیرتی دکھائی میں نے؟ کون سا قانون توڑا ہے۔ کیا کیا ہے شریعت کے خلاف، جو آپ مجھے اس طرح ذلیل کر رہے ہیں؟''

''یعنی ابھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ بھائی کی بیوہ پہ ہاتھ ڈال رہا ہے۔''

''بابا! لفظوں سے رشتوں کا احترام نہ ختم کریں۔''

''احترام سکھلائے گا مجھے، خود جو کر رہا ہے، وہ غیرت کو چار چاند لگا دینے والی بات ہے۔''

''ہاں ہے۔'' جہاں داد چلا اٹھا۔ ''بنے پھرتے ہیں غیرت مند۔ سب ڈھکوسلے اور لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ اپنے اپنے مفاد کے چکر۔ کیا حق بنتا ہے آپ کا۔ ایک جوان لڑکی کو تاعمر بیوگی کی چادر میں بنا آس، بنا امید کے چوکھٹ پہ بٹھائے رکھنے کا؟''

''ایک لڑکی نہیں ہے، بھتیجی ہے۔ بہو بنا کر لایا تھا اسے۔''

''مگر اب وہ بیوہ ہے۔ اور بیواؤں کے لیے......''

''حکم نہیں ہے اس کے لیے۔''

اکبر ملک نے چلا کر بیٹے کی بات کاٹی۔

''کہاں سے آئے ہیں اس کے لیے حکم آسمان سے یا زمین اگلتی ہے۔''

''بکواس نہیں کر میرے سامنے۔''

''بکواس نہیں ہے۔ شریعت پڑھا رہا ہوں۔''

''یہ بے غیرتی کے سبق کسی اور کو پڑھا جا کے۔'' اکبر ملک آگے بڑھا، اماں درمیان میں آ گئی۔

''تو رک مجھے بات کرنے دے۔''

''کہہ دے اس سے دفع ہو جائے میری نظروں کے سامنے سے۔ کوئی بات نہیں کرنی مجھے اس سے۔''

''مگر مجھے کرنی ہے، میں تب تک یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔''

''کتے چھڑوا دوں گا تجھ پہ۔ مگر میرے جیتے جی یہ نہیں ہوگا۔''

''جہاں داد پتر! خدا کے واسطے زبان بند کر لے، ورنہ کچھ ہو جائے گا۔'' زرینہ اپنی طاقت سے زیادہ زور لگا کر اکبر ملک کو روک رہی تھی۔

جہاں داد عالم طیش میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ زرینہ، اکبر ملک کو چارپائی پہ بٹھانے میں کامیاب ہو گئی۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ایسے جیسے بڑا طوفان آ کر گزر گیا ہو۔

زہرہ صدمے کی کیفیت میں دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ تیز تیز بولنے کی وجہ سے اکبر ملک کو کھانسی ہونے لگی، اماں بھی بری طرح ہانپ رہی تھی۔

زہرہ مرے مرے قدموں سے پانی لینے کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔

گھر میں مرگ کا سا عالم تھا، سب اپنی اپنی ذات میں خود کو مجرم سمجھ رہے تھے، زہرہ نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

دو دن عجیب یاسیت میں گزرے۔

تیسرے روز صبح ہی صبح چند آدمی اکبر ملک کے دروازے پہ آئے۔

لوگوں کا غیر معمولی ہجوم دیکھ کر اکبر ملک حیران رہ گیا۔

''کون لوگ ہیں آپ؟''

''جہاں داد لوگوں کے پیچھے سے نکل کر باپ کے سامنے آ گیا۔''یہ شہر کے چار مفتی ہیں۔ یہ ضلع کا ڈی سی ہے۔ یہ وکیل ہے۔''

اس نے باری باری سب کا تعارف کرایا۔

''باقی لوگ آپ کے علاقے کے ہیں۔ نام نہاد سرپنچ۔''

''نکاح پڑھوانے آئے ہیں کیا مجھ سے؟'' اکبر ملک کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بس نہیں چلتا تھا بیٹے کو کھڑے کھڑے قتل کر دے۔

''فی الحال تو آپ کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے آئے ہیں۔ آپ جس طرح چاہیں ان سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ قانونی اور شرعی ہر سوال کا جواب ان لوگوں کے پاس موجود ہے۔''

اکبر ملک کے علاقے کے لوگوں کے چہرے پہ عجیب گمبھیرتا تھی۔ نام نہاد سرپنچ مارے باندھے کھڑے تھے۔

''میں نے کوئی فتویٰ نہیں لینا ان لوگوں سے۔'' اکبر ملک بیٹے پہ غرایا۔

''لیکن ملک صاحب! یہ ایک شرعی نقطہ ہے جس میں آپ ترمیم یا اضافہ نہیں کر سکتے۔'' چار مفتیوں میں سے ایک کرارا سا مولوی بولا۔

''اگر آپ جاہل ہیں اور لاعلم ہیں تو ہم پہ فرض ہے کہ آپ کو راہ راست دکھائیں کیونکہ دین انسانوں کا بنایا ہوا قانون نہیں ہے۔ اس ذات کا فرمان ہے......جس کی تعمیل و تعظیم ہم سب پہ لازم ہے، جسے اپنی طرف سے بڑھانا اور گھٹانا ہمیں زیب نہیں دیتا۔'' ایک اور مفتی نے رسان سے سمجھایا۔

''میرا خیال ہے ملک صاحب! یہ بات چیت اطمینان سے بیٹھ کر کی جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔''

ڈی سی صاحب نے پہلی بار مداخلت کی۔

اکبر ملک دروازے کے آگے سے ہٹ گیا۔ جہاں داد نے سب لوگوں کو بیٹھک میں بٹھایا۔

سلسلہ کلام پھر سے شروع ہوا۔ لیکن اکبر ملک کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''یہ میرے گھر کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اسے یوں بلاوجہ اچھالنا پسند نہیں کروں گا۔''

''لیکن ملک صاحب! آپ کے بیٹے کا کہنا ہے، آپ کی طرح بہت سارے لوگ اس روایت پر عمل پیرا ہیں۔ آپ کو تفصیل سے اس معاملے سے آگاہ کیا جائے تاکہ ان فرسودہ روایات کا خاتمہ ہو اور جن لوگوں کا آپ پہ اس بارے میں دباؤ ہے ان سے بھی پوچھ پڑتال کی جائے۔''

اکبر ملک چند ثانیے خاموش بیٹھا رہا پھر بولا۔

''اگر تو آپ لوگ مجھے اس بات کے لیے قائل کرنے آئے ہیں کہ میں اس کی خواہش کے آگے سر جھکا دوں۔ تو اس معاملے میں قانون یا شریعت مجھ پہ کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتی۔ کیونکہ یہ معاملہ کنواری لڑکی کا نہیں ہے۔ ایک شادی شدہ عورت کا ہے۔ جو دوسری بار اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر سکتی ہے۔ اس پہ کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا جبکہ یہ صرف اس کی اپنی خواہش ہے۔''

''یہ تو بعد کی بات ہے ملک صاحب کہ لڑکی کیا چاہتی ہے۔ فی الحال تو آپ اپنا قبلہ درست کیجئے اور جس شخص کو یہاں کی نمائندگی حاصل ہے وہ اپنے نقطہ اعتراض کی حمایت کرے۔''

سب لوگوں کو سانپ سونگھ گیا، اکبر ملک جز بز سا ہوتا رہا۔

بہت دیر تک یکطرفہ گفتگو ہوتی رہی۔ یعنی مفتی صاحبان وعظ کرتے رہے۔ گاؤں کے لوگ عقل پہ کنڈلی مارے بیٹھے رہے اور یونہی محفل برخاست ہوگئی۔

اگلے ہی روز ڈی سی صاحب کی حمایت سے پورے گاؤں میں پمفلٹ تقسیم ہوئے۔ کسی بھی قسم کے بے سروپا قانون کی زد میں آیا کوئی بھی شخص بلاتخصیص قانون کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ قانون اس کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار تھا۔

گاؤں میں عجیب کھلبلی سی مچ گئی۔

سارے لوگوں کو اکبر ملک کے گھر کی کہانی کا علم ہوگیا۔ بیٹے نے باپ کو قانونی رسیوں میں جکڑ کر ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تھوڑی سی روشنی آنے سے بہت سارے طاقت ور حضرات کی طاقت کم ہوگئی۔

زہرہ کے باپ بھائیوں تک یہ خبر پہنچی تو ان کا غیرت مند خون جوش میں آگیا۔ یہ بات انہیں کسی گالی سے کم نہیں لگی۔ بیٹی کا سہاگ اجڑنے کے اٹھارہ انیس سال کے بعد دوبارہ گھر بسانے کا شور سب کے لیے لرزا دینے والا تھا۔ زہرہ کی جان ایک مصیبت میں آگئی۔ بہت دن تک وہ اپنی قسمت پہ روتی رہی۔

گاؤں کی عورتوں کی عجیب عجیب باتیں اور شارے اس کا جگر چھلنی کیے دیتے اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔

لیکن بدقسمتی نے گھر کی چوکھٹ نہیں چھوڑی۔

''کیوں تجھ پہ اتنی ضد چڑھی ہے کہ ہمیں ذلیل کرنے پہ تل گیا ہے۔ اپنا نہیں تو بیوہ بھاوج کا ہی کچھ خیال کر۔ کہیں کا نہیں چھوڑا ہے تیری ضد نے ہمیں۔''

زرینہ بیٹے کے سامنے گڑگڑا کر بولی۔

''اصل میں میں بتاتا ہوں۔ اس ضد کا سبب کیا ہے۔ زہرہ کو حاصل کر کے وہ اس کی دولت کا مالک بننا چاہتا ہے۔'' اکبر نے جلے دل کا پھپھولا پھوڑا۔

''بابا!'' وہ بھڑک اٹھا۔ ''آپ نے یہ بات سوچی بھی تو کیسے؟''۔

''تیرا جنون دیکھ کر۔ میرا خون اتنا گندہ نہیں تھا کہ میری بات نہ مانتا۔ لیکن دولت کی ہوس اچھے سے اچھے خون کو یونہی گندہ کر دیتی ہے۔ زہرہ اپنے ساتھ زمینوں کا بڑا حصہ لے کر آئی تھی، پھر دلدار کے حصے کی بھی یہی مالک ہے۔ اس کے سامنے تجھے اپنا حصہ بہت تھوڑا لگ رہا ہے۔ ساری جائیداد کا مالک بننا چاہتا ہے تو اس لیے اسے اپنانے پر مصر ہے۔''

باپ کی بات سن کر جہاں داد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''مجھے آپ کی دولت جائیداد کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ جو تھوڑا بہت میرا حصہ ہے، اسے بھی سنبھال کر رکھ لیجئے۔ مجھے ان چیزوں کی کوئی طلب نہیں۔ اپنے زور بازو سے سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں اور کر کے دکھاؤں گا۔''

اس کی جذباتی گفتگو پہ اکبر ملک طنزیہ مسکرایا۔

''آج تک پتر، پولی، پولی ہی کھائی ہے۔ جس روز کچھ کرنے نکلا عشق کے سارے بھوت اتر جائیں گے۔ اور سوچے گا کہ کس عذاب میں مبتلا ہو گیا ہوں، یہ کھوکھلی ڈگریاں لے کر پھرے گا تو بے روزگاری کا ہی کشکول ہو گا تیرے ہاتھ میں، جن پہ تو اتنا ناز کر رہا ہے۔ پھر آئے گا میرے پاس، گھٹنوں کے بل چل کر ٹکے مانگنے۔ اسی لیے ابھی اپنا حصہ لے کر میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جا، تا کہ یہ فساد کی جڑ ہی مک جائے۔''

جہاں داد کو باپ کی بات کا بے حد افسوس ہوا وہ گھٹنوں پہ زور دے کر عالم طیش میں کھڑا ہو گیا۔

''یہ نہیں کہوں گا کہ کبھی نہ آنے کے لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔ آؤں گا اور ضرور آؤں گا لیکن حصہ مانگنے نہیں۔ ہاتھ مانگنے اور تب آپ پہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ مجھے کس چیز کی طلب ہے۔ دولت کی یا زہرہ کی۔''

اکبر ملک قہقہہ مار کر ہنس پڑا ''جس وقت تک تیرے پاس پیسہ آئے گا، خرچ کرنے والی تب تک تیرے پاس آ چکی ہو گی، اپنی محنت کی کمائی پہ تو مردو یسے بھی شیر ہوتا ہے۔ تجھے خود پتا چل جائے گا، کتنا پارسا ہے تو۔'' جہاں داد کو باپ کی بات گالی کی طرح لگی۔

''اگر میں ایسے ہی لوٹ آیا تو؟'' جہاں داد نے باپ کو چیلنج کیا۔

''تو پھر یہ باپ بیٹے کے مابین پہلی شرط ہو گی کہ کون جیتتا ہے۔'' اکبر ملک اپنی دور اندیشی پہ مصر تھا۔

''جیتنے والے کو کیا ملے گا؟'' جہاں داد نے چیلنج قبول کر لیا۔

اکبر ملک ایک لمحے کے لیے سٹپٹایا اور پھر اپنی انا کو جیسے داؤ پہ لگا دیا۔

''اس کی ضد۔'' اکبر ملک نے بڑے ٹھوس انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اپنا وعدہ یاد رکھنا۔'' پھر وہ وہاں سے لوٹ آیا۔ باپ کو جھٹلانے کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ کتنا کھرا ہے۔

لیکن خود کو کھرا ثابت کرنا اتنا سہل نہیں تھا۔ چاروں طرف سے آزمائش ہی آزمائش تھی اور وہ اس میں کود پڑا تھا۔ صرف محبت کے لئے۔

بہت عرصے تک اس کا گھر سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ لیکن ماتا کب سکو سے رہ سکتی تھی۔ شوہر سے چوری چھپے بیٹے کا پتا لگا لیا۔ بیٹے کا پتا معلوم ہوا تو اپنی خیریت کے خط بھیج دیتی۔ رہائش کا انتظام دوست کے ہاں تھا۔ موٹر سائیکل پہلے سے تھی۔ مگر نوکری نے لوہے کے چنے چبوا دیئے تھے۔

ماں کا خط صحرا میں بوند کی مانند لگتا۔ مگر اپنی خیریت کا احوال نہیں بھیج سکتا تھا۔ گاہے بگاہے ماں کا خط مل جاتا۔ جس سے زندگی کا احساس ہونے لگتا۔ ورنہ اس تندو تیز زندگی میں تھا ہی کیا۔ نری مشقت اور بس مشقت۔

☆ ☆ ☆

صفدر نے دروازہ کھٹکھٹایا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ اسے خود حیرت انگیز جھٹکا لگا کہ وہ اتنی دیر تلک کیسے سوتا رہا۔ کسلمندی سے دروازہ کھولا تو صفدر تشویش سے پوچھنے لگا۔

''صاحب! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟ آج اتنی دیر کر دی اٹھنے میں۔ کالج سے بھی دیر ہو گئی۔ فجر کے وقت میں آپ کا انتظار کرتا رہا کہ آپ مجھے جگانے آئیں لیکن نماز قضا ہو گئی اور آپ جگانے نہیں آئے۔ سو میں بھی دوبارہ سو گیا۔''

جہاں داد غسل خانے کی طرف جا رہا تھا۔ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر چپ چاپ غسل خانے میں چلا گیا۔

نہا کر نکلا تو اتنی دیر میں صفدر اس کا کمرہ صاف کر کے ناشتہ تیار کر چکا تھا۔

وہ معمول کے مطابق تیار ہوتا رہا۔

''صاحب! آج آپ نے رات کو سگریٹ بہت زیادہ پی ہے۔ اتنی سگریٹ پینا آپ کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ کیا آپ کو کبھی کوئی سگریٹ پینے سے منع نہیں کرتا تھا؟''

بال بناتے ہوئے جہاں داد کے ہاتھ رک گئے وہ خشک لہجے میں بولا۔

''بل جمع کرا دیے تم نے؟''

جی۔ وہ میں صبح صبح کرا آیا تھا۔''

صاحب کا خشک انداز دیکھ کر صفدر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے میز پہ ایک کارڈ اٹھایا۔ کارڈ ایک پرائیویٹ فرم کا تھا۔ جس کے مالک کو مینجنگ ڈائریکٹر کی ضرورت تھی۔ پرکشش نوکری کے ساتھ ساتھ رہائش کا بندوبست بھی تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ڈیوٹی پارٹ ٹائم تھی۔ جو وہ سہولت سے ادا کر سکتا تھا۔

قسمت آزمانے کے لیے اس نے وہ کارڈ اٹھایا اور اچھے مستقبل کی تلاش میں گھر سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

''سر! آپ دو دن سے کالج نہیں آ رہے تھے، ہم بے حد بور ہوئے۔'' کلاس کے ایک لڑکے نے کہا۔

''پڑھنے والے بچے کتابوں سے دل لگاتے ہیں استادوں سے نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے رجسٹر کھول رہا تھا۔ ذوباریہ کو لگا جیسے یہ بات اس سے کہی ہو۔

وہ جتانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چند اُستاد ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں سر! جنہیں یہ مقام اور اپنے طالب علموں کا پیار ملتا ہے۔'' کلاس نے گردنیں موڑ کر ذوباریہ کی طرف دیکھا۔

''اور ان چند خوش نصیبوں میں سے میں بھی ایک ہوں۔'' جہاں داد نے برجستہ کہا۔ ذوباریہ استہزائیہ مسکرا کر بیٹھ گئی۔

Althought the world is full of wicked people but he is an interesting wicked man (ویسے تو دنیا کمینوں سے بھری پڑی ہے لیکن یہ ایک دلچسپ کمینہ ہے)

اس نے نوٹ بک پہ ریمارکس درج کیا اور اپنی سہیلی کو دکھایا۔

ورشہ کے چہرے پر تبسم بکھر گیا۔

جہاں داد نے اچٹتی سی غیر ارادی نگاہ دونوں پر ڈالی۔

ورشہ نے وہی نوٹ بک دائیں طرف پاس کر دی۔ پھر پیچھے۔ پھر مزید آگے۔

''پلیز اسٹینڈ اپ۔'' پاسنگ گیم رک گئی۔

نوٹ بک صفیہ کے ہاتھ میں تھی۔

''یہ نوٹ بک یہاں رکھ جائیں۔''

صفیہ کے ساتھ ساتھ ورشہ کے چہرے پہ بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''سر! یہ میری نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں یہ کہاں سے چلی ہے۔ آپ سے جو کہا ہے آپ وہ کریں۔'' اس کا انداز سخت تھا۔

صفیہ نے قابلِ رحم نگاہوں سے ذوباریہ کی طرف دیکھا۔ پھر چپ چاپ نوٹ بک روسٹرم پہ رکھ کر چلی گئی۔

جہاں داد نے ایک نگاہ تحریر پر ڈالی۔

اس کی پیشانی پہ شکنیں ابھر آئیں۔ اس نے نوٹ بک بند کر کے روسٹرم پہ پٹخ دی۔

''مس ذوباریہ احمد! آپ کالج کی گولڈ میڈلسٹ طالبہ ہیں۔ لیکن کوئی بھی مقام جب تک رہتا ہے جب تک آدمی محنت کرتا ہے ان خرافات میں دلچسپی لینے سے بہتر ہے آپ پڑھائی پہ توجہ دیں۔''

ذوباریہ کو اس پہ سخت غصہ آیا۔

''سر! آپ نے بلاوجہ ہی میری نوٹ بک چیک کی ہے۔ اگر آپ پوری کلاس کی کاپیاں چیک کریں تو آپ کو اس سے اعلیٰ ریمارکس پڑھنے کو ملیں گے اور یہ فارینہ تو باقاعدہ آپ کے اسکیچ بناتی رہتی ہے۔ یقین نہ آئے تو دیکھ لیجیے۔'' وہ سکون سے بولی۔

جہاں داد برہم ہو گیا۔

''مس ذوباریہ احمد! کلاس کا منتظم میں ہوں آپ نہیں۔ کلاس کیا کرتی ہے کیا نہیں۔ یہ آپ کا دردِ سر نہیں ہے۔ کلاس کی کاپیاں چیک کرنے کے بجائے آپ اپنے آپ کو چیک کیا کریں۔ یہ آپ کے لیے زیادہ ضروری ہے۔ ناؤ سٹ ڈاؤن پلیز''

اس نے بری طرح جھڑک کر اسے بٹھا دیا۔

کلاس کو حیرت ہوئی ذوباریہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ وہ لیکچر دینے لگا۔ لیکچر کے آخر میں اس کی عادت تھی کلاس سے سوال کرنے کی۔ کلاس اطمینان سے جواب دینے لگی۔ پوری کلاس کو لیکچر سمجھ میں آ گیا۔ لیکن اس کا ہاتھ فضا میں بلند تھا۔ سو اسے وہی سوال دوبارہ لکھ کر سمجھانا پڑا۔

''اب آپ کی سمجھ میں آ گیا۔'' وہ استادوں کی طرح نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''نو سر؟'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

جہاں داد نے دوبارہ وہی سوال بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھایا۔

''ناؤ یو انڈر اسٹینڈ؟'' وہ مطمئن سا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''نو سر'' اس نے پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

جہاں داد نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کو کیا بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔ کھل کر وضاحت کریں۔''

''جو بات آپ نے مجھے لیکچر سے قبل سمجھانے کی کوشش کی تھی سر! وہ مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔'' وہ انتہائی معصومیت سے بولی۔
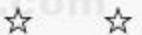
کلاس نے ہنسی چھپانے کے لیے گردنیں جھکا لیں۔ جہاں داد نے تیز و سرد نگاہ اس پہ ڈالی پھر چاک رکھ دیا اور رجسٹر اٹھاتے ہوئے بولا۔

''آپ مجھے ففتھ پریڈ کے بعد ملیے گا؟'' وہ کلاس سے باہر نکلنے لگا۔

''کون سے پارک میں سر؟'' وہ پیچھے سے برجستہ بولی۔

کلاس کو ہنسنے کی شدید خواہش ہوئی لیکن استادِ محترم کا رعب اس خواہش کی تکمیل میں آڑے آ گیا۔ اس قدر بے باکی پہ جہاں داد کے قدم من من کے ہو کر رک گئے۔ ''پرنسپل صاحب کے آفس میں۔''

اس نے ترش و تیز لہجے میں کہا۔ اور کلاس سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

ڈپارٹمنٹل اسٹور میں وہ اشیائے صرف کا انتخاب لسٹ ہاتھ میں تھامے بڑے انہماک وسگھڑ پن سے کر رہی تھی کہ اچانک جہاں داد کی نگاہ اس پہ پڑی۔ پرنٹڈ شرٹ کالر اسکارف ڈالے ملازم کے ہمراہ وہ تیزی سے چیزیں ٹرالی میں ڈال رہی تھی۔ ملازم اس کے پیچھے پیچھے ٹرالی گھسیٹتا ہوا آ رہا تھا۔ جہاں داد اپنی مطلوبہ اشیاء کی طرف متوجہ ہو گیا تھوڑی دیر میں ہی وہ اس کے قریب آ گئی۔ جہاں سے وہ ٹوتھ پیسٹ اٹھا رہا تھا وہیں اس نے بھی ٹوتھ پیسٹ اٹھایا۔ پھر اچانک اسے اپنے قریب دیکھ کر چونک گئی، نیلے ٹراؤزر پہ گرے شرٹ پہنے وہ ڈیسنٹ حلیے میں کھڑا تھا۔

''ارے، سر! آپ یہاں کیسے؟'' اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

جہاں داد نے سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی۔ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''کیسے آئے ہیں یہاں؟'' اس کا انداز خشک تھا وہ ہنس پڑی۔ پھر ٹوتھ پیسٹ اپنی ٹوکری میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''استادوں میں یہی خصوصیت ہوتی ہے۔ کوئی ان سے سوال کرے تو جواب دینے کے بجائے الٹا سوال داغ دیتے ہیں۔''

جہاں داد نے پلٹ کر تیز وسرد نگاہ اس پہ ڈالی تو وہ ٹھٹک گئی۔ پھر سنبھل کر مسکرائی۔

''ٹوتھ پیسٹ میں آپ کا انتخاب، میں بھی یہی استعمال کرتی ہوں۔''

''جہاں داد چپ چاپ اشیاء اٹھاتا رہا، وہ بھی چیزوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''آپ نے کل مجھے پرنسپل کے آفس میں بلایا تھا۔ کیا کہنا چاہتے تھے آپ مجھ سے؟''

جہاں داد جھک کر کچھ اٹھا رہا تھا۔ اتنے لاتعلق بننے سے اسے سخت غصہ آیا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا، پھر انتہائی تاسف سے بولا۔

''مس ذوباریہ احمد! جو چیپ حرکتیں آپ کرتی ہیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔''

ذوباریہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''بس اتنی معمولی سے بات کہنا تھی۔ میں سمجھی شاید کوئی بڑی بات ہو گی۔''

''یہ بات معمولی نہیں ہے، آپ کا کردار، آپ کی شخصیت مسخ ہو رہی ہے۔ ان حرکتوں سے۔'' ذوباریہ اس کے ناصحانہ انداز پہ اکتا کر بولی۔

''آیئے سر! کہیں بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں۔ یوں کھڑے کھڑے باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔'' (کس قسم کی لڑکی ہے یہ)

''شکریہ۔ میں مصروف ہوں۔ وہ مطلوبہ اشیاء کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''مصروف تو میں بھی ہوں۔ لیکن اچھی پیش کش ٹھکرانے سے پہلے غور ضرور کر لینا چاہیے۔''

''ایسی پیش کشیں میرے لئے نئی نہیں۔ میں روزانہ انہیں مسترد کرتا رہتا ہوں۔ شاید آپ کو اچنبھا ہو۔ مجھے غور کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

ذوباریہ استہزائیہ مسکرائی۔

''پہلے ہی روز کلاس نے آپ کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر کے، کچھ اچھا نہیں کیا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے استاد اور شاگرد کے مابین کچھ حجاب ہونا چاہیے۔اس سے رشتوں کا احترام برقرار رہتا ہے۔''

اس نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔ذوباریہ لاجواب ہو کر اشیاء دیکھنے لگی۔

اتفاق کی بات تھی دونوں نے ایک وقت میں ایک جیسی چیزیں لیں۔

جو شیمپو اس نے اٹھایا وہی ذوباریہ نے لیا۔

جو باتھ سوپ ذوباریہ نے لیا وہی جہاں داد نے لیا۔

''عجیب اتفاق ہے سر۔'' وہ شانے اچکا کر مسکرائی۔

وہ خود اس اتفاق پر حیران تھا۔لیکن اسے یہ اتفاق قطعاً پسند نہیں آیا۔

اس نے سب کچھ چھوڑ کر گولڈ لیف کا ڈبا اٹھالیا۔

''یقیناً یہاں اتفاق نہیں ہوگا۔'' اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

ذوباریہ ہنس پڑی۔پھر دوسرے کیبن سے ''ڈیفنس پیچز'' سگریٹ کی ڈبیہ اٹھاتے ہوئے بولی۔''یہاں میرا انتخاب واقعی مختلف ہے۔''

جہاں داد نے بے حد حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ سگریٹ پیتی ہیں؟'' وہ حیرانی کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکا۔

ذوباریہ کو اسے حیران کرنے میں بڑا لطف آیا۔

''رب نواز! تمام اشیاء کو چیک کرا کر بل بنواؤ میں آ کر پے منٹ کرتی ہوں۔''

''جی بی بی جی!'' ملازم حکم بجالاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

پھر وہ اس سے مخاطب ہو کر بولی۔

Yes sir Iam Chain smoker (جی ہاں سر، میں عادی سگریٹ نوش ہوں)

جہاں داد نے توجہ سے اس کے چہرے پہ تفصیلی نگاہ ڈالی۔پھر اس کے ہونٹوں کی طرف بغور دیکھا۔اور ناگواری سے بولا۔

''جو لوگ سگریٹ کے عادی ہوتے ہیں ان کے ہونٹوں کی رنگت سیاہی مائل ہوتی ہے جبکہ آپ کے ہونٹوں کی گلابی رنگت بالکل نیچرل ہے اس کا مطلب ہے آپ جھوٹ بھی بولتی ہیں۔''

''ذوباریہ اس کے تجزیے پہ ایک بار پھر لاجواب ہوگئی۔

سامان اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔پھر چلتے چلتے پلٹا۔

''چیلنج کرنے کا آپ کو بے حد شوق ہے لیکن اس بار یہ دھیان میں رکھیے گا کہ بائیک کی سواری کرتے ہوئے عورت دلیر لگتی ہے لیکن سگریٹ پیتی ہوئی عورت ٹھکرائی ہوئی لگتی ہے،باقی آگے آپ کی مرضی۔''

اس کے چہرے پہ عجیب سا تبسم تھا، ذوباریہ کھڑی ہو کر اس کی چوڑی پشت کو گھورتی رہی۔
یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

''جہاں داد صاحب! پچھلے تین سالوں کا جو حساب کتاب ہے، وہ آپ اس فائل سے ٹیلی کیجیے، تمام گوشوارے ملائیں اور دیکھیں کتنا فرق ہے۔ پھر اس سارے حساب کو کمپیوٹر پہ اتار دیجیے، تاکہ کسی شک شبے کی گنجائش نہ رہے''

''لیکن سر! میں کمپیوٹر آپریٹ کرنا نہیں جانتا۔ یہ میں آپ کو بتا چکا تھا۔''

''اس بات کو چھوڑیں، اسحاق صاحب سے میں نے کہہ دیا ہے وہ آپ کے روم میں کمپیوٹر اور کمپیوٹر جاننے والے باصلاحیت اور بااعتماد شخص کی تقرری کر دیں گے جس سے آپ نے اپنی زیرنگرانی کڑی نگاہ رکھ کر کام کرانا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو کمپیوٹر سیکھ بھی سکتے ہیں کوئی لمبا چوڑا عرصہ نہیں لگے گا۔''

''میں کوشش کروں گا سر۔''

''پچھلا منیجر ہمیں خاصا پریشان کر کے گیا ہے۔ کمپنی کو نقصان ہوا ہے۔ کچھ عرصہ تک ہو سکتا ہے کچھ دوسری پریشانیوں کی وجہ سے میں آفس میں اتنا وقت نہ دے سکوں، چنانچہ آپ کو بے حد ذمہ داری سے کام کرنا ہو گا۔''

''السلام علیکم پاپا جانی!'' وہ آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
سلسلہ کلام منقطع ہو گیا۔

''وعلیکم السلام پاپا کی جان!'' فائق احمد سب کچھ چھوڑ کر بیٹی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جہاں داد نے گردن گھما کر دیکھا۔
کھلے پائنچوں کی گرے کلر کی پینٹ، بلیک شرٹ گرے سوٹ میں ملبوس میرون اسکارف ڈالے۔ ذوباریہ فائق احمد کے سامنے کھڑی تھی۔
جہاں داد کو بے حد تعجب ہوا کہ وہ فائق احمد کی بیٹی ہے۔ ''کیسے آنا ہوا ہماری بیٹی کا؟'' فائق احمد نے بے حد لاڈ سے پوچھا۔

''وہ پاپا۔ بس ذرا پچاس ہزار روپے چاہیے تھے۔'' (ذرا پچاس ہزار) جہاں داد نے اسکا کہا ہوا جملہ زیرلب دہرایا۔

''بھئی ایسی بھی کیا ضرورت پڑ گئی کہ ہماری بیٹی کو خود پیسوں کے لیے آنا پڑا''

''وہ پاپا کالج میں ثقافتی میلے کا انعقاد ہو رہا ہے نابینا افراد کی فلاح و نمائندگی کے لیے۔ جسٹ بور فنکشن۔ عجیب ہے ہماری ثقافت بھی۔ بھوسے سے بھرے ہوئے گھوڑے ڈانس پیش کریں گے۔ لٹھے کے فراکوں میں ملبوس مرد حضرات گول گول گھومیں گے۔''

پھر وہ استہزائیہ مسکرا کر بولی۔ ''اور تو اور انہیں دیکھنے صحت و ثقافت کے وزیر اور مشیر بھی تشریف لا رہے ہیں۔ مہمان خصوصی کے طور پہ۔''

''اب آپ کو پچاس ہزار روپے کس لیے چاہئیں؟''

''وہ پاپا۔ طلبہ و طالبات کی امدادی ٹکٹ فروخت کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔''

''تو گویا تمام ٹکٹ آپ ہمیں فروخت کرنے آئی ہیں۔''

''مجبوری ہے پاپا! مجھے شہر کے دوسرے امیروں کا ایڈریس معلوم نہیں ہے۔''

وہ منہ بنا کر بولی تو فائق احمد مسکرا دیئے۔

''ایک امیر تو آپ کے پرنسپل صاحب بھی ہیں۔ ان کے گھر دھاوا کیوں نہیں بولا؟''

''جی جناب تا کہ انہیں شکایت لگانے کا ایک اور موقع مل جاتا۔''

''تو آپ انہیں شکایت کا موقع ہی کیوں دیتی ہیں۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا اور ہاں وہ کہہ رہے تھے۔ کوئی نئے پروفیسر آئے ہیں آپ کے کالج میں، بہت پریشان کر رکھا ہے آپ نے انہیں۔''

''میں نے پریشان کر رکھا ہے انہیں، بلکہ الٹا انہوں نے ہی پریشان کیا ہوا ہے مجھے۔ وہ کرسی دھکیل کر بیٹھ گئی۔

''س س، سر آپ، یہاں؟'' اس کا تحیر قابل دید تھا۔

''آپ جانتی ہیں بیٹا انہیں؟'' فائق احمد نے سوال کیا تو اس نے تعجب سے باپ کی شکل دیکھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے انکار کر دیا۔

''نن نہیں۔ تو۔''

''یہ ہماری کمپنی کے نئے مینجر ہیں۔'' فائق احمد نے اخلاقاً تعارف کرایا۔ ''اور جہاں داد صاحب، یہ ہماری بیٹی ہے، ذوباریہ۔''

''میں جانتا ہوں سر انہیں۔'' جہاں داد نے فائق احمد کی بات کاٹ کر کہا۔ پھر اس نے ذوباریہ کی طرف دیکھا اور جتانے والے انداز میں بولا۔ ''غالباً میں آپ کا وہی استاد ہوں جس نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے۔ چلتا ہوں سر۔ کوئی کام ہو تو انٹر کام پر مطلع کر دیجئے گا۔''

وہ فائلیں اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ فائق احمد نے تعجب سے بیٹی کی شکل دیکھی۔ تو وہ کندھے اچکا کر ہنس پڑی۔ ابھی وہ اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ دس منٹ کے بعد انٹر کام بجا۔

''یس سر۔''

''جہاں داد صاحب! پچاس ہزار روپے فوری طور پر کیش میں مل جائیں گے۔''

''مل جائیں گے سر!''

''ٹھیک ہے۔ آپ پیسے میرے روم میں بھجوا دیں۔ ایک منٹ۔''

فائق احمد نے ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھا۔ پھر دوبارہ بولے۔ ''وہ ایسا ہے کہ ذوباریہ آپ کے روم میں خود آ رہی ہے۔ جتنے پیسے چاہتی ہے، کیش کی صورت میں اسے دے دیجئے گا۔''

''اوکے سر'' اس نے انٹر کام بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ذوباریہ اندر داخل ہوئی۔

کچھ دیر قبل اس کے چہرے پر جو ہوائیاں اڑی تھیں اس کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ بلکہ اب بے حد اطمینان اور آسودگی جھلک رہی تھی۔

''آیئے تشریف رکھئے۔'' جہاں داد نے گویا فارمیلٹی ادا کی۔

وہ مسکرا کر کرسی پہ بڑے مطمئن سے انداز میں بیٹھ گئی۔

''کتنے پیسے چاہئیں آپ کو؟''

''ففٹی تھاؤزنڈ۔'' اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔

جہاں داد نے فون پہ دوسری جگہ رابطہ کیا۔ پھر کیشیئر کو پچاس ہزار روپے لانے کے لیے کہا۔ اتنی دیر میں اس نے پورے آفس کا جائزہ لے ڈالا جو کہ بالکل عام سا تھا۔

''آپ انتظار کریں۔ پیسے ابھی آتے ہی ہیں۔'' اس نے فون بند کر دیا اور فائل کی طرف متوجہ ہوا۔

''اخلاق کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ انتظار کے عرصے میں میری کچھ تواضع کریں۔ خواہ کہ وہ سادہ پانی کا گلاس ہی کیوں نہ ہو۔ بہر حال آپ کا فرض بنتا ہے۔ فی الوقت آپ میزبان ہیں اور میں مہمان ہوں۔''

جہاں داد نے ایک نگاہ غلط اس پہ ڈالی اور جز بز سا ہو کر پھر انٹر کام اٹھایا، بٹن پش کیا۔ خیال آیا تو اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا لیں گی آپ؟''

اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ مسکرائی۔

''قدرت کے کھیل ہیں سر! کل آپ نے میری پیش کش مسترد کر دی تھی، آج خود ہی مجھے آفر کر رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ ''بہر حال کچھ بھی منگوا لیجئے۔ جو آپ کو پسند ہو۔ یہ تو ثابت ہے ہماری پسند اتفاقیہ طور پر ہی سہی پر، ملتی تو ہے۔''

''چائے اور کچھ اسنیکس بھجوا دیجئے۔'' آرڈر دے کر وہ کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگی۔

آف وہائٹ میرون دھاریوں والی شرٹ اور میرون پینٹ میں اس کا وجیہہ سراپا کس قدر جچ رہا تھا۔ حالانکہ اس کا لباس نہ تو قیمتی تھا اور نہ ہی گراں قدر خصوصیات کا حامل تھا، گریبان کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اس کے سینے کے بال تھوڑے تھوڑے نظر آ رہے تھے۔ دائیں آستین فولڈ کی ہوئی تھی اور بائیں آستین کھلی ہوئی تھی۔ مزاج کی طرح لباس میں بھی لاپروائی کا عنصر نمایاں تھا۔

وہ بڑی محویت سے فائل کی طرف متوجہ تھا، یوں جیسے وہ کمرے میں تنہا ہو۔ دوسرے فرد کی موجودگی کا چہرے پہ ذرا بھی احساس نہیں تھا، ذوباریہ کی نگاہیں اس کے چہرے پہ ٹک گئیں۔ گہرے سیاہ چمکدار بال چوڑی پیشانی پہ بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ روشن چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھیں بے حس و بے جان کاغذوں پر گہری پلکیں نہیں دیکھی تھیں۔ یا شاید کسی مرد کو اتنے غور اور دلچسپی سے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ دوسری دلچسپ بات اس کے گال کا سیاہ واضح تل لمبی سی ستواں ناک اٹل ارادوں کی طرح کھڑی تھی۔ یوں جیسے اس کے مزاج کی غمازی کر رہی ہو۔ پہلی ملاقات میں ہی اپنے ناک کے تیکھے پن سے وہ اسے کسی حد تک مغرور اور لاتعلق لگا تھا۔

بھری بھری سیاہ مونچھیں۔ جن سے بالائی ہونٹ تقریباً چھپ گیا تھا۔ لیکن نچلے ہونٹ کی رنگت قدرے کھلی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ تھوڑی کے وسط میں بالائی رخ ہلکا سا خم تھا یوں جیسے خالق قدرت نے اپنا شاہکار بنا کر خود ہی پیار سے چھو لیا ہو۔

''میں اندر آ سکتا ہوں سر!'' نووارد کے آنے پر اس کی محویت ٹوٹی۔ تو سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''آیئے شیمم صاحب!'' شیمم اندر آ گیا۔ سلام کیا پھر پیسے جہاں داد کی طرف بڑھائے۔ لیکن اس نے کہا'' یہ پیسے میڈم کو دے دیجئے۔''

اس نے مودبانہ انداز میں پیسے ذوباریہ کے سامنے کیے۔ ذوباریہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''شیمم صاحب! آپ یہ پیسے میز پر رکھ دیں اور باہر چلے جائیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ جہاں داد کے سامنے پھیلا دیا۔

''جہاں داد نے ایک سلگتی سی نگاہ اس پہ ڈالی۔

(اگر تم مجھے میری کمتر حیثیت کا احساس دلانا چاہتی ہو اور یہ سمجھتی ہو کہ میں ایک ادنیٰ سے ملازم کی طرح تمہارے سامنے روپے پیش کر کے اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گا تو یہ تمہارے اندر کا کمپلیکس اور خلا ہے۔ تمہاری کسی بھی برتری سے مجھ پہ اور میری صلاحیتوں پہ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میں اس ذمہ داری کو اپنی نوکری کا حصہ ہی سمجھتا ہوں)

جہاں داد نے رقم اٹھا کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دی۔

(آپ اندازہ نہیں کر سکتے سر! آپ کے ہاتھ سے پیسے لے کر مجھے کس قدر تقویت ملی ہے۔ آپ شاید سوچ بھی نہیں سکتے میرے پرس میں میرے ذاتی اکاؤنٹ کا چیک پڑا ہوا ہے۔ میں چاہتی تو یہ چیک کاٹ کر کالج میں جتنا مرضی ڈونیٹ کر سکتی تھی۔ چونکہ مجھے مانگنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اسی لیے میں پاپا کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتی ہوں۔ لیکن کبھی انہوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیسے نہیں دیئے۔ ان کا بھی اپنا ایک نظریہ ہے۔ مانگنے اور دینے سے احساسات مجروح ہوتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے کچھ ایسا سلسلہ بنایا ہوا ہے کہ بالواسطہ مجھے مانگنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ انہیں دینے کی)

اس نے وہ رقم اپنے پرس میں ڈال لی۔ اسی اثناء میں ملازم ٹرے سجا کر لے آیا اور اس کے سامنے رکھ دی۔

جہاں داد کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

''خالد میں ذرا باہر جا رہا ہوں میڈم کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو لا دینا۔''

''ایک معمولی چپراسی کے سامنے ذوباریہ کو اس کا یہ رویہ انتہائی تضحیک آمیز لگا۔ جبکہ وہ پہلے ہی دو پیالیوں میں چائے ڈال چکی تھی، خالد دانت نکوس کر بولا۔

''جہاں داد صاحب تو میڈم ویسے بھی چائے نہیں پیتے۔'' اس نے تپتی ہوئی نگاہوں سے جہاں داد کی طرف دیکھا اور عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولی۔

''اچھا تو گویا یہ ایک وقت میں ایک ہی نشہ کرتے ہیں۔'' جہاں داد کمرے سے نکل رہا تھا۔ اس کے لفظوں پہ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز جب وہ آفس آیا تو اپنے آفس کا حلیہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کمرہ تھا یا کوئی لگژری اپارٹمنٹ۔ اعلیٰ فرنیچر، اسٹائلش، پردے، دبیز اور قیمتی قالین۔

ہر ایک چیز اعلیٰ ذوق کی نمائندگی کر رہی تھی۔

پہلے تو اسے گمان ہوا کہ وہ غلط جگہ پہ آ گیا ہے۔ لیکن پھر اس کی نگاہ میز پہ پڑی جہاں خوبصورت پھولوں کے ساتھ ایک عدد رقعہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ اٹھایا اور کھول کر دیکھا۔ تحریر انگریزی میں رقم تھی۔

''نئی نوکری مبارک ہو، جس کمرے میں آپ بیٹھا کرتے تھے وہ کمرہ آپ کے شایان شان نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ہر چیز تبدیل کرادی۔ امید ہے کمرا پسند آیا ہوگا۔''

عالم طیش میں اس نے کاغذ کے پرزے پرزے کر دیئے۔

پھر گھنٹی بجائی۔۔ ملازم حاضر ہوگیا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' وہ جھنجھلا کر بولا۔

''سر! یہ سب کچھ میڈم کی مرضی سے ہوا ہے۔''

ملازم نے جواب دیا۔

''تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''سر! آپ کے لیے کیا لے کر آؤں، میرا مطلب ہے کہ کس قسم کا مشروب پیئں گے۔ اس وقت آپ؟''

اس نے نے حیرت سے خالد کی شکل دیکھی۔

''سر یہ میڈیا کا حکم ہے کہ آپ کا بہت زیادہ خیال رکھا جائے۔ آپ کو یہاں کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور......

''اوہ شٹ اپ!'' اس نے چلا کر ملازم کو چپ کرایا۔ ''ایم ڈی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں؟'' لہجہ غضبناک تھا۔

''شاید سر!'' ملازم گھگھیا گیا۔

وہ پھول اٹھا کر آندھی طوفان کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا اور اسی رفتار سے آفس میں داخل ہوا۔

وہ اپنے باپ کی کرسی پہ بڑے استحقاق واعتماد سے سامنے ہی براجمان تھی۔ جہاں داد نے وہ سب پھول اس کے سامنے پھینک دیئے۔

پھر دونوں ہتھیلیاں میز پر جما کر اس کے سامنے جھکا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا ہوں۔ آپ کو ہر وقت حالت جنگ میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ لیکن اپنی یہ خوبی، صلاحیتیں مجھ پہ آزمانے کی بجائے کہیں اور صرف کیجیے شاید بات بن جائے۔ آپ کے اس عمل میں کیا ہوا۔ آپ کے باپ کے آفس کا ایک اور کمرہ لگژری ہوگیا۔ اور بس۔ میں ان باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ میرے لیے یہ اتنا ہی معمولی فعل ہے جتنا ایک دولت مند خاتون اپنا اسٹیٹس دکھانے کے لیے عام سے عام فنکشن میں بھی قیمتی ساڑھی اس

لیے پہنتی ہے تاکہ لوگ اسے خوش قسمت اور بے حد امیر سمجھیں۔ درحقیقت اپنی خوش قسمتی پہ وہ خود بھی خوش نہیں ہوتی۔ تب ہی لوگوں کو متاثر کرنے کی سعی کرتی رہتی ہے۔'' کہہ کر وہ رکا نہیں۔ وہ ان قدموں سے واپس پلٹا۔

''بات تو سنیے سر!'' اس کی آواز عقب سے آئی تو اس کے قدم رک گئے۔

''آپ یہ نوکری چھوڑ دیجیے۔''

''جہاں داد نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر طنزیہ مسکرا کر بولا۔

''پچھلے رویوں کا جواب ہے یہ......''

''نہیں سر!'' وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ ''میرے سابقہ رویے کے بعد پاپا کے آفس میں آپ خود کو ہمیشہ ان بیلنس، شکستہ، مجبور اور ہارا ہوا محسوس کریں گے۔''......

''بات سنیں مس ذوباریہ احمد! انسان خود کو شکستہ، مجبور اور ہارا ہوا وہاں محسوس کرتا ہے جہاں سے مفت کی لے کر کھاتا ہے۔ میں یہاں محنت کرتا ہوں۔ یہاں سے مجھے جو کچھ بھی ملتا ہے وہ سراسر میری محنت اور ذہانت کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ آپ کے رویوں کا خراج، میرا ایمان ہے انسان کو اپنی محنت پہ نہ تو شرم آنی چاہیے اور نہ ہی اسے دوسرے خوب تر شخص سے کبھی حسد محسوس کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر انسان اپنے اپنے نصیب کے دائرے میں قید ہوتا ہے۔ اگر آپ مجھے ریزائن کرنے کو کہیں گی تو میں کسی وجہ سے ہی مستعفی ہوں گا۔ ڈس مس کرنے کا اختیار بہر حال آپ کے پاس ہے۔ آرڈر کا انتظار کروں گا؟''

وہ بلا دھڑک کمرے سے باہر نکل گیا۔ ذوباریہ کے لبوں پہ تیکھی سی مسکان سج گئی۔

☆ ☆ ☆

تیرے نال ملائیاں اکھیاں
وے توفیروی دوریاں رکھیاں
توجت گیا سجناں۔ میں تگڑی ہار گئی۔

ورشہ کمرے میں داخل ہوئی تو نور جہاں کی آواز اس کے کانوں کے آر پار ہونے لگی، اس نے کانوں پہ انگلیاں رکھ لیں پھر کمرے کا جائزہ لیا حسب معمولی ٹی وی آن تھا، ٹی وی چینل پہ ''میڈونا'' قابل اعتراض حلیے میں تھرک رہی تھی۔ اور وہ خود کم لائٹس میں بہت سارے کشن اور تکیوں کے درمیان، موپساں، رائیڈر ہیگرڈ، رچرڈ برٹن اور ولیم شیکسپیر کے ناول بکھرائے بیٹھی تھی ''شی'' آنکھوں سے لگا تھا۔ ہاتھ گاجر کے حلوے پہ تھا۔

''ورشہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی۔ پھر اس کے سر پہ اپنا پرس مارتے ہوئے بولی۔''

''یہ تم کھا رہی ہو، پڑھ رہی ہو، سن رہی ہو، یا دیکھ رہی ہو؟''

ذوباریہ اس کی اچانک آمد پہ چونک پڑی پھر مسکرا کر بولی۔

''چاروں ہی کام اکٹھے کر رہی ہوں۔''

اور میرا خیال ہے تم ایک بھی کام صحیح طرح سے نہیں کر پائیں۔''

اس کی غیر حاضری پہ ورشہ نے چوٹ کی۔ پھر ڈیک اور ٹی وی دونوں چیزیں آف کر کے کھڑکیوں پہ سے پردے ہٹا دیے۔

پھر اس کے مقابل آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور اس کے ہاتھ سے ناول لے کر دور پھینک دیا۔

''تمہیں معلوم ہے۔ مجھے تمہارے تمام شوق زہر لگتے ہیں، ماسوائے ایک کے۔''

اس نے گاجر کے حلوے کو آنکھ ماری اور سر جھکا کر حلوہ ہڑپ کرنے لگی۔

''اگر تم میں کھانے پینے کا اعلیٰ ذوق نہ ہوتا تو میں کب کی تم سے دوستی ختم کر چکی ہوتی۔''

''اس کا مطلب ہے، تم کھانے پینے کے لیے میرے پاس آتی ہو۔''

''کیا بتاؤں بہن! گھر میں بہن بھائی اتنے زیادہ ہیں کہ مجھے کبھی پورا حصہ نہیں ملتا۔''

ذوباریہ نے ہنس کر اس کے سر پہ کتاب ماری پھر ساری کتابیں ریک میں ترتیب سے رکھنے لگی۔

''سنو۔''

''ہوں۔''

''ہادی نے مجھے پرپوز کیا ہے۔''

''انکار کر دو اسے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس نالائق کے والدین اب تک اولاد میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے، یہ موروثی بیماری اس میں بھی ہو۔ بڑھاپے تک وافر اولاد کی وجہ سے تمہیں کبھی بھی پورا کھانے کا نہیں مل سکے گا۔''

ورشہ اس کی دوراندیشی پہ ہنس پڑی۔''اور قدیر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اسے تحقیق کے بعد ریجیکٹ کرنا۔ کیونکہ مستقبل قریب کا ڈاکٹر ہے۔ اسکے عزائم نیک ہوں گے۔'' ذوباریہ نے تسلی دی، ورشہ مسکرادی۔

''اور تمہارے عزائم کیا ہیں؟''

''میرے؟'' ذوباریہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی جناب آپ کے۔ کلاس میں بہت سیدھی سیدھی چل رہی ہو۔ نہ کوئی سوال، نہ کوئی جواب، کہیں کوئی بڑا دھاکہ تو نہیں ہونے والا۔ مجھے پہلے بتا دینا۔ میں تمہاری اچانک افتاد سے بہت تنگ ہوں۔''

''حلوہ منگواؤں اور......'' ذوباریہ نے پلیٹ صاف دیکھ کر کہا۔

''نہیں بس۔ مجھے تو چکھنا ہی تھا۔''

ذوباریہ نے صاف ستھری پلیٹ کی طرف دیکھا۔

''یہ چکھنے کی عادت ذرا کم کرو۔ ڈاکٹر حضرات چکھنے کا بہت پرہیز بتاتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو، آدھے حصے سے بھی جاؤ۔''

ذوباریہ نے ہنس کر ٹالا۔ مگر ورشہ سمجھ گئی۔

''ذوباریہ!''

''ہوں۔''

''ذرا میری طرف دیکھو۔''

''کس اینگل سے زیادہ اچھی لگتی ہوں۔ کدھر سے دیکھوں؟'' ذوباریہ ہنس کر مڑی مگر ورشہ سنجیدہ تھی۔

''سر۔ سر ہی ہیں ناں۔ سرکار تو نہیں بن بیٹھے؟''

جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ورشہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولی۔

''آخر ان کی کون سی خوبی نے تمہیں زیادہ متاثر کیا ہے؟'' ذوباریہ کندھے اچکا کر مسکرائی۔

''اس میں سب سے اچھی خوبی یہ ہے کہ وہ صنف مخالف کی کسی بھی خوبی سے متاثر نہیں ہوتا۔''

حالانکہ تم نے تماثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' ورشہ نے چوٹ کی۔

''اتفاق کی بات ہے۔ میں خود ہی ان سے متاثر ہوگئی۔'' وہ لاپروائی سے ہنس پڑی۔

''حالانکہ تم نے متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' ورشہ نے چوٹ کی۔

''اتفاق کی بات ہے۔ میں خود ہی ان سے متاثر ہو گئی۔'' وہ لاپروائی سے ہنس پڑی۔

''مگر وہ تمہیں خوش نہیں رکھ سکیں گے؟'' ورشہ تاسف سے بولی۔

''کیوں؟'' ذوباریہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہارا اسٹیٹس ان بیلنس ہے اس لیے۔''

ذوباریہ استہزائیہ مسکرا دی۔

(بیلنس صرف ظاہری شخصیت میں ہونا چاہیے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہر توازن بے کار ہے)

''چھوڑو اس قصے کو۔ یہ بتاؤ اب تم نے ہادی پہ غور کرنا ہے یا ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب پہ؟''

''فی الحال تو تم پہ غور کر رہی ہوں۔ آیا تم سنجیدہ ہو یا مذاق کرنے کا کوئی نیا طریقہ ہاتھ لگا ہے۔'' اس کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ ذوباریہ سنجیدہ ہو گئی۔

''زندگی کے اہم فیصلے مذاق نہیں ہوتے۔''

''مگر اہم فیصلے یک طرفہ بھی نہیں ہوتے۔'' ورشہ نے جتایا۔

''ہمیشہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ بہت کچھ بدل جاتا ہے۔''

لیکن ذوباریہ! وہ بہت مختلف شخص معلوم ہوتا ہے۔ مجھے ڈر ہے، کہیں تمہیں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے، اب بھی وقت ہے سوچ لو۔ جتنا زیادہ آگے بڑھو گی پیچھے پلٹنا دشوار ہو جائے گا۔ برداشت کر لو گی اپنی تذلیل؟''

''کیوں کیا کمی ہے مجھ میں؟'' ذوباریہ تڑپ کر بولی۔

''اگر وہ خوبیوں پہ مرنے والا ہوتا تو نجانے کتنوں سے دل بہلا رہا ہوتا؟''

''اس کی یہی تو بات اچھی لگتی ہے۔'' دوسرے ہی لمحے ذوباریہ ہنس پڑی۔

''ایک وقت تھا، تمہیں عمر خان بھی اچھا لگتا تھا۔ صرف اسی وجہ سے۔''

''اس وقت میں سکس کلاس میں تھی۔'' ذوباریہ نے ہنس کر بتایا۔

''لیکن مجھے تم آج بھی سکس کلاس کی ہی بچی لگ رہی ہو۔ ان میچورڈ اور جذباتی۔'' ورشہ نے اسے جھڑک دیا۔ ذوباریہ خاموش ہو گئی۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے گلے کی چین سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''سنو کیا واقعی وہ اتنا پتھر ہے؟''

ورشہ نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پہ پہلی بار کسی بھی قسم کا گھمنڈ نہیں تھا بلکہ شکست کا اندیشہ لہجے کو زخمی کر رہا تھا۔ ورشہ کے دل کو کچھ ہوا اور دوسرے ہی لمحے وہ ہنس پڑی۔

''وہ جو بھی ہو، بہر حال ایک مرد ہی ہے اور مرد عورتوں کے اثرات سے زیادہ دیر تک نہیں بچ پاتے۔''

''لیکن جو بچ جاتے ہیں۔ وہ یا تو مرد نہیں ہوتے یا پھر پتھر ہوتے ہیں۔'' ذوباریہ نے ورشہ کی طرف دیکھا، پھر سر جھٹک کر گلے کی زنجیر سے کھیلنے لگی۔

(مجھے پتھر کو موم کرنا آتا ہے)

☆ ☆ ☆

''مے آئی کم ان سر؟'' اس نے آفس کے دروازے سے جھانک کر پوچھا۔ جہاں داد الماری میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ پورا کا پورا مڑ گیا۔ موٹی ایڑی کے کالے اسٹریپ والے سینڈل جن میں اس کے دودھیا پاؤں کا گداز ابھر رہا تھا۔

کالی پینٹ، سرخ اور کالی پرنٹڈ ڈھیلی سی شرٹ، شانوں پہ سرخ اسکارف ڈالے وہ دروازے میں ایستادہ تھی۔

جہاں داد کو اس کا اجازت مانگنا عجیب سا لگا، فائل میز پر ڈالتے ہوئے طنزیہ مسکرا کر بولا۔

''آپ کے والد کا آفس ہے۔ بلا اجازت بھی اندر آ جائیں تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی مالک کچھ کرنے سے پہلے محکوموں سے پوچھا نہیں کرتے۔''

اس نے شانے اچکا کر کمرے کے حلیے کی طرف اشارہ کیا اور کرسی دھکیل کر بیٹھ گیا۔

ذوباریہ شرمندہ ہو گئی۔ اجازت طلب جملے بے ساختہ تھے، ہچکچاتے ہوئے وضاحت کرنے لگی۔

''دراصل کلاس روم کی وجہ سے۔ آپ سے بار بار اجازت مانگنے کی عادت پڑ گئی ہے۔'' پھر وہ اندر کمرے میں داخل ہو گئی۔ جہاں داد سامنے رکھے کاغذ الٹ پلٹ کرنے لگا۔ ذوباریہ کو عجیب سا لگا۔

''آپ مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے؟'' جہاں داد نے اس کی طرف دیکھا۔

''اب پچھلے جملے مت دہرایئے گا۔'' ذوباریہ تیزی سے بولی۔ ''بے شک میں اس پوری بلڈنگ کی مالک ہوں، لیکن فی الحال تو یہ روم آپ کی دسترس میں ہے۔ اس لحاظ سے آپ یہاں کے مالک ہیں۔ اور مجھ پہ واجب ہے جو کچھ بھی یہاں کروں، آپ کی مرضی کے تحت کروں۔''

''یہ سب آرائش میری مرضی کے تحت ہی تو ہوئی تھی۔'' جہاں داد کا انداز انتہائی کاٹ دار تھا۔

''اگر آپ کو کچھ ناپسند ہے تو میں تبدیل کر دیتی ہوں۔''

جہاں داد نے تیز سی نگاہ اس پہ ڈالی تو وہ خاموش ہو گئی۔

''بیٹھ جایئے پلیز۔'' ناچار اسے کہنا پڑا۔ ذوباریہ تشکر آمیز انداز میں بیٹھ گئی۔ وہ پھر سے مصروف نظر آنے لگا۔

کئی لمحے وہ یونہی بیٹھی رہی۔ اس نے معمولی سی بھی توجہ نہیں دی۔ ذوباریہ اس کی بے اعتنائی پہ سلگ کر رہ گئی۔

''آخر ان کاغذوں میں ایسا بھی کیا ہے کہ آپ کو ان کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔''

جہاں داد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ تو اس نے فوراً سر جھکا لیا اس کے ساتھ ہی آواز اور لہجہ بھی دھیما ہو گیا۔ شکایتاً بولی۔

''آپ کلاس روم میں بھی مجھ پہ توجہ نہیں دیتے۔ یہ زیادتی ہے۔ آئی مین، میں آپ کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ استاد کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کلاس میں کسی ایک اسٹوڈنٹ کو شدید طریقے سے نظر انداز کرے۔ آخر آپ باقی اسٹوڈنٹس کے ساتھ بھی تو اپنائیت سے پیش آتے ہیں۔ مجھے آپ کا ایسا رویہ تکلیف پہنچاتا ہے۔''

جہاں داد اس کی بات سن کر طنزیہ مسکرایا، فائل پہ سرخ ربن کی گرہ لگاتے ہوئے بولا۔

''تو گویا آپ شکایت کرنے آئی ہیں۔ حالانکہ آپ کو یہ شکایت یا تو پرنسپل سے کرنی چاہیے تھی یا اپنے والد صاحب سے، کم از کم میری کھنچائی تو ہوتی، اب تو کچھ فائدہ نہیں ہوا۔''

اس نے فائل ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھ میز پہ رکھ لیے۔ پھر ایک ہاتھ کی کہنی میز پہ رکھ کر اس پہ ٹھوڑی ٹکالی، اور دوسرے ہاتھ کے ناخنوں سے آہستہ آہستہ ٹیبل بجانے لگا۔

ذوباریہ نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بغور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کا لہجہ اور انداز قطعی اچھا نہیں لگا، صلح کن لہجے میں بولی۔

''سر! شروع شروع میں ہمارے درمیان جو بھی محاذ آرائی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ بار بار تاریخ دہراتے رہیں گے، میرا مطلب ہے، یہ چلتا ہی رہے گا۔''

اس کی بات پہ جہاں داد ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''حیرت کی بات ہے۔ جن لوگوں نے جنگ شروع کی تھی۔ وہی مفاہمت میں بھی پہل کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ جو جنگ چھیڑتا ہے وہ جنگ پہ ہی فیصلہ کرتا ہے۔'' اس کی بات پہ ذوباریہ کا سر جھک گیا۔

(فیصلہ تو ہو چکا سر اور میں ہار گئی۔ جنگ لڑنے سے پہلے ہی ہار گئی۔ لیکن کیا میں آپ کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لوں۔ مگر مجھے ملے گا کیا۔ ہارے ہوئے سپاہی کو تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ جبکہ میں آپ کو فتح کرنا چاہتی ہوں۔ جہاں داد آپ کو)

دفعتاً انٹر کام بجا۔ وہ اپنے خیال سے چونک پڑی۔ جہاں داد پیغام ریسیو کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آئی ایم سوری۔ مجھے ذرا فائق صاحب نے بلایا ہے۔''

وہ مروتاً کہہ کر کمرے سے باہر نکلنے لگا، ذوباریہ کو یک بیک یاد آیا تو چونک کر بولی۔

''سنیے سر!'' جہاں داد کے قدم رک گئے۔ ذوباریہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جہاں داد نے استفہامیہ نگاہ اس پہ ڈالی پھر لفافہ کی طرف دیکھا۔

''یہ آپ کا خط ہے۔ دراصل میں یہی دینے آئی تھی۔'' جہاں داد متذبذب انداز میں لفافہ کی طرف دیکھتا رہا۔

''گھبرائیے نہیں۔ انکل بیگ کا خط ہے آئی مین۔ پروفیسر سلطان بیگ۔''

جہاں داد نے فوراً لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا پھر بڑے پرتپاک انداز میں کھولتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''بہت دیر بعد بتایا آپ نے مجھے حالانکہ آپ کو آتے ہی بتا دینا چاہیے تھا۔'' اس کی نگاہیں خط کی تحریر پہ دوڑنے لگیں اور تبسم گہرا ہوتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سنجیدہ ہو گیا اور حیرانی نے جگہ لے لی۔ ذوباریہ سہولت سے اس کے تاثرات نوٹ کر رہی تھی۔

پورا خط پڑھنے کے بعد اس نے اسی حیرت سے ذوباریہ کی طرف دیکھا۔ اس کی حیرت میں تھوڑی خوشی بھی جھلک رہی تھی۔

''میرے متعلق اتنی معلومات انہیں کیسے ملیں؟ حالانکہ ہماری ملاقات تو محض چند گھنٹوں پہ مشتمل ہے۔''

ذوباریہ سر جھکا کر پیپر ویٹ لٹو کی طرح گھمانے لگی۔

''میں انکل سے سب باتیں کرتی ہوں۔''

''بڑا فالتو وقت ہے آپ کے پاس یعنی آپ میری باتیں بھی انہیں لکھ بھیجتی ہیں۔'' جہاں داد کا انداز تمسخرانہ تھا۔ وہ پرچہ تہہ کر کے جیب میں رکھنے لگا۔ ذوباریہ کے دل کو بری طرح ٹھیس پہنچی۔ اس نے سر اٹھا کر جہاں داد کی طرف دیکھا۔

''نہیں سر! میں تو صرف اپنی بات کرتی ہوں ان سے۔ نجانے آپ کیسے شامل ہو گئے میری باتوں میں۔''

جہاں داد نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے پہلے کمرے سے باہر نکل گئی، وہ متحیر سا اسکے لفظوں پہ غور کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

مسلسل بارشیں ہونے کی وجہ سے سردی میں شدت سے اضافہ ہو گیا تھا۔ ہمہ وقت آسمان پہ منڈلاتے کالے بادل اور برستی ہوئی اوس، دن کے کسی پہر بھی گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش شروع ہو جاتی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر جل تھل ہو جاتا۔ اسے بارشوں کا موسم سخت زہر لگتا تھا۔ ایسے میں وہ گھر سے نکلنا بھی گناہ کبیرہ تصور کرتی۔ تب ہی کالج سے مسلسل چھٹیاں کرتی تھیں۔

دن رات گھر میں گزر رہے تھے۔ پاپا گھر میں ہوتے تو موجودہ سیاسی حالات پہ مناظرہ ہو جاتا یا پھر چائے کی ایک ایک پیالی پہ شطرنج کی بازی ہو جاتی۔

اکثر اوقات وہ بہت زیادہ مصروف ہو جاتے تو وہ ان سے کہیں زیادہ مصروف دکھائی دینے لگتی۔

اس وقت وہ بے حد فارغ تھی۔ اور ایسی فراغت میں جب کسی بھی چیز میں دل نہیں لگتا تو وہ ویڈیو گیم کھیلا کرتی۔

اب بھی وہ سپر ماریو گیم کھیل رہی تھی۔

کانوں میں واک مین لگا تھا، جس پہ فلم ہیر رانجھا کے گیت چل رہے تھے۔

ملازم نے آکر بتایا بڑے صاحب سے کوئی ملنے آیا ہے۔

''بھیج دو اندر۔'' اس نے لال دین کو ٹرخایا۔ تمام تر توجہ گیم پہ تھی۔

تھوڑی دیر میں لال دین اپنی ہمراہی میں جہاں داد کو اندر لے آیا۔ وہ بہت سارے کشن اور تکیوں کے درمیان دو تین کمبل اپنے اوپر دائیں اور بائیں ڈالے بچوں کی طرح انہماک سے گیم کھیل رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی جہاں داد پہ نگاہ پڑی ساری توجہ ہوا ہوگئی۔

''سس، سر آپ!'' پہلے گیم کا لیور ہاتھ سے چھٹا۔ پھر واک مین کا تار کانوں میں سے نکالا۔ پھر خود کو کمبلوں سے آزاد کیا۔ اتنے میں جہاں داد ڈرائینگ روم میں داخل ہوگیا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے مہذب اور شائستہ انداز میں سلام کیا۔

''السلام علیکم سر۔'' گڑبڑا کر ذوباریہ نے بھی سلام کے جواب میں سلام کر دیا جس پہ جہاں داد نے دانستہ توجہ نہیں دی۔

''فائق صاحب ہیں گھر پہ؟ انہوں نے بلایا تھا۔''

''بب، بے، بیٹھیے سر۔'' وہ جلدی سے قریب آگئی۔ اور صوفے پہ سلیقے سے کشن جمانے لگی، پھر اسے دوبارہ بیٹھنے کی پیش کش کرتے ہوئے بولی۔

''پاپا تو ابھی گھر آئے ہی نہیں۔''

''جہاں داد سہولت سے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ پھر بیٹھ کر اپنی گھڑی دیکھی۔

''حالانکہ انہوں نے یہی ٹائم دیا تھا۔'' جہاں داد پریشان ہوگیا۔

''آپ بیٹھیے پاپا آتے ہی ہوں گے۔'' ذوباریہ بوکھلا کر بولی اور تیسری بار بیٹھنے کی پیش کش کی، حالانکہ وہ بیٹھ چکا تھا۔ جہاں داد ہلکا سا مسکرایا۔

''ٹیک اٹ ایزی، مس ذوباریہ! میں آل ریڈی بیٹھ چکا ہوں۔'' ذوباریہ نروس ہوکر ملازم کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''لال دین یہ کمبل وغیرہ یہاں سے اٹھاؤ۔ اور یہ سب کچھ درست کرو۔'' اس نے بڑھ کر ٹی وی آف کرتے ہوئے ملازم کو حکم دیا۔

اس دوران جہاں داد نے پورے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے ڈالا جو امپورٹڈ اور بے جا قیمتی اشیاء سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ ملازم حکم بجالیا۔

وہ ٹی وی آف کر کے اس کی طرف آگئی۔ بلیو جینز پہ بلیک ہائی نیک آسمانی اور بلیو چیک والی کھلی سی شرٹ پہ میرون سوئیٹر، سوئیٹر پہ بلیو جینز کی بھاری بھرکم جیکٹ پہنے وہ تقریباً بوکھلائی ہوئی سامنے والے صوفے پہ ٹک گئی۔

''بس پاپا آتے ہی ہوں گے۔'' اس نے جیکٹ کا بازو سمیٹتے ہوئے مسکرا کر جہاں داد کو تسلی دی۔

جہاں داد نے دلچسپی سے اس کے حلیے کو نوٹ کیا۔ کھسیاتے ہوئے ذوباریہ نے بکھری لٹوں کو کانوں کے پیچھے کرلیا۔ اس وقت اسے اپنے الٹے سیدھے حلیے پہ کافی ندامت محسوس ہوئی۔

جبکہ وہ بھی اسی موسم میں رہ رہا تھا۔ صرف براؤن کارڈیگن پہن رکھا تھا۔

''آپ تین چار روز سے کالج نہیں آ رہیں۔ آر یو آل رائٹ؟''

''وہ......یس......'' ذوباریہ جلدی سے بولی۔ ''وہ دراصل موسم بہت خراب ہو رہا ہے، اور مجھے سردی بہت زیادہ لگتی ہے۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔'' جہاں داد خفیف سا مسکرا دیا ذوباریہ شرمندہ ہو گئی۔

(کاش مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آنا ہے تو میں آج سب سے اچھا جوڑا پہنتی)

''تو کیا جب تک سردیاں رہیں گی، آپ کالج نہیں آئیں گی؟''

''نہیں، نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔'' ذوباریہ سنبھل کر بولی۔ ''حقیقتاً مجھے بارش کا موسم بہت برا لگتا ہے۔ برسات کے موسم کو اتنا انجوائے کیسے کر لیتے ہیں۔'' ایسے ہی لفظ بالکل ایسے ہی لفظ ایک دن زہرہ نے بھی کہے تھے۔

''اتنی تیز بارش ہو رہی ہے اور تو ہمیشہ کی طرح اس کوٹھڑی میں چھپی بیٹھی ہے۔ باہر نکل کر دیکھ، ہرے بھرے درخت، لہلہاتے کھیت اور صاف ستھری گلیاں کس طرح پانی سے دھل گئی ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہر چیز نئی ہو۔ ذرا دیکھ تو سہی، سارے مناظر کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں۔''

''مجھے یہیں رہنے دے جہاں داد۔ مجھے اس موسم سے سخت وحشت ہوتی ہے۔'' وہ اپنے ہی بازوؤں کے گھیرے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''کیوں لگتا ہے بھرجائی! تجھے بارش کا موسم برا؟'' وہ دوزانو اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''دلدار کو یہ موسم بہت پسند تھا، تب ہی تو، جب وہ اس دنیا سے گیا تو ایسی طوفانی بارشیں ہو رہی تھیں۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرے ساتھ ساتھ زمین و آسمان بھی رو رہے ہیں۔ میں نے تو آنسو پونچھ لیے جہاں داد! پھر یہ آسمان بار بار کیوں روتا ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا اس کا رونا۔ بالکل اچھا نہیں لگتا۔''

اسے ایک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر ذوباریہ اندر ہی اندر پگھلنے لگی۔

''میں انکل ریاض کے ہاں فون کرتی ہوں۔ ہو سکتا ہے پاپا وہاں چلے گئے ہوں۔'' اس کی آواز پہ جہاں داد خیالات کی یورش سے باہر نکل آیا۔ دھڑکتے دل کے ہمراہ ذوباریہ اس کے سامنے سے اٹھ گئی جہاں داد سنبھل کر بیٹھ گیا۔

وہ نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ادھر سے ورشہ نے فون اٹھایا۔

''میں ذیبی بول رہی ہوں۔ بس جلدی سے گھر آ جاؤ۔''

''ہاں کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

''اوہ۔ بابا۔ کبھی موقع کی نزاکت بھی سمجھ لیا کرو۔ سر آئے ہیں۔ ہاں، ابھی۔ ابھی۔ اسی لیے تمہیں بلا رہی ہوں۔ پاپا بھی آتے ہی ہوں گے دیکھو دیر نہیں ہونی چاہیے۔ جلدی سے آ جاؤ بس میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔''

''آ جاؤ پھر پوچھوں گی تمہیں؟''

''او کے خدا حافظ۔'' وہ فون بند کر کے ڈرائنگ روم میں آئی تو جہاں داد سگریٹ کے دھوئیں میں مدغم اس کا منتظر بیٹھا تھا۔ سگریٹ کی خوشبو سارے کمرے میں پھیل رہی تھی۔ جو اس وقت ناگوار لگی تھی۔

''میں نے فون کر دیا ہے۔ پاپا آتے ہی ہوں گے۔'' وہ ہاتھ سے دھوئیں کو ادھر ادھر کرتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

جہاں داد نے اس کی ناگواری کو محسوس کیا، اور معذرت طلب لہجے میں بولا۔

''آئی ایم سوری۔ یہ میری مجبوری ہے۔'' ہلکا سا مسکرایا ''اور پھر انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے مجھے کچھ تو کرنا چاہیے۔''

''As you wish sir (جیسا آپ چاہیں)'' دوبارہ یہ خود ہی شرمندہ ہو گئی۔

''دراصل پاپا میری موجودگی میں اسموکنگ نہیں کرتے۔ اس لیے مجھے بھی ایسی ویسی خوشبو کی عادت نہیں ہے۔''

جہاں داد ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

''بٹ وائے؟''

''ایسے ہی سر۔'' وہ کندھے اچکا کر ہنس پڑی۔

''زیادہ چین اسموکر نہیں ہیں۔'' جہاں داد نے سکون سے کہا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' ایک بار پھر وہ سر جھکا کر ہنس پڑی۔

''پاپا کہتے ہیں...... دراصل جب کسی بھی قسم کا نشہ مرد کی کمزوری بن جائے تو اسے چاہیے، خواتین کے سامنے اس کے استعمال سے گریز کرے۔ کیونکہ اس طرح مرد، عورت کے سامنے مجبور نظر آتا ہے اور یہ عورت کی نہیں خود مرد کی تذلیل ہے۔ آفٹر آل، مرد عورت کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اسی لیے اسے ہر قسم کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے آزاد نظر آنا چاہیے۔''

ایک لمحے کے لیے جہاں داد اس کی بات سے متاثر نظر آیا، پھر مسکرا کر بولا۔

''یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرد کمزوریاں پالے بھی ضرور اور انہیں چھپائے بھی ضرور۔''

''پاپا کہتے ہیں جو مرد کمزوری چھپانا جانتے ہیں۔ وہ کمزوریوں پہ غالب ہوتے ہیں۔ لیکن جو نہیں چھپا سکتے، کمزوریاں ان پہ غالب ہوتی ہیں۔'' جہاں داد کو اس کی بات عجیب سی لگی۔ اور اسے اپنی شخصیت کا دفاع کرنا پڑا۔

''سگریٹ پینا محض میری عادت ہے۔ میں اسے اپنی کمزوری یا نشہ نہیں سمجھتا اور نشہ تو وہ ہوتا ہے جو انسان کو خود سے بیگانہ کر دے۔ No۔ Never۔''

''نہیں؟ سر جو چیز بار بار اپنی طرف بلائے درحقیقت وہی نشہ ہوتی ہے اس میں ضروری نہیں انسان خود سے بیگانہ ہو۔''

اس نے فوراً تردید کی، جہاں داد لاجواب ہو کر مسکرا دیا۔

''یہ بات بھی آپ کے پاپا نے کہی ہے؟''

''پاپا کہتے ہیں۔ جب آپ کی اہم بات سن کر آپ سے کوئی یہ پوچھے یہ بات کس نے کہی تو آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے، وہ شخص آپ کو بے وقوف سمجھتا ہے، اس لیے وہ آپ کی اہم بات پہ بھی توجہ نہیں دے گا۔''

اس کی بات پہ جہاں داد بے ساختہ ہنس پڑا۔ اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولا۔

''آپ کے پاپا جو کچھ بھی کہتے ہیں، بہت ہی مناسب اور بہت ہی اچھا کہتے ہیں۔''

(یعنی آپ مجھے بالکل بے وقوف سمجھتے ہیں)

ذوباریہ تاسف سے مسکرا کر رہ گئی۔

اس نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا، اور پھر دو تین کش لینے کے بعد پر سوچ انداز میں بولا۔

''مس ذوباریہ!''

ذوباریہ چونک گئی۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے؟''

ذوباریہ کا رواں رواں دھڑک اٹھا، نجانے وہ کیا پوچھنے والا تھا۔ پہلی بار تو وہ اس سے یوں مخاطب ہوا تھا۔

''آپ کے فادر جتنا پیارا کہتے ہیں...... خود''

''وہ اگلے لفظ کہتے ہوئے جھجک گیا۔

''درحقیقت اتنے پیارے دکھائی نہیں دیتے۔'' ذوباریہ نے اس کی ادھوری بات مکمل کی، دوسرے لفظوں میں اس کی مشکل آسان کی۔

جہاں داد نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔'' وہ دوسرے ہی لمحے سنبھل گیا۔

''ہی از اے گڈ مین۔ وہ ایک اچھے آدمی ہیں دراصل ہر انسان کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ میں جب پہلی بار ان سے ملا تو مجھے کچھ بھی عجیب نہیں لگا، عجیب لگا تو یہ کہ آپ ان کی بیٹی ہیں۔''

اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ذوباریہ استہزائیہ مسکرا دی۔

(یہ کیوں نہیں کہتے سر، جب وہ آپ کو مجھ سے بہت مختلف نظر آئے عام سے شخص کی خوبصورت اولاد کو دیکھ کر یہ خیال ضرور آتا ہے کہ وہ کس پہ گئی ہے۔)

''آپ نے میری بات کا برا تو نہیں مانا؟''

''بالکل نہیں سر! اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ کیا فائق احمد میرے سگے باپ ہیں۔ مجھے لوگوں کی عقل پہ ہنسی آتی ہے، باپ تو باپ ہوتا ہے۔ نہ سوتیلا نہ بناوٹی۔'' وہ کندھے اچکا کر ہنس پڑی۔

''اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے پاپا میرے سگے پاپا ہیں۔''
جہاں داد اس سے اگلا سوال کرنے کی جرات نہ کر سکا، ہاں مگر اسے تجسس ضرور تھا کہ اس کی ماں کے متعلق جانے۔اس سے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی بیٹھا۔

''کبھی آپ کی مدر کو نہیں دیکھا؟''

''ماں کے ذکر پہ ذوباریہ کے دل میں تیر سا پیوست ہو کر رہ گیا۔

(بلاشک وشبہ وہ حسین ترین عورت تھیں۔لیکن عورت کا حسن صرف اس کی وفا ہوتی ہے۔بے وفا عورت دنیا کی سب سے زیادہ بدصورت عورت ہے)

''ماما ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔'' وہ بہت دیر کے بعد آہستگی سے بولی۔

''اوہ۔آئی ایم سوری۔'' جہاں داد نے اس طرح افسوس کیا جیسے مرے ہوئے شخص پہ کرتے ہیں۔

ذوباریہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔پھر چپ چاپ تعزیت قبول کر لی۔دفعتاً گاڑی کی آواز آئی۔ذوباریہ اٹھ کھڑی ہوئی۔''لگتا ہے پاپا آگئے ہیں۔''

فائق احمد، گھر میں داخل ہوئے تو جہاں داد کو دیکھ کر شرمندہ ہو گئے Very sorry to keep your waiting (مجھے افسوس ہے کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا)۔''

انہوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ان کی شرمندگی پہ جہاں داد خود شرمندہ ہو گیا۔

''کوئی بات نہیں سر۔''

''السلام علیکم سر!'' پیچھے سے ورشہ کی آواز آئی۔

''والسلام!'' وہ اچانک ورشہ کو دیکھ کر حیران ہوا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''بہت خوربصورت، آئی مین۔بالکل ٹھیک آپ کیسے ہیں؟''

''کم از کم آپ جیسا نہیں۔'' اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''یعنی خوبصورت نہیں ہوں۔''

اس کی بے ساختگی پہ ورشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔فائق احمد آہستگی سے مسکرا دیے۔

''بیٹھیے پلیز۔کتنی دیر ہوئی آپ کو آئے ہوئے۔

''بس ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔''

''اور اس عرصے میں ہماری بیٹی نے آپ کو اخلاقاً چائے یا کافی بھی پیش نہیں کی۔'' انہوں نے خالی میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ذوباریہ پشیمان ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''اوہ۔ آئی ایم سوری، میں بھول گئی۔''

وہ خیال ہی خیال میں اپنے سر پہ جوتیاں مارتے ہوئے کچن کی طرف جانے لگی۔

درمیان میں جہاں داد بول پڑے۔ ''نہیں، فائق صاحب پلیز۔ کسی بھی قسم کا تکلف نہیں کیجیے گا۔ اول تو میں چائے کافی پیتا نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ضروری کام سے دوسری جگہ بھی جانا ہے۔ آپ اس کام کو نمٹا لیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ پہلی بار آئے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں سر!'' آخری بار تو نہیں ہے۔ پھر سہی۔''

''اچھا بھئی، ذوباریہ بیٹا آپ ادھر آ جائیں۔'' فائق احمد نے آنکھوں پہ عینک لگاتے ہوئے کہا۔

ذوباریہ باپ کے قریب آ گئی۔ ورشہ تواضع کے اہتمام کے لیے کچن میں چلی گئی۔ پھر انہوں نے بیٹی کو قریب بٹھا کر اپنے سامنے فائل کھول لی اور اسے پڑھ کر بتانے لگے۔

ذوباریہ کے کچھ پلے نہیں پڑا۔ بس یہی سمجھ سکی کہ پاپا اسے کاروبار میں اپنا برابر کا شریک بنانا چاہتے ہیں۔ برابر کے پارٹنر کی کیا ویلیو ہوتی ہے۔ فائدہ نقصان کیا ہوتا ہے۔ وہ سب اسے آہستہ آہستہ سمجھا رہے تھے۔

''لیکن پاپا اس بات کی ضرورت کیا ہے آپ نے سنبھال تو رکھا ہے سب کچھ۔'' وہ درمیان میں بول پڑی۔

''کل کو میری آنکھ بند ہو گئی تو۔ تب بھی تو آپ کو سب ذمہ داریاں اٹھانا ہوں گی۔ کیونکہ نہ آج ہی سے آپ میرے ساتھ برابر کی سطح پہ کام کرتے ہوئے سب کچھ سیکھ لیں۔''

''آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''یہ جذباتی باتیں ہیں۔ حقائق اپنی جگہ اٹل ہوتے ہیں۔''

''مگر پاپا! مجھے کیا معلوم ان جھنجھٹوں کا ماسوائے چیک کاٹنے کے مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ فائق احمد اس کی بات پہ مسکرا دیئے۔

''اکاؤنٹ میں پیسے ہوں گے میری جان تو چیک کاٹ سکو گی، اور اکاؤنٹ سخت محنت اور لگن سے کھلتے ہیں۔''

''لیکن پاپا!''

''نو۔ نو۔ نو۔'' فائق احمد نے ہری جھنڈی دکھائی۔

''پلیز سر۔ آپ ہی سمجھائیں ناں پاپا کو۔ میں تو سب کچھ برباد کر دوں گی۔''

"It is your domestic and personal matter what I can do for"

(یہ آپ کا گھریلو ذاتی معاملہ ہے۔ میں کیا کرسکتا ہوں) جہاں داد نے لاچاری ظاہر کردی۔ ذوباریہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

''اب آپ یہ فائل لے کر سامنے بیٹھ جائیں۔'' فائق احمد مسکرا کر بولے۔''کسی اچھے اور سمجھ دار پارٹنر کی طرح، تمام معاملات میں فی الحال جہاں داد آپ کی مدد کریں گے۔ پھر آہستہ آہستہ آپ کو خود توجہ دینا ہوگی۔ اوکے، چلیں۔ اب چھوٹی سی ٹیبل ٹاک ہوجائے۔''

طوعاً کرہاً وہ ان کے پاس سے اٹھ گئی اور جہاں داد کے پہلو میں آبیٹھی۔ فائق احمد نے ایک اور ویسی ہی فائل اپنے سامنے کھول لی اور اس کی ریڈنگ باآواز بلند کرنے لگی۔

ذوباریہ ہونقوں کی طرح باپ کی شکل دیکھنے لگی۔ جہاں داد مسکرادیا۔

''آپ بھی اپنی فائل کھول لیجیے تاکہ جو کچھ فائق صاحب بتارہے ہیں۔ آپ کو اپنی فائل سے ٹیلی کرنے میں آسانی ہوجائے اور سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔''

''اچھا سر!'' وہ اس کے توجہ دلانے پہ حواس باختہ ہوگئی۔ دوبارہ غور کیا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ فائل پہ نشاندہی کرنے کی غرض سے تقریباً اس کی طرف جھک گیا اور وہ بالکل اس کی اوٹ میں آگئی۔

اس کے وجود کی خوشبو اور اس کی قربت کا احساس، ذوباریہ کے اندر جنموں کی پیاس بجھنے لگی، اسے لگا جیسے پیاسے صحرا پہ مہربان بادل جھک آیا ہو۔

''اس پوائنٹ پر توجہ دیں۔''

وہ پن کی مدد سے اسے آہستہ آہستہ سمجھا رہا تھا۔ لیکن اس کی توجہ پن پہ نہیں اس کے بھاری بھرکم مردانہ ہاتھ پہ تھی۔

جن کی انگلیوں اور ہتھیلی کی پشت پہ جابجا رواں تھا، ہاتھوں کی رنگت قدرے سرخی مائل تھی۔

چوڑے چوڑے صاف ستھرے گلابی ناخن۔

چوڑی سی ہتھیلی پہ لکیروں کا جال۔

یہ ہاتھ ہی صرف تحفظ کا احساس تھے۔ مسلسل اسے نروس محسوس کرتے ہوئے۔ جہاں داد اس کے دفاع میں بول ہی پڑا۔

''یہ چیٹنگ ہے سر! آپ اس پوائنٹ کو دوبارہ دہرائیں۔''

پھر اس نے فائل اٹھا کر اپنے گھٹنوں پہ رکھ لی اور ذوباریہ کو اشارہ کیا کہ وہ اسے نوٹ کرے۔

پھر اسے سمجھانے والے انداز میں اس کی طرف سے بات چیت کرنے لگا ذوباریہ دلچسپی سے اسے اور کبھی اپنے پاپا کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جیسے باپ بیٹے کے درمیان برابری کی سطح پہ بات چیت ہوتی ہے۔ اس کے دل میں یک لخت انجانی سی خواہش نے جنم لیا اور پھر اس نے بڑی سہولت سے اس رشتے میں خود کو مقید کرلیا اور دوبارہ صورت حال نوٹ کی۔

سسر اور داماد کے درمیان ہونے والی گفتگو اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھی۔

اسی دوران ورشہ، ٹرالی لے آئی، اس نے فرداً فرداً تمام اشیاء میز پر رکھیں، اس قدر اہتمام پہ جہاں داد چکرا گیا۔ گاجر کا حلوہ، فروٹ کیک، ابلے ہوئے انڈے، ڈرائی فروٹ، سموسے، آخر میں وہ دودھ کا جگ رکھتے ہوئے بولی۔

''آپ چائے کافی تو پیتے نہیں سر۔ اس لیے میں دودھ لے آئی ہوں۔ کیونکہ بنا مشروب کے تواضع کتنی ہی ہو جائے، لطف نہیں آتا۔''

اس نے دودھ کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ جہاں داد کچھ جھجک سا گیا۔ کیونکہ شہر میں دودھ کی تواضع اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''گھبرایئے نہیں سر! میں آپ سے دودھ پلائی ہرگز نہیں لوں گی۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے، صبح کلاس میں آپ میری ''جوتا چھپائی'' بھی کر سکتے ہیں۔'' اس کے مذاق پر ذوباریہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

جبکہ فائق احمد کے ہمراہ جہاں داد آہستہ سے ہنس پڑا۔

☆ ☆ ☆

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

فارینہ نے اس کے ساتھ چلتے چلتے شعر پڑھا پھر اپنا بازو مار کر اس کی کتابیں گرا دیں۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ؟'' وہ جو اپنی سوچوں میں چل رہی تھی، اس کی اس نازیبا حرکت پہ جھنجھلا گئی اور جھک کر کتابیں سمیٹنے لگی۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں

ہم کچھ عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

فارینہ بھی دوزانو اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''واٹ ڈو یو مین۔'' اس نے سر اٹھا کر فارینہ کی طرف دیکھا۔

سچی بات سے بھی ہو جاتے ہیں برہم احباب

دوستی اک بڑا نازک سا ہنر ہوتی ہے

وہ تراشیدہ بالوں کو جھٹک کر بولی۔

ذوباریہ نے آنکھیں سیکڑ کر اس کے نقوش پڑھنے کی کوشش کی۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔''

یہ بات خاص نہیں پتھروں کی بستی تھی

نہ پوچھ ٹوٹ گیا دل کا آئینہ کیسے

''تم ڈھنگ سے بات نہیں کر سکتیں؟''

ذوباریہ کو اس کے اشعار سے الجھن ہوئی۔تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

عشق نے سکھلائی ہیں یہ سب سازشیں

وگرنہ دل تو اتنا باہنر نہ تھا

ذوباریہ کتابیں سمیٹ کر کھڑی ہوگئی۔

''لگتا ہے کوئی نیا پنچھی پھنسا رہی ہو۔''اس نے نخوت سے کہا۔

فارینہ تلخی سے ہنس پڑی۔

جس راہ پہ چلنے سے ہمیں روکتے تھے احباب

اس راہ پہ چل رہے ہیں وہ آج خود ہمارے ساتھ

ذوباریہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور لمحے کی چوتھائی میں اس کا مفہوم سمجھ گئی۔

فارینہ اس کے قریب آگئی اور اپنے گلے کی زنجیر کو انگشت شہادت پہ لپیٹتے ہوئے بولی۔

دل کو کہاں قبول رواجوں کے فیصلے

دل تو محبتوں کے قبیلے کا فرد ہے۔

پھر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

''یہ تعلیمی مقابلہ نہیں ہے ذوباریہ احمد! جس میں تم ہمیشہ کی طرح ٹاپ کر جاؤ گی۔ یہ دلوں کی جنگ ہے۔ضروری نہیں اس بار بھی سہرا تمہارے ہی سر سجے۔''

اور پھر وہ تیزی سے اس کے سامنے سے گزر گئی، ذوباریہ کو اس کی ایڑی کی گونج ہتھوڑے کی مانند سنائی دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح تک موسم ٹھیک ہی تھا۔ نہ جانے اب کیا آفت آگئی۔ ذوباریہ نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے جھنجھلا کر کہا اور وائپر سے اسکرین صاف کرنے لگی۔

معاً دونوں کی نگاہ جہاں داد پہ پڑی۔ وہ سخت جھنجھلائے ہوئے انداز میں بائیک اسٹارٹ کر رہا تھا۔

ایک عجیب طرح کی الجھن اور کوفت اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ ''یہ اس برستے مینہ میں بائیک پہ گھر جائیں گے۔''ذوباریہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تم کہو تو میں چھتری لے کر ان کے پیچھے بیٹھ جاتی ہوں۔ ساتھ ساتھ اپنے دوپٹے سے ان کا پسینہ بھی پونچھتی رہوں گی۔ ہوسکتا ہے، میری

موجودگی میں انہیں پسینہ آنے لگے۔"

ورشہ نے اس کی تشویش سے لطف اٹھایا۔

"کبھی سنجیدہ نہ ہونا۔" ذوباریہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"لگتا ہے۔ان کی بائیک میں کچھ پرابلم کری ایٹ کر رہی ہے۔"

ورشہ نے گھوم کر دیکھا۔ مسلسل کوشش کے باوجود بائیک اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔

"کہو تو آفر کروں۔" ورشہ نے ذوباریہ کی طرف دیکھا۔

"تمہاری مرضی ہے۔" ذوباریہ نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے لیکن اس کے چہرے سے آمادگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"منافق!" ورشہ ہنس پڑی۔ ذوباریہ نے اس کے قریب جا کر گاڑی روک لی۔

"آیئے سر! ہم آپ کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔" ورشہ نے گاڑی سے جھانک کر کہا۔

جہاں داد تھک کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور مسکرا کر بولا۔

"شکریہ۔ میں ابھی "ڈراپ" نہیں ہونا چاہتا۔" اس کے جوابی جملے پہ ورشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"چلیے ہم آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔"

"نہیں، شکریہ، تھوڑی دیر تک یہ اسٹاٹ ہو ہی جائے گی۔"

"ہو سکتا ہے سر! اس کا موڈ آج خراب ہو اور یہ آپ کو لے جانا نہ چاہتی ہو پھر موسم بھی بہت خراب ہو رہا ہے۔"

"وفادار سواری، سوار کو حادثے سے بچانا چاہتی ہو تو یونہی چپ ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ زیادہ زبردستی نہ کریں اور آ جائیں۔"

جہاں داد اس کی دلیل پہ مسکرا دیا۔

"آپ دوسرے کو بہت جلد قائل کر لیتی ہیں۔ یہ صفت ہر شخص میں نہیں ہوتی۔ آپ لوگ گاڑی باہر نکالیں، میں بائیک محفوظ مقام پہ کھڑی کر کے آتا ہوں۔"

وہ باہر آیا تو وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

جہاں داد انہیں پچھلی سیٹوں پہ دیکھ کر حیران ہوا۔

"ہم نے سوچا سر! ہم دو خواتین آگے بیٹھیں اور آپ پیچھے کچھ معیوب سا لگتا ہے۔ اس لیے ہم نے آپ کے لیے فرنٹ سیٹ خالی کر دی اور پھر اخلاق کا تقاضا بھی یہی ہے مرد کی موجودگی میں خاتون کو گاڑی نہیں چلانی چاہیے۔"

ورشہ نے وضاحت کی، تو جہاج داد مسکرا کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔

"پرانے زمانے میں، بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے وزیر اور دربان ہمیشہ مختلف مختلف حربے استعمال کرتے تھے۔ لیکن خال ہی انہوں

نے ڈھنگ کے کام کیے۔اور ہمیشہ ایسی ہی غلطی کی یعنی اخلاق کے تقاضے نبھا کر آپ نے مجھے اپنا ڈرائیور بنالیا۔''

ورشہ ذوباریہ دونوں ہی پشیمان ہوگئیں۔

جہاں داد نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔یعنی اس بات کا مطلب یہی تھا کہ پیچھے سے کوئی آگے آجائے۔ورشہ اپنی جگہ ہی بیٹھی رہی۔

طوعاً کرہاً ذوباریہ آگے آکر بیٹھ گئی۔

جہاں داد نے گاڑی اسٹارٹ کی ساتھ ہی ورشہ بھی اسٹارٹ ہوگئی۔

''کتنا خوبصورت موسم ہورہا ہے سر! آپ کو یہ موسم کیسا لگتا ہے؟''

''بہت اچھا۔''

''مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے۔لیکن ذوباریہ کو اچھا نہیں لگتا۔''

''آپ کا اس موسم میں کیا دل چاہتا ہے؟''

(ایسے موسم میں میرا دل میرے پاس نہیں ہوتا)

''بس یہی کہ اس موسم کو انجوائے کریں۔''

''میرا بھی یہی دل چاہتا ہے۔لیکن ذوباریہ کا دل ایسا نہیں چاہتا اچھا یہ بتائیں۔آپ کو دن کی بارش اچھی لگتی ہے یا رات کی؟''

''لمحہ کوئی سا بھی ہو، بارش تمام وقت خوبصورت کردیتی ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے مگر ذوباریہ کا یہ خیال نہیں ہے۔''

''بات سنیں، آپ میرا انٹرویو لے رہی ہیں۔اپنے بارے میں بتانا چاہتی ہیں۔یا ہم دونوں سے ذوباریہ کو کمپیئر کررہی ہیں؟''

''تینوں ہی باتیں سمجھ لیجیے سر۔'' ورشہ کھسیا کر ڈھٹائی سے ہنس پڑی۔

''باتیں کرتے ہوئے سفر اچھا کٹ جاتا ہے۔کیوں ذوباریہ!''

''جی ہاں۔خیبر سے کراچی تک فاصلہ جو طے کرنا ہے۔'' ذوباریہ کے بجائے جہاں داد نے مسکرا کر جواب دیا۔

ورشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ذوباریہ کو بھی اس بات پہ ہنسی آئی۔اس نے کھڑکی کی جانب منہ کرلیا۔

''آپ نے اپنے بارے میں کبھی بتایا نہیں سر! آئی مین آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں؟ آپ کی ہسٹری کیا ہے؟''

''وہی جو ہر انسان کی ہے۔متنازعہ سی، ڈارون کی تھیوری اور تھی۔دوسرے مفکرین کی کچھ اور، بہر حال یہ تو طے ہے میں بھی باغ بہشت سے نکالا ہوا انسان ہوں۔''

''سر! آپ نے مجھے اس وقت ٹال دیا ہے۔''

بشرطیکہ آپ ٹل جائیں۔'' وہ ہنس پڑا اور پھر چیدہ چیدہ اپنے بارے میں بتانے لگا۔

''اوہ۔ اچھا۔ تو گویا آپ پیچھے سے فیوڈل ہیں۔''

''فی الحال تو میرے پیچھے آپ ہیں۔'' اس نے سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ورشہ ہنس پڑی۔

''پھر تو سر! آپ کے گاؤں کا ماحول پنجابی فلموں جیسا ہوتا ہوگا۔''

''پتا نہیں۔ میں پنجابی فلمیں نہیں دیکھتا۔''

''مگر سر! ذوباریہ کو تو پنجابی فلمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔''

جہاں داد نے بیک مرر میں دیکھا۔

دوسرے ہی لمحے ورشہ سنبھل گئی۔

''میرا مطلب ہے سر! ان فلموں کی کوئی حقیقت نہیں اور میں آپ کو بتاؤں اسے پنجابی فلم ''میلہ'' بہت ہی زیادہ پسند ہے۔''

اس کے نان اسٹاپ شروع ہونے پہ ذوباریہ اضطراری کیفیت میں ہاتھ مسل رہی تھی۔ جہاں داد کی اچانک ہی اس پہ نگاہ پڑی۔ تو ذوباریہ نے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

''اچھا!'' جہاں داد ہنس پڑا۔

''بظاہر آپ کی سہیلی کی شخصیت سے لگتا تو نہیں کہ وہ کلچر پسند ہوں۔'' اس نے پہلی بار اس کے لباس پہ چوٹ کی۔

ذوباریہ کو اس کا انداز اچھا نہیں لگا، یہ بات وہ کسی اور طریقے سے بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے یہی سوچا کہ آئندہ وہ ایسا لباس نہیں پہنے گی۔

''آج آپ کی سہیلی بول نہیں رہیں؟'' جہاں داد نے اچانک اس کی خاموشی کا احساس ہوا تو پوچھ بیٹھا۔

''بے چاری کی کئی روز سے سٹی گم ہے۔'' ورشہ نے مونگ پھلی کے چھلکے باہر پھینکے۔

ذوباریہ اندر ہی اندر تلملا گئی۔

''بس سر، مجھے یہیں اتار دیں۔''

''یہاں، کہاں؟'' ذوباریہ نے مڑ کر دیکھا۔

''نانی کے ہاں جانا ہے مجھے۔'' اس نے ذوباریہ کو آنکھ ماری، اس کی بے باکی پہ ذوباریہ کا دم نکل گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ جہاں داد گاڑی ایک سائیڈ پہ کرنے میں مصروف تھا۔

ورشہ گاڑی سے باہر نکل گئی۔

''اچھا، سر! میں چلتی ہوں۔ میری سہیلی کو حفاظت سے گھر چھوڑ دیجئے گا۔''

''بڑی دلچسپ لڑکی ہے یہ۔'' جہاں داد نے گاڑی موڑ لی۔ ذوباریہ مسکرا کر رہ گئی۔

راستہ خاموشی سے طے ہونے لگا۔

ذوباریہ کا دل چاہا کہ وہ اس سے کوئی بات کرے۔ کوئی مختلف سی انوکھی سی بات۔ جو اس کی چاہت کے مطابق ہو۔ لیکن وہ چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کی لاپروائی پہ ذوباریہ من ہی من میں کٹنے لگی۔ (ایسی بھی کیا لاتعلقی سر، ایک حسین ترین لڑکی آپ کے پہلو میں بیٹھی ہو اور آپ کو احساس ہی نہ ہو)

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ معاً اس کی نگاہ فارینہ پہ پڑی۔، اس کی گاڑی تقریباً معمولی فاصلے پہ ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ جیسے ہی آنکھیں چار ہوئیں۔ فارینہ نے لمحوں کی چوتھائی میں گاڑی آگے بڑھا لی۔

اپنی فتح مندی پہ ذوباریہ کے چہرے پہ سرشاری سی عود آئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا وجود جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کا من تو پیاسا کا پیاسا تھا۔

اس نے کن انکھیوں سے جہاں داد کو دیکھا۔

وہ بڑے اطمینان سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ سلگتے ذہن کے ہمراہ اس نے بھی سامنے اسکرین پہ نظریں جما دیں۔

ذرا سے سفر کے بعد جہاں داد کا گھر آ گیا۔

اس نے گاڑی کی اسپیڈ دھیمی کر دی۔ پھر ذوباریہ کی طرف دیکھا۔

''اب کیا کریں؟''

''سر آپ جایئے۔ میں چلی جاؤں گی۔'' ذوباریہ نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔

جہاں داد نے موسم کی طرف دیکھا۔

بجلی کی گرج چمک کے ساتھ گھنگھور گھٹائیں۔

چھاجوں چھاج برستا ہوا مینہ جس کی وجہ سے سڑکیں لبالب پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

موسم کی شدت کی وجہ سے ٹریفک کی آمد و رفت برائے نام تھی۔

''چلیے آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔''

اس نے کچھ سوچ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

''سر! میں چلی جاتی۔'' ذوباریہ تکلف سے گویا ہوئی۔

''کوئی بات نہیں۔ ذرا ہی سا تو فاصلہ ہے۔''

''لیکن سر! پھر آپ واپس کیسے آئیں گے؟''

''میرا مطلب ہے اتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔ آپ کو واپس آنے میں دقت ہو گی۔''

''اگر ہم اسی بحث میں الجھے رہے، پہلے آپ، پہلے آپ تو سارا دن یونہی گزر جائے گا اور فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔''

اس نے گاڑی اس کے گھر کے سامنے روک لی۔ ذوباریہ گاڑی سے اتر گئی۔

''آیئے سر! اندر چلیے۔''

''نہیں شکریہ۔ میں چلتا ہوں، ڈرائیور کو بھیج کر گاڑی منگوا لیجیے۔'' وہ گاڑی لے کر آگے بڑھ گیا۔ ذوباریہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔

ہوا کا تیز تھپڑ اس کے وجود سے ٹکرایا۔ تو تن بدن میں کپکپی سی چھوٹ گئی۔ بارش کے قطرے کو بالوں سے جھٹکتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی پہلی بار یہ ننھی بوندیں آج اسے کسی رازدار سہیلی کی طرح پیاری لگ رہی تھیں۔

زندگی میں پہلی بار وہ نسوانی طرز پہ تیار ہوئی تھی۔ جدید تراش خراش سے سلی کالی شنیل کی قمیص شلوار، جس پہ سفید ننھے ننھے چمک دار نگ جڑے ہوئے سیاہ آسمان پہ ستاروں کی مانند لگ رہے تھے۔ ہم رنگ چائنا سلک کا بڑا سا دوپٹہ، گلے میں سفید موتیوں کی لڑی، کانوں میں تین تین انچ کے نفیس آویزے جو سفید نگوں کی ایک ایک لڑی پہ مشتمل تھے اور اس کی لمبی گردن کو مزید نمایاں کر رہے تھے۔ بالوں کا جوڑا کرنے کے باوجود اس کے تمام کٹے ہوئے بال بے حد خوبصورتی سے پیشانی اور چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔

آج اس نے زندگی کو بہ نفس نفیس مدعو کیا تھا۔

لیکن وقت کی گھڑیاں صدیوں کی رفتار سے سفر طے کر رہی تھیں اور دشمن جاں ابھی تک نہیں آیا تھا۔ پیغام دینے والی ورشہ تھی۔ لیکن وہ بھی دوسرے فون پہ سن رہی تھی۔

''سر، ذوباریہ کا کل جنم دن ہے۔ وہ آپ کو انوائیٹ کرنا چاہتی ہے۔''

''آئی ایم سوری، میں مصروف ہوں۔''

''کوئی بات نہیں سر! اپنی مصروفیت میں سے چند گھڑیاں ہمیں دے دیجیے۔ آپ کا زیادہ نقصان نہیں ہو گا۔''

''مگر، مس روشہ......''

''سر! آپ نے کہا تھا میں لوگوں کو بہت جلد قائل کر لیتی ہوں۔ اس لحاظ سے آپ کا ہر انکار بے اثر ہو گا۔''

جہاں داد ہنس پڑا۔

''پھر سر! آپ آ رہے ہیں ناں؟''

''ذوباریہ کا روم روم اس کے جواب کا منتظر و مشتاق تھا۔

''یہ فنکشن کس سطح پر سلیبریٹ کر رہے ہیں آپ لوگ؟''

''بس سر، ذوباریہ کے تمام فرینڈز ہوں گے، بمع آپ کے۔'' تھوڑی دیر وہ چپ رہا۔

''چلیے، آپ نے اگر دشمنوں کی فہرست سے نام کاٹ کر دونوں کی لسٹ میں جمع کر لیا ہے تو مجھے آنا ہی پڑے گا۔''

''تھینک یو سو مچ سر! ہم آپ کا انتظار کریں گے۔''

کس قدر طویل انتظار تھا یہ۔

روح کو کھینچ لینے والا۔ محض انتظار ہی نہیں بلکہ کشمکش کا پل صراط۔ وہ آئے گا، یا نہیں۔

اس نے آخری بار ہال کے بیرونی دروازے پہ نگاہ ڈالی اور مایوس ہو کر ہاتھوں کے حلقے پہ سر ٹکا لیا۔

جہاں داد ہال میں داخل ہوا تو اسے کوئی بھی چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ لیکن اس کے باوجود باوردی شوفر اسے اپنی ہمراہی میں مطلوبہ مقام تک لے آیا۔ میز پہ دوسری ڈیکوریشن کے علاوہ موم بتی روشن تھی۔

ایک کونے پہ وہ میز سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔

جہاں داد اس کے قریب آ گیا اور آہستہ سے ٹیبل بجائی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا، اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر رہی تھیں۔ یا کینڈل کی روشنی اس طرح پڑ رہی تھی۔ وہ چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ سمجھ نہیں سکا۔

وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔

''آیئے سر! بیٹھیے۔''

فطری سی بات تھی جہاں داد کی بے ساختہ نگاہ اس کے سراپے سے الجھی اور ذوباریہ نمک کی طرح پگھلنے لگی۔

''جنم دن مبارک ہو۔'' اس نے پھولوں کے بکے اس کی طرف بڑھا دیا۔

''تھینک یو سر!'' اس نے پھول اس طرح قبول کیے جیسے نکاح ایجاب قبول کیا ہو۔

''ابھی تک کوئی نہیں آیا؟'' وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

ذوباریہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''شاید موسم کی خرابی کی وجہ سے۔'' اس نے ٹالا جہاں داد مسکرا دیا۔

''حیرت کی بات ہے کیا آپ کے گیسٹ سیٹلائیٹ سے سفر کرتے ہوئے آ رہے ہیں جو مواصلاتی نظام میں خرابی کی وجہ سے پہنچ نہیں پائے۔''

ذوباریہ کھسیا کر ہنس پڑی۔

''ویسے آج موسم خراب نہیں، بہت اچھا ہو رہا ہے۔''

''جہاں داد نے شیشوں کے باہر برستے ہوئے کہر کو دیکھا اور موم بتی کی لو کو چٹکی سے پکڑنے لگا جو اسے ہمیشہ دلچسپ کھیل لگتا تھا۔

''ٹھنڈ اتنی ہے کہ تپش لگ ہی نہیں رہی۔'' وہ جیسے مسکراتے ہوئے خود سے مخاطب تھا۔

(احساسات سرد ہوں تو محبت کی گرمی بھی یونہی بے اثر ہوئی ہے) ذوباریہ سوچ کر رہ گئی۔

''سر! آپ آگ سے کھیل رہے ہیں؟''

''آگ سے کھیلنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ لیکن تب تک......'' اس نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''جب تک ہاتھ نہ جلیں۔''

ذوباریہ نے تحیر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سگریٹ نکال کر سلگا رہا تھا۔

(جو آگ کا شعلہ ہونٹوں پہ رکھتا ہو، اسے آگ سے کھیلنے میں واقعی مزہ آتا ہوگا)

''میڈم! آپ کا فون ہے۔'' ویٹر نے پیغام دیا۔

وہ معذرت کے ساتھ اٹھ کر چلی گئی۔ جہاں داد اکیلا سگریٹ پھونکتا رہا۔

''سر! کھانا لگواؤں؟'' ہوٹل کے مینیجر نے آ کر پوچھا۔

''مگر باقی لوگ تو ابھی آئے نہیں۔'' جہاں داد نے جواب دیا۔

''لیکن سر! یہ ٹیبل تو صرف دو افراد کیلیے بک ہے۔ اور مینو بھی دو افراد کے مطابق تیار ہوا ہے۔ میڈم تو صرف آپکا ہی انتظار کر رہی تھیں۔''

جہاں داد کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''ٹھیک ہے آپ جائیں۔ جب ضرورت ہوگی منگوالیں گے۔'' مینیجر چلا گیا۔

ذوباریہ فون سن کر آ گئی، وہ بے حد پریشان تھی۔ کیا جو کچھ ورشہ نے کہا تھا۔ کیا وہ کہہ سکے گی۔ وہ کرسی دھکیل کر بیٹھ گئی۔

''کس کا فون تھا؟'' جہاں داد نے دھواں اڑایا۔

''سر! ورشہ کا تھا، معذرت کر رہی تھی، نہ آنے کے لیے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''اور باقی لوگ۔ وہ بھی باری باری معذرت کے لیے فون کریں گے۔ ظاہر ہے۔ ٹیبل ہی دو افراد کے لیے بک ہے۔ وہ بن بلائے آئیں بھی کیسے؟''

''ذوباریہ نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

''مجھے بے وقوف بنا کر جس قسم کا لطف آپ نے لیا ہے، یہ یقیناً آپ کی فتح ہے۔ اور میں اس کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''وہ آگے بڑھ گیا۔ ذوباریہ اس کے پیچھے آئی اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ پھر بے حد روہانسی ہو کر بولی۔

''پلیز سر! میری بات سنیں، ایسا نہ کریں۔ سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ یہ میری انسلٹ ہے۔'' وہ باقاعدہ رو دینے کو تھی۔

جہاں داد نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ''اگر آپ کو عزت یا بے عزتی کا خیال ہوتا تو میرے بارے میں بھی سوچتیں۔'' وہ تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ لیا۔ ذوباریہ کا اس ماحول میں رکنا محال تھا، اس نے پرس میں سے کئی نوٹ نکال کر میز پہ رکھے اور تیزی سے باہر نکلنے لگی۔ لیکن جیسے ہی فارینہ پہ نگاہ پڑی اس کے قدم رک گئے۔ فارینہ کے ہاتھ میں کیمرہ تھا، اور بڑی پرسکون انداز میں مسکرا رہی تھی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' ذوباریہ تقریباً چکرائی۔

''کیا تم نے ہوٹل میں موجود اور افراد سے بھی یہی پوچھا تھا۔'' تیکھا سا جواب ملا۔

''آئی مین یہ کیمرہ۔'' اس نے الجھتے ہوئے کیمرے کی طرف دیکھا۔

فارینہ ہنس پڑی۔

''میری فیملی آئی ہوئی ہے میرے ایک کزن کی سالگرہ ہے۔ دراصل اس لیے ہے۔ ویسے میرے کیمرہ کا رزلٹ ہمیشہ اچھا آتا ہے۔ آئی مین، جو کچھ دیکھتا ہے وہی بناتا ہے۔ ردوبدل نہیں کرتا۔ ویسے تم آج بہت مختلف اور اچھی لگ رہی ہو۔ کہو تو ایک تصویر بنا دوں۔''

''اوہ، شیٹ اپ۔'' ذوباریہ جھنجھلا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی فارینہ دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔

(ان تصویروں سے تو ذوباریہ احمد وہ فرشتہ بے نقاب ہوگا، جو خود کو عالم دین سمجھتا ہے۔ میں معمولی لڑکی نہیں تھی، جہاں داد ملک جسے تم نے یہ کہہ دیا تھا'' مجھ جیسی لڑکیاں کپڑوں کی طرح تبدیل کی جا سکتی ہیں دلوں میں بسائی نہیں جاتیں، میں نے تو تمہیں پتھر سمجھا تھا۔ لیکن پتھر میں اتنی گنجائش کہاں سے نکل آئی۔ اس کے آدرش ذوباریہ احمد تمہارے لیے اور میرے لیے اور کیوں ہیں۔ حالانکہ اتنا فرق تو نہیں ہم میں لیکن خیر۔ تمہاری امانت ہے یہ۔ تم تک ضرور لوٹے گی۔ میرے ہاتھوں سے نہیں۔ اوروں کے ہاتھوں سے)

فارینہ نے کیمرہ سنبھال کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

وہ پیریڈ لے کر کلاس روم سے باہر نکلا تو طلبہ و طالبات کا جم غفیر اس کے اردگرد جمع ہو گیا۔

''مبارک ہو سر!'' سب ہی بے حد مسرور دکھائی دے رہے تھے۔

''بھئی کس بات کی؟'' اس نے اچنبھے کا اظہار کیا۔

''آپ کی منگنی ہو گئی سر؟''

''مگر کس سے؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''بیٹے نہیں سر! ذوباریہ احمد سے اور کس سے۔'' اسٹوڈنٹس اس سے ہنسی مذاق کرنے لگے۔

''شی از بریلینٹ گرل، اور وہ اتنی ہی وفا شعار بیوی ثابت ہوگی۔''

''واٹ نان سینس یہ کیا بکواس ہے۔'' وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''ایک فضول بات پہ آپ لوگوں نے کیسے یقین کر لیا؟''

''سر! یہ فضول بات ہے تو پھر یہ تصاویر کیسی ہیں؟'' ایک طالب علم نے تصاویر اس کی طرف بڑھائیں۔ وہ تصویریں دیکھ کر گنگ رہ گیا۔ بنانے والے نے کس قدر ڈرامائی انداز میں پوز فریز کیے تھے۔

پھول پیش کرتے ہوئے، ایک ساتھ بیٹھے ہوئے۔ ہنستے ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک تصویر میں ذوباریہ اس کا بازو پکڑے کھڑی تھی۔ حالانکہ یہ صورت حال اور تھی لیکن دکھائی کچھ اور دے رہی تھی۔ وہ دانت پہ دانت جمائے ایک ایک تصویر دیکھتا رہا۔ اور پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے

کر دیئے۔

''بکواس ہے یہ سب کچھ۔''

''حیرت کی بات ہے سر! تو پھر اس قربت کو محض وقت گزاری سمجھا جائے۔'' کسی طرار طالبہ نے مذاق اڑایا۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اگر آپ انکار کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے۔ ویسے کلنٹن اور مونیکا اسکینڈل کی طرح یہ اسٹوری بھی خاصی دلچسپ لگتی ہے۔''

لڑکی مسکرا کر بولی۔ اس کے تن بدن میں چنگاریاں سلگ گئیں۔ عالم طیش میں وہ ہجوم چیرتا ہوا نکل گیا۔ لیکن اسٹوڈنٹس کے ریمارکس اس کی سماعتوں پہ ہتھوڑے کی مانند برستے رہے۔

''کالج میں ہمیشہ ہر میڈل ذوباریہ ہی حاصل کرتی آئی ہے۔ اسی لیے ہمیں سو فیصد یقین تھا۔ یہ گیم بھی ذوباریہ ہی جیتے گی۔''

''ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ذوباریہ کے علاوہ یہ بازی کوئی اور لے جاتا، ذوباریہ از اے ونر۔ یہ بازی ذوباریہ کو ہی جیتنا تھی۔''

کلاس روم سے لے کر کالج کے گیٹ تک کا فاصلہ اس نے پرائے قدموں سے طے کیا تھا۔

وہ دندناتا ہوا اس کے گھر میں داخل ہوا۔ لال دین فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر احتراماً سیدھا ہو گیا۔

''آیئے صاحب بیٹھیے''

''تمہاری مالکن کہاں ہے۔'' اس نے ملازم کی پیش کش کو نظر انداز کیا اور طیش و اضطرار سے پوچھا۔

''صاحب اپنے بیڈروم میں۔'' ساتھ ہی اس نے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

وہ بلا دھڑک اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ذوباریہ اپنی کسی دوست سے فون پہ نہایت خوشگوار انداز میں بات چیت کر رہی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر گنگ رہ گئی۔ اور دوسرے ہی لمحے فون بند کر دیا۔ وہ شعلہ جوالہ بنا اس کے سامنے تھا۔

''میں سمجھتا تھا آپ سدھر گئی ہوں گی۔'' وہ شدید اشتعال کی کیفیت میں بولا۔

''لیکن نہیں۔ کتے کی دم سو سال تک بھی نلکی میں رکھی جائے تب بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔ یہ کھیل کھیلنا تھا تم نے میرے ساتھ۔'' اس نے چھپی ہوئی تصاویر ذوباریہ کے منہ پہ دے ماریں۔ ''رات کو مجھے اس لیے انوائیٹ کیا تھا، تاکہ صبح اچھی طرح میری ذات کو اسکینڈلائز کر سکو۔؟''

ذوباریہ کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔

فارینہ کے جملے سماعتوں میں گونجنے لگے۔ (میرے کیمرے کا رزلٹ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ آئی مین۔ جو کچھ دیکھتا ہے۔ وہی بناتا ہے ردوبدل نہیں کرتا۔)

''سر! یہ میری نہیں۔ کسی اور کی حرکت......''

''اوہ، شٹ اپ!'' دوسرے ہی لمحے جہاں داد کا ہاتھ اٹھ گیا۔ اور اس کے لفظ منہ کے منہ میں ہی رہ گئے۔

تھپڑ تھا یا قیامت۔ جہاں داد کی چین والی گھڑی کھل کر ہتھیلی تک آ گئی۔ ذوباریہ دور جا کر گری۔

''جھوٹ بولنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے مس ذوباریہ احمد!'' اس نے گھڑی بند کی۔ ''جتنا مجھے پاگل بنا سکتی تھیں، بنا چکیں، اب کسی وضاحت وصفائی کی مجھے ضرورت نہیں، میں نہیں سمجھ سکتا کہ تم اول روز سے مجھ سے کس قسم کے جذبے کی تسکین چاہتی ہو۔ اور کیا چاہتی ہو مجھ سے۔ لیکن یہ یاد رکھنا، ذوباریہ احمد کہ تمہاری کسی بھی چاہت کی تکمیل تو درکنار تم پہ نگاہ غلط ڈالنے کی بھی میرے پاس گنجائش نہیں۔ سمجھیں تم۔''

وہ بے حد تذلیل آمیز لہجے میں کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ذوباریہ اس ذلت پہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد فائق احمد اس کے کمرے میں آئے تو بیٹی کو روتا دیکھ کر بھونچکا رہ گئے، اس طرح تو وہ کبھی بھی نہیں روئی تھی۔ حتیٰ کہ اس دن بھی نہیں، جب اس کی ماں اسے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ وہ بے تابانہ بیٹی کی طرف بڑھے۔ ذوباریہ باپ کا لمس پاتے ہی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ اس کی بے تحاشا خراب ہوتی ہوئی کیفیت پہ فائق احمد کو سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کریں آیا کہ اسے چپ کرائیں یا رونے کی وجہ پوچھیں۔ یا اس کے انمول آنسوؤں کو اپنے اندر جذب کر لیں۔

''زیبی، میری جان، کچھ بتاؤ تو سہی؟ کیا ہوا ہے، کس نے رلایا ہے تمہیں؟''

انہوں نے اس کا چہرہ اوپر کیا تو متحیر رہ گئے۔

دائیں گال پہ چاروں انگلیوں کے نشان اس طرح دہک رہے تھے جیسے کسی نے انگارے رکھ دیے ہوں۔ ذوباریہ ان کے سینے سے چمٹ کر بچوں کی طرح بلک پڑی۔

''کس نے اٹھایا تم پہ ہاتھ؟ کون آیا تھا یہاں؟ کس کی اتنی جرات ہوئی۔''

''وہ بپھر گئے۔ اور گھر میں جیسے قیامت سی مچ گئی۔ دوسرے ہی لمحے گھر کے تمام ملازمین ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اور ان کا بس نہیں چلتا تھا۔ کہ ایک ایک ملازم کو ادھیڑ کر رکھ دیں۔ رب نواز کو تو باقاعدہ انہوں نے دھنک ڈالا۔

''گیٹ پہ کیا کر رہے تھے تم؟ کیوں آنے دیا تم نے اسے اندر، میری غیر موجودگی میں کیا ہر ایرا غیرا یوں منہ اٹھا کر اندر چلا آتا ہے۔''

''صاحب! وہ آپ کی کمپنی کے منیجر ہیں۔ میں تو انہیں معزز شخص......''

''اوہ شٹ اپ!'' ان کا اگلا ہی طمانچہ رب نواز کا منہ بند کر گیا۔

''دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ آئی سے گیٹ لاسٹ۔ گیٹ لاسٹ۔'' غم وغصے سے وہ ہانپ گئے۔

''بہت برا کیا جہاں داد ملک، تم نے۔ بہت ہی برا، کلیجہ نوچ ڈالا ہے میرا۔'' وہ جارحانہ انداز میں باہر نکلنا چاہتے تھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ذوباریہ کی بے ہوشی ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔

☆ ☆ ☆

تین دن بے حد اذیت اور پریشانی میں گزرے۔ ہاسپٹل کے کمرے میں تیسرے روز اس نے آنکھ کھولی تو پہلی نگاہ پاپا پہ پڑی۔ وہ اضطراب وانتظار سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ ہوش میں آئی۔ وہ اس کی طرف لپکے۔

''ذیبی! میری جان! میری زندگی۔''

اس کی آنکھوں سے اشکوں کی لڑی پھر رواں ہوگئی۔ دوسری جانب سے ورشہ اس پہ جھک گئی۔

''زیبی! تم ٹھیک تو ہونا؟'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ جو برف کی طرح سن تھا۔ وہ وجود میں نشتر ہی ایسے پرو گیا تھا۔

وہ چپ چاپ بے آواز روتی رہی۔ فائق احمد کی بے تابی قابل دید تھی۔

''زیبی! کچھ بولو۔ بیٹے، میری جان۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟'' لیکن اس کے دل و دماغ میں بس انہی جملوں کی گونج تھی۔

(تمہاری کسی بھی چاہت کی تکمیل تو درکنار۔ تم پہ نگاہ غلط ڈالنے کی بھی میرے پاس گنجائش نہیں)

وہ اندر ہی اندر کٹ رہی تھی۔

''یہ آنسو اتنے بے مایہ نہیں ہیں۔ جنہیں تم یوں ضائع کر رہی ہو۔ تمہارے ایک ایک آنسو کی قیمت وصول کروں گا میں۔ تمہارے پاپا زندہ ہیں بیٹے۔ اپنے پاپا کی طرف دیکھو۔''

انہوں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ اور پھر جیسے وہ پھٹ پڑی۔ ''پاپا۔''

''پاپا! آپ کی بیٹی مرگئی۔ آپ کی بیٹی مرگئی پاپا!''

وہ تکیہ پہ بے بسی سے سر پٹخ کر رو پڑی۔ اس کی حالت پہ فائق احمد دل گرفتہ ہوگئے۔

''ورشہ بیٹے! جاؤ جلدی سے ڈاکٹرز کو بلا کر لاؤ۔''

''نہیں پاپا نہیں۔'' اس نے باپ کے ہاتھ پہ گرفت مضبوط کرلی۔ ''مجھے زندگی نہیں چاہیے پاپا۔ وہ شخص اب مجھے جینے نہیں دے گا۔ پاپا! وہ شخص مجھے اندر ہی اندر ختم کر رہا ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں جی سکتی۔ میں اب اس کے بغیر نہیں جی سکتی۔''

''وہ جو آہستہ آہستہ اس کا سر سہلا رہے تھے دم بخود سے ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ گویا جیسے ہذیان بک رہی تھی۔

''میں مرجاؤں گی۔ میں مرجاؤں گی۔'' انہوں نے الجھ کر ورشہ کی طرف دیکھا۔

ورشہ نے نگاہیں جھکالیں۔ لیکن اس کی آنکھوں میں وہ کچھ تھا۔ جو وہ اپنی بیٹی کی آنکھوں میں کبھی بھی پڑھ نہیں پائے تھے۔

گھر آنے کے بعد بہت دن تک دونوں جانب مکمل خاموشی رہی۔ جیسے طوفان سے پہلے یا بعد کی ہوتی ہے۔

ایک طوفان آکر تھم چکا تھا۔ ایک ابھی آنا تھا۔ لیکن جو آکر تھم چکا تھا اس کے اثرات ابھی تک باقی تھے۔ اس کی بھوک پیاس، نیند، سب ہی رخصت ہوچکے تھے۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ مگر فیصلہ انہیں بھی تو کچھ کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

جہاں داد مارے باندھے انداز میں ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ جبکہ فائق احمد اپنا ارادہ اس کے سامنے ظاہر کر چکے تھے۔ لیکن اس نے اس موضوع سے قطعی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''مجھے افسوس ہے سر! غلط فہمی میں مجھ سے بڑی بھول ہوگئی۔ مجھے یہ جذباتی قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔''

''صرف تمہارے افسوس کرنے سے، میرے زخم کا مداوا نہیں ہوتا۔''

''لیکن جس طرح آپ چاہتے ہیں سر۔ میں اس طرح بھی مداوا نہیں کر سکتا۔ باقی مجھے ہر سزا قبول ہے۔''

جہاں داد! میں نے اپنے ارادے کا اظہار سزا یا مداوے کے طور پر نہیں کیا۔ یہ تو ایک غلط فہمی تھی۔ جو ہونا تھا ہو گیا، لیکن......''

''لیکن۔ کے بعد کی بات چھوڑ دیجیے سر!''

''کیوں چھوڑ دوں۔ کیسے چھوڑ دوں؟'' پھر دوسرے ہی لمحے وہ نرم لہجے میں بولے۔ ''بات سمجھنے کی کوشش کرو، جہاں داد!'' جہاں داد نے ان کی طرف دیکھا۔

''میرا خیال ہے سر! مجھے سمجھانے کے بجائے آپ اپنی بیٹی کو سمجھائیں۔ یہ محض اس کا پاگل پن ہے اور میں اس کے پاگل پن میں شامل نہیں ہو سکتا۔''

''کوئی انہونی یا ناممکن بات نہیں کی ہے اس نے، کہ تم اسے پاگل پن سے گردان رہے ہو، آج کل کے معاشرے میں، یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔''

فائق احمد کی بات پہ جہاں داد تلخی سے ہنس پڑا۔ ''دراصل یہ سب کچھ وہاں ہوتا ہے سر! جہاں رات کو ماں کی پہرہ دار آنکھ نہیں ہوتی۔ ادھورے والدین کی اولاد ذرا سی نظر اندازی کو یونہی زندگی کا روگ بنا لیتی ہے۔''

''میں کہتا ہوں آگے ایک لفظ نہیں بولنا۔'' جہاں داد کے لفظ ان کے سینے میں پیوست ہو کر گئے۔

''تم نے ایسی بات کہی کیسے، ملک! تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس کی زبان کاٹ کا پھینک دیتا۔''

وہ اشتعال سے بولے لیکن دوسرے ہی لمحے بے بس دکھائی دینے لگے۔ ''لیکن......وہ نادان تمہیں مانگ بیٹھی ہے۔''

انہوں نے جہاں داد کی طرف دیکھا۔ پھر رسان سے بولے۔ ''تم نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ وہ بہت حوصلہ والی بلند کردار، باشعور اور سمجھدار لڑکی ہے۔ اس نے زندگی میں کوئی بھی عمل ایسا نہیں کیا جس سے مجھے تکلیف ہوئی ہو۔''

جہاں داد خاموش بیٹھا رہا۔

''اس کی محبت محض دل کا بہلاوا، ضد، یا وقتی کشش مت سمجھو بیٹے۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس کا باپ ہوں۔ اس کے احساسات کو وقت کی دھول نہیں کہہ سکتا۔ آج سے پہلے میں نے اس کے یہ احساسات نہیں دیکھے۔ جو میں اب دیکھ رہا ہوں'' جہاں داد تب بھی خاموش رہا۔

انہوں نے ناامیدی سے اس کی طرف دیکھا۔

''انکار کرنے سے پہلے سوچ لینا۔ جہاں داد! صرف میری بیٹی کی خوشیوں کا سوال نہیں۔ تمہارے بخت میں بھی چار چاند لگ جائیں گے۔''

فائق احمد کا آخری جملہ بازی کا آخری پتا تھا۔ جو کہ جہاں داد کو بے حد ناگوار گزرا۔

''اگر آپ مجھے سر! اس معاملے پہ سالوں سوچنے کا بھی کہیں، تب بھی میں ایک لمحہ بھی اپنی سوچ اس محور پر لا کر ضائع نہیں کروں گا۔'' فائق احمد کے دل کو گھونسا لگا۔

انہوں نے اپنی زمانہ شناس نگاہیں اس کے چہرے پہ جما دیں۔ ''تمہارے انکار میں نفرت یا ہٹ دھرمی نہیں ہے۔ بلکہ پر اسرار سا سکون ہے۔ جیسے یہ سب کچھ تمہارے لیے بے مقصد ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تمہیں اپنا مطلوب مل گیا ہو۔ آئی مین، کسی سے کمٹ منٹ وغیرہ۔'' انہوں نے ڈرتے جھجکتے پوچھا۔

جہاں داد ہنس پڑا۔

''ایسا ہی سمجھ لیجیے سر!'' وہ مختصر بات کر کے کھڑا ہو گیا۔

''شادی، یا منگنی؟'' انہیں اپنی آواز بے حد اجنبی لگی۔ وجود کے اندر باہر ذوباریہ کی بے بسی کا شور بپا تھا۔

''نہ شادی نہ منگنی، فی الحال تو مسئلہ کچھ اور ہے۔''

اس کی آنکھوں میں الوہی سی چمک کوندی اور دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی۔

''چلتا ہوں سر! اپنی بیٹی کو آپ جس طرح بھی چاہیں سمجھا سکتے ہیں۔ آپ کی بیٹی ہے سمجھ جائے گی۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

فائق احمد، حیرت میں مبتلا بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے (زندگی میں دوسری بار بھی اسے مایوس کر دوں۔ کیسے۔ وہ میری بیٹی ہے۔) ذوباریہ کی دیوانگی ان کی روح کو گھائل کرنے لگی۔ (لیکن۔ وہ ہی نہ رہی۔ تو پھر میں کسے سمجھاؤں گا۔ آئی ایم سوری، میں اس بار اسے مایوس نہیں کر سکتا۔)

وہ سوچ کے پہلوؤں پہ نظر ثانی کرتے کرتے، خود غرضی کی انتہا کو پہنچ گئے۔

☆ ☆ ☆

آج جب وہ کالج سے گھر آیا تو اماں، بابا کو اپنے گھر میں پہلے ہی سے موجود پا کر بے حد حیران ہوا۔ باپ سے ملا۔ پھر بے تاباں ماں سے لپٹ گیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ماں باپ پہلی بار اس کے گھر میں آئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ انہیں کس طرح سر آنکھوں پہ بٹھائے۔

اماں بے حد مسرور تھیں۔ لیکن بابا کا انداز سابقہ ہی تھا۔ کس طرح آگئے۔ وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

''تیری شکل دیکھنے سے میں نے توبہ کی تھی۔ لیکن میری قسمت اتنی خراب ہے کہ پھر مجھے ہی آنا پڑا۔'' باپ کے انداز پہ وہ ذرا کا ذرا ٹھٹھکا۔

''کیا کوئی کام تھا مجھ سے؟'' وہ فرمانبردار اولاد کی طرح نثار ہونے کو تھا۔

''سبحان اللہ۔ برخوردار کی لاعلمی تو دیکھو'' اکبر ملک نے جل کر بیوی کی طرف دیکھا۔ اماں نے قطعی شوہر کے مزاج کی پروانہ کی اور بیٹے سے لاڈ سے مخاطب ہو کر بولیں۔

''لے پتر! میں تیرے لیے دیسی گھی کے تل والے لڈو بنا کر لائی ہوں۔ تجھے بہت پسند ہیں ناں۔ اور یہ چاروں مغز اور باداموں کا حلوہ ہے دماغ کی تراوٹ کے لیے۔ دیکھ تو میرا پتر محنت کر کر کے کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ خوراک کا ذرا خیال نہیں رکھتا ہوگا۔ مجھے پتا ہے۔''

اماں کا بس نہیں چلتا تھا کہ اسے اپنے کلیجے میں چھپالیں۔ ماں کے اندر محبت پہ اس کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ ان کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''تیری یہ باتیں مجھے بہت یاد آتی ہیں اماں۔''

''ماں صدقے، ماں واری پتر......ایک پل نہیں بھولی تجھے میں۔''

اماں آبدیدہ ہو گئیں۔

وہ بھی دل گرفتہ ہونے لگا، پھر دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا تو فوراً کھڑا ہو گیا۔

''میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ آپ لوگوں کو ابھی تک پانی بھی پیش نہیں کیا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے صفدر کو آواز دی۔

''نہیں، رہنے دو، ہم کھا پی کر آئے ہیں۔'' بابا نے خشک انداز میں منع کیا۔

''اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔ اب تلک تو سب کچھ ہضم ہو چکا ہوگا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

پھر صفدر کو ہدایات دینے کے لیے باہر چلا گیا۔

جب تک وہ اندر آیا۔ اکبر ملک اچھی طرح سے گھر کا جائزہ لے چکے تھے۔

''خوب عیش موج کی زندگی بسر کر رہا ہے تیرا پتر۔'' وہ اس کی آسائشوں کو دیکھتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''رب سوہنا، میرے پتر کو اور دے۔'' اماں کا سیروں خون بڑھ گیا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟'' وہ ان دونوں کے سامنے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

''یہی کہ بڑا مال پانی جمع کر لیا ہے ہمارے پتر نے۔'' اکبر ملک کا انداز تیکھا تھا۔

''بس سب آپ لوگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔'' وہ تھوڑا شرمندہ ہو کر بولا۔

''دعاؤں کے ساتھ پتر ایک وعدہ بھی لے کر آیا تھا، یاد ہے کہ بھول گیا۔''

(اس وعدے کو میں کبھی بھول سکتا ہوں۔ وہ وعدہ نہیں ہے، میری منزل ہے۔ یہ سب کچھ اسی کے لیے تو کر رہا ہوں)

''ہاں یاد ہے۔''

''آپ کے اندیشے جھٹلانے کے لیے تھوڑا سا خود کو اور مضبوط کرنا چاہتا ہوں۔ بس عنقریب آپ کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا۔''

اکبر ملک نے مونچھوں پہ ہاتھ پھیر کر قہقہہ لگایا۔

''بڑا سیانا ہو گیا ہے تیرا پتر۔ باپ کو پاگل بنا رہا ہے۔'' اکبر ملک بیوی سے مخاطب ہوئے۔ زرینہ نے خاموش نگاہیں جھکا لیں۔ جہاں داد نے الجھ کر ماں باپ کی شکل دیکھی۔

''کیا کیا کام کرتا ہے تو یہاں؟'' باپ کا انداز تفتیشی تھا۔

''گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہوں۔ اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں پارٹ ٹائم مینیجر کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔''

''یہ گھر کمپنی کی طرف سے ملا ہے یا کالج کی طرف سے؟''

''کمپنی کی طرف سے۔ کیوں کیا ہوا؟''

''کمپنی کا مالک کیسا ہے؟''

''بہت اچھا۔ آپ بتائیں تو، بات کیا ہے؟''

''اس کی کوئی بیٹی ہے؟''

''ہاں ہے، مگر آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟''

اکبر ملک نے بیوی کی طرف دیکھا۔ گویا اب آگے وہ بات کرے۔ زرینہ جھجک گئی، لیکن شوہر کی نگاہیں اتنی سخت تھیں کہ اسے مارے باندھے بات کرنا پڑی۔

''کیسی ہے وہ لڑکی؟ میرا مطلب ہے۔ کیا تجھے پسند ہے؟''

جہاں داد کے چہرے پہ عجیب گمبھیرتا پھیل گئی۔ اکبر ملک بیوی کے انداز گفتگو پہ چیخ اٹھے۔

''صاف اور سیدھی بات کر اس سے۔ کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہے۔''

پھر وہ بیٹے کی طرف دیکھ کر کرخت انداز میں بولے۔

''فائق احمد نام ہے نا تیرے مالک کا۔ وہ آیا تھا میرے پاس گاؤں میں۔'' اکبر ملک غصے سے کھڑا ہو گیا۔ جہاں داد سراپا سوال بن کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''تیرے سارے کرتوت کھول گیا ہے۔ یہ بتانے آیا تھا کہ تو اس کی بیٹی کو بہت پسند کرتا ہے۔ اور اس کی بیٹی تجھے۔ دونوں کے اندر بہت...... لاحول ولا، نجانے انگریزی میں کیا بولا تھا اس نے، ہاں انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہے۔ کہہ رہا تھا، تمہارے بیٹے نے بہت سارے عہد و پیماں کیے ہیں میری بیٹی کے ساتھ، لیکن نجانے اب اسے کیا مجبوری ہے کہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔ میری بیٹی اب اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے بیٹے کو سمجھاؤں کہ وہ اس کی بیٹی کا دل نہ توڑے اور اسے قبول کر لے۔''

''واٹ؟'' جھوٹی من گھڑت کہانی پہ جہاں داد بری طرح چکرا گیا۔

''اور آپ لوگوں نے یقین کر لیا اس کی بات کا؟'' وہ جھنجھلا اٹھا......

''ہاں پتر! کیوں نہ یقین کرتے۔ اور پھر بیٹیوں کے باپ کبھی جھوٹ نہیں بولا کرتے۔''

شہر اور گاؤں کے باپوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔''

''اماں جی!'' وہ بس پاگل ہونے کو تھا۔

''بیٹے کو صاف مکر جانے پہ اکبر ملک سخت طیش میں آ گئے۔

''ہمیں گاؤں اور شہر کا فرق مت سمجھا، اصل فرق تو تیرے ایمان میں ہے۔''

''آخر کیا ضرورت پڑی تھی اس مظلوم کو میرے سامنے آ کر گڑگڑانے کی۔ کچھ تو گل چھرے اڑائے ہیں تو نے اس کی بیٹی کے ساتھ جو وہ اپنی بیٹی کو تیرے ساتھ چپکانے پہ مجبور ہو گیا ہے''

گھر کی چھت ایک الزام کی طرح جہاں داد کے سر پہ آ پڑی تھی۔

''بابا!'' وہ چیخ پڑا۔ ''آپ نے کبھی مجھ پہ اعتماد نہیں کیا۔''

''تو نے کسی قابل چھوڑا ہوتا تو تجھ پہ اعتماد کرتا۔ بڑا مرد بن کر وعدہ کر کے آیا تھا۔ دیکھ خود ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔''

''اماں! اماں! میں پاگل ہو جاؤں گا۔ آپ لوگ میری بات کیوں نہیں سمجھتے۔''

''بند کر اپنے یہ ڈرامے۔ تیرے کردار پہ تو مجھے قطعی بھروسا نہیں۔ جو شخص گھر میں نقب لگا سکتا ہے، وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ وہاں گاؤں میں مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ یہاں شہر میں رسوائی کے جھنڈے گاڑنے چلا ہے۔ میری پوری نسل میں تجھ جیسا گندہ پیدا نہیں ہو سکتا، نام ڈبو دیا ہے میرا۔''

پے در پے تذلیل کے تھپیڑے۔ جہاں داد کا بس نہیں چلتا خود کو ختم کر لے۔

''ٹھنڈا ہو پتر، ٹھنڈا ہو۔ ہم یہاں تجھے ذلیل کرنے نہیں بلکہ تیرا گھر بسانے آئے ہیں۔ ہمیں پتا ہے جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جا۔ ہم اس لڑکی کا ہاتھ تیرے لیے مانگنے کو تیار ہیں۔''

(دراصل قصور تیرا نہیں تیری عمر کا ہے۔ اس بیل سے پرے بہت بڑی ہریالی ہے۔ جو تو نے نہیں دیکھی۔ جس وقت وہ سب دیکھ لے گا، پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اسے محبت نہیں کہتے، وقتی جذباتیت کہتے ہیں۔)

زہرہ سنگریزے برساتے ہوئے اس پہ ہنس رہی تھی۔

(جس وقت تک تیرے پاس پیسہ آئے گا۔ خرچ کرنے والی تب تلک تیرے پاس آ چکی ہوگی۔ اپنی محنت کی کمائی پہ مرد ویسے بھی شیر ہوتا ہے۔ تجھے خود پتا چل جائے گا کتنا پارسا ہے تو......)

''جیتنے والے کو کیا ملے گا؟''

''اس کی ضد۔''

''جیتنے والے کو کیا ملے گا؟''

''اس کی ضد''

اس کے دماغ کی شریانیں پھٹنے لگیں۔

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، فیصلہ آج ہی ہوگا۔ اپنی زبان کا پاس اگر تجھے ہوا تو ندامت کے ساتھ ساتھ اس فیصلے کو بھی قبول کرلے گا۔'' بابا کا انداز سخت برہم تھا۔

بے بس پنچھی کی طرح اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ جو کسی ظالم صیاد کی طرح لگ رہے تھے۔

''ہاں پتر سوچ لے۔ کوئی مجبوری نہیں ہے۔ آج شام تک ہم تیرے پاس ہیں۔ کب تک تیرا شادی کا ارادہ ہے۔ ہمیں بتلا دینا۔''

ایک لڑکی نے، صرف ایک معمولی سی لڑکی نے سب لوگوں کے سامنے جھٹلا دیا مجھے۔ اتنا حقیر اور کمتر کر دیا کہ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میری محبت مذاق بن گئی۔

میرے دعوے بے وزن ہوگئے۔

کیا حیثیت ہے میری، کیا حیثیت؟ وہ پاگلوں کی طرح اپنے کمرے میں پھر رہا تھا۔

(اپنی زبان کا پاس اگر تجھے ہوا تو ندامت کے ساتھ ساتھ اس فیصلے کو بھی قبول کرلے گا۔)

''کون سا فیصلہ؟ کیسا فیصلہ؟'' وہ ہٹ دھرمی سے اپنے فیصلے پہ قائم رہا۔

''پھر کیا سوچا ہے تو نے؟'' اکبر ملک نے رات کھانے پہ پوچھا۔

''کچھ نہیں سوچا میں۔ اور نہ ہی کچھ سوچنا ہے۔ جو میری ضد تھی وہی......''

''زہرہ کا اگر تو نے اب نام لیا تو تیری شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔'' اکبر ملک کھانا چھوڑ کر کھڑے ہوگئے۔

''کچھ تو بات تھی پتر۔ جو ہم فوری طور پر بھاگے چلے آئے۔ تو کیوں نہیں مان لیتا یہ بات۔ آخر کسی اور کی بھی تو عزت ہے۔'' ماں کے ڈھکے چھپے لفظ۔ باپ کا کھلم کھلا اظہار۔

(آخر کچھ تو گل چھرے اڑائے ہیں تو نے اس کے ساتھ جو وہ اپنی بیٹی کو تیرے ساتھ چپکانے پہ مصر ہے)

''تو بے غیرت ہوگیا ہے۔ مگر ہم بے غیرت نہیں ہیں۔ بیٹیاں ہیں ہماری بھی۔ اسی کھونٹے سے باندھ کر جاؤں گا تجھے جہاں تو نے منہ کالا کیا ہے۔''

اور پھر بس۔ جیسے جہاں داد کی سٹی گم ہوگئی۔

اماں بابا رشتہ طے کر گئے، اگلی بار آکر شادی کی تاریخ مانگ لی۔ سب ہی کچھ اس قدر جلدی جلدی ہوا کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

بڑی خیر و خوبی سے شادی طے ہو گئی۔

سر کی مانگ سے لے کر پاؤں کے انگوٹھے تک اپنا روم روم سجائے ذوباریہ اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔

اور وہ کسی بے حس پتھر کی طرح عارضی طور پر ایستادہ تھا۔ تمام کولیگ، اسٹوڈنٹس، دوست احباب۔ باری باری دونوں کو مبارک باد سے نواز رہے تھے۔

ذوباریہ اپنی خوش قسمتی پہ جتنا بھی ناز کرتی کم تھا۔

ہر شخص نے ان دونوں کی جوڑی کو جب جب سراہا تھا، ذوباریہ کا روم روم سرشاری سے بھیگ جاتا۔ لیکن جہاں داد کے چہرے کی مسکراہٹ بھی کسی کی مانگی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ کس قدر جبر اور صبر سے اپنے آپ کو اس کے قرب میں برداشت کر رہا تھا۔ یہ اس کا حوصلہ صرف وقتی تھا۔ حکومتی اعلان کی بدولت طعام کا سلسلہ پر تکلف اور مختلف تھا۔ اس کے ساتھ ہی فائق احمد کی خواہش کے مطابق دونوں طرف کا ولیمہ ایک ساتھ ہی دیا جا رہا تھا۔

رفتہ رفتہ مہمان رخصت ہونا شروع ہو گئے۔ پھر اس کے گھر والوں نے بھی اجازت مانگی۔

"آپ لوگ کچھ دن تو یہاں ٹھہرتے۔ آخر آپ کے بیٹے کا گھر ہے۔" فائق احمد نے کسی اچھے میزبان کی طرح اصرار کیا۔

"نہیں بس۔ اس کے فرض سے سبکدوش ہونے آئے تھے۔ ہو چکے۔ اب یہاں ٹھہرنا فضول ہے۔ انشاء اللہ زندگی رہی تو آتے جاتے رہیں گے۔"

اکبر ملک نے فائق احمد سے الوداعی مصافحہ کیا۔ پھر باری باری سب ایک دوسرے سے الوداعیہ انداز میں مل کر رخصت ہوئے۔ اماں نے ذوباریہ کو منہ دکھائی میں سونے کے کنگن پہنائے ڈھیروں دعائیں دیں۔ دونوں کو پیار کیا۔

وہ کسی اجنبی کی طرح سب کچھ وصول کرتا رہا۔

آخر میں زہرہ نے اسے مبارک باد دی تو اس کی ساکت جھیل میں پتھر سا آ پڑا۔ "رب سوہنا تمہیں خوشیاں دے، بہت زیادہ۔"

اس کی دعا پہ اس کے من میں آگ سی بھڑکنے لگی۔

ایسا لگا جیسے زہرہ سامنے کھڑی ہو کر وہی الفاظ دہرا رہی ہو (ایک دن تجھے خود بھی ان باتوں پہ ہنسی آئے گی۔ ہو سکتا ہے شرم بھی آ جائے۔ اس لیے تو خود کو مایوس نہ کر۔)

"لیکن میں تجھے جھٹلا کر دکھاؤں گا۔" اس نے کس قدر مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا تھا۔

اور آج وہ اسے جھوٹا ثابت کر کے جا رہی تھی۔

زہرہ کے رخصت ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی تمام تر خواہشات کو بھی اس کے ساتھ ساتھ رخصت کر دیا۔ اور اپنے آپ کو کسی

گہرے پاتال میں دفن کرلیا۔

اب ظاہری وجود کسی نرم دل شخص کا نہیں تھا بلکہ کوئی درندہ صفت شخص ذوباریہ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔

رات کے خوبصورت لمحے دھیرے دھیرے گزر رہے تھے۔اور وہ اس کے انتظار میں اپنا حسن بچھائے منتظر و بے قرار بیٹھی تھی۔ان یادگار لمحوں کو مزید امر بنانے کے لیے اس نے کچی آنکھوں میں کتنے خواب چنے تھے وہ اپنی وفاؤں کا اسے کس طرح یقین دلائے گی، اپنی محبت کے سارے جام اس پہ خالی کردے گی تمام عمر اس کی بن کر رہے گی۔

کبھی کسی شہزادی کی طرح اس کے دل پہ راج کرے گی۔

کبھی اسے اپنا آقا بنا کر بے مول لونڈی کی طرح اس کی ہر بات پہ لبیک کہا کرے گی۔اور کبھی کسی لاڈلی بیوی کی طرح اس سے ڈھیروں نخرے اٹھوائے گی۔

کتنے خواب تھے اس کی آنکھوں میں، کہ ان سے اس کے پپوٹے بھی بوجھل ہونے لگے تھے۔دل کے ارمان تھے کہ نکلنے کے لیے بے قرار تھے۔کتنی باتیں تھیں۔جو اس سے کہنی تھیں، اس سے کرنی تھیں۔کئی رازوں کو اس پہ منکشف کرنا تھا۔اسے اپنا لیا تھا اب اس کی ہو کر دکھانا تھا۔

خدا نے اسے اس کا محض ساتھ ہی نہیں بخشا تھا۔گویا ہفت اقلیم کی دولت اس کے سپرد کردی تھی۔وہ جتنا بھی فخر کرتی، جتنا بھی شکر کرتی تھوڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

معاً آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا۔

ذوباریہ نے اپنے دل کے تمام دروازے اس کے لیے کھول دیئے۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر پلٹ کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

پھر ایک ایک قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔

ذوباریہ کے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی۔ کمرے کے دروازے سے لے کر۔ بیڈ تک کا فاصلہ اس نے عجیب لڑکھڑاتے قدموں سے طے کیا۔

اس کی چال کی سرزش ذوباریہ پہ واضح نہ ہو سکی۔ ظاہر ہے وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ جہاں داد کا دماغ جھٹکے لینے لگا۔ ایسا لگا جیسے پورا کمرہ گھوم رہا ہو۔ اس نے بروقت بیڈ کا سہارا تھام کر خود کو سنبھالا۔ اور پھر چند ثانیے یونہی کھڑا رہا۔

اس کے ایک ہاتھ میں گلاس تھا، اور دوسرا ہاتھ اپنے ہی شانے پہ رکھا تھا جس پہ کوٹ جھول رہا تھا۔

اس نے بدقت اپنا کوٹ بیڈ پہ پھینکا۔

پھر کچھ سہولت محسوس کرتے ہوئے اس کی پشت پہ سے تکیہ اٹھایا۔ پھر گرنے والے انداز میں تکیہ کا سہارا لے کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

وہ کچھ اس انداز میں بیٹھا تھا کہ ذوباریہ کا سجا سنورا روپ اسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

ذوباریہ ذرا کی ذرا سمٹ گئی۔

اس وقت جہاں داد کے دل میں اتنی نفرت تھی کہ کوئی احساس تو کیا جاگتا، دل چاہتا تھا کہ اس کے منہ پہ تھوک کر چلا جائے۔ گلاس ایک جانب رکھ کر اس نے سگریٹ سلگا لیا پھر بہت دیر تک لائٹر کی آنچ کو دیکھتا رہا، اور سگریٹ کے مرغولے اڑاتا رہا۔

ذوباریہ کو اس کی یہ حرکت بڑی غیر مناسب اور بے محل لگی۔ وہ اس ناگوار بو پہ احتجاج نہیں کر سکی۔ بہت دیر تک لائٹر کی آنچ سے کھیلتے رہنے کے بعد اس نے بے زاری سے لائٹر دور پھینک دیا۔ پھر اس کی طرف دیکھا۔

میرون اور آف وہائٹ بھاری کامدار لہنگا سوٹ اور بھاری بھرکم زیورات پہنے بے شک وہ اس کے لیے ہی سجی تھی۔ لیکن اسے اس کے سنگھار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بڑے ناقدانہ انداز میں جہاں داد نے اسکا گھونگٹ پلٹ دیا۔ اور سلگتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ذوباریہ اپنے حسن پہ قصیدہ گوئی کی منتظر تھی لیکن سننے کو اسے کچھ نہیں ملا۔

دوسرے ہی لمحے اس کی نگاہیں ذوباریہ کے ہاتھوں پہ ٹھہر گئیں۔

ایک دن اس نے یہی ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا تھا۔ اسے ذلیل کرنے کے لیے۔ اس کے تن بدن میں آگ لگنے لگی۔ پھر اس نے ذوباریہ کا ہاتھ پکڑ کر لودیتی اس کی ہتھیلی اپنے سامنے پھیلا لی۔

''آج نہیں...... مانگو گی...... حالانکہ...... آج تو مانگنے کا...... دن ہے۔'' وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں گویا ہوا۔

حنائی ہتھیلی۔ خوبصورت پھول پتیوں کے درمیان دونوں کے نام لکھے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے، دوسرے ہی پل اس نے جلتا

ہوا سگریٹ اس کی ہتھیلی پہ رگڑ دیا۔

ذوباریہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی، ساتھ ہی اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔اور جلن سے تڑپ اٹھی۔

''زبردستی......نام......لکھ......لینے سے......دلوں......میں......جگہ......نہیں......بن جاتی۔''

اس نے نفرت زدہ مگر ٹوٹے ٹوٹے سے انداز میں پھر کہا۔ذوباریہ نے بھیگی پلکیں ذرا کی ذرا اٹھائیں۔اور گنگ رہ گئی۔اس کا وجود پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔اور سانسوں کی رفتار معمول سے زیادہ تھی۔ادھ کھلی شرٹ اور کھلی ہوئی ٹائی جو بے ترتیب اس کے دائیں بائیں جھول رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کس قسم کا مشروب تھا، ذوباریہ کو بس ایک لمحہ ہی لگا سمجھنے میں۔

''ایک دن......تم نے......تم نے......کہا تھا۔ذوباریہ......احمد......''

زبان کی لرزش اور سانسوں کی رفتار، ذوباریہ کو حواس معطل کرنے لگے۔

''کہ......میں......کہ میں......ایک وقت میں......ایک ہی......ایک ہی......نشہ کرسکتا ہوں۔آج......میں تمہیں......بتاؤں گا......کہ میں......کہ میں......ایک وقت میں......کتنے......کتنے نشے......کرسکتا ہوں۔''

''ایک نشہ تو یہ......''اس نے سگریٹ پھینک دیا۔

''اور......ایک......ایک......یہ......''اس نے بچا ہوا مشروب ذوباریہ کے منہ پہ پھینکا۔اور ذوباریہ ہوش میں آگئی۔یہ......تمہارے حسن......کو......خراج......دینے......کے......کے لیے......میری......ہررات کے لیے......مخصوص......مخصوص ہوگا۔''

ذوباریہ کا دماغ چکرا گیا۔اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔اس نے سراسیمگی سے جہاں داد کی طرف دیکھا۔اور پیچھے کی طرف ہٹنے کی کوشش کی۔

''آں......ہاں......ابھی......ابھی......نہیں۔''اس نے اسے کلائی سے پکڑ کر واپس اپنی طرف کھینچا''بہت۔ساری، بہت ساری، باتیں کرنی ہیں۔تم سے۔''

ذوباریہ تقریباً اس کی طرف جھول گئی۔ساتھ ہی اس کے آویزے اس کی چوڑیاں بج اٹھیں۔فضا میں مدھری گنگناہٹ پھیل گئی۔اس نے کسی لٹیرے کے سے انداز میں اس کے آویزے نوچ کھسوٹ کر دور پھینک دیئے۔

ذوباریہ کی وحشت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''کب کوئی۔نشہ۔مرد کی۔کمزوری، کمزوری بن جائے۔تو اسے عورت۔عورت کے سامنے۔یہی بتایا تھا ناں، تمہارے باپ نے تمہیں؟''وہ اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پوچھ رہا تھا۔

''ظاہر ہے۔باپ بیٹی کا رشتہ ایسا ہوتا ہے۔وہ تمہیں۔کھل کر بتاتے بھی۔تو کیا لیکن......لیکن میں، تمہیں آج بتاؤں گا۔مرد کو کیوں گریز کرنا چاہیے۔اس لیے کہ نشہ میں مرد مدہوش ہو جاتا ہے۔اور مدہوش مرد عورت کی عزت کرنا نہیں جانتا۔اور یہی۔یہی ذوباریہ احمد، تمہارا، اور میرا

رشتہ ہوگا۔‘‘

ذوباریہ نے تحیر سے اس کی طرف دیکھا، اور دوسرے ہی پل کرب سے اپنا چہرہ موڑ کر اسی کے سینے میں چھپا لیا۔ وہ نفرت کا احساس اس کے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔

’’تم۔ اپنی قربت میں۔ مجھے کبھی ہوش میں نہیں پاؤ گی۔ کیونکہ میں یہاں تمہیں۔ اپنے تقاضے پورے کرنے کے لیے نہیں لایا۔ ہاں۔ تمہیں۔ تمہارے ارمان۔ ضرور پورے کروں گا۔‘‘

خوف، شرم سے مغلوب ہو کر ذوباریہ نے آنکھیں اور مٹھیاں بھینچ لیں۔ ساتھ ہی بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

اس قرب میں کیا تھا۔ سلسلہ در سلسلہ تکلیف اور تذلیل۔ نہ اس کی آنکھوں میں پہچان تھی۔

نہ اس کے لمس میں اپنائیت۔ وہ تقریباً رو پڑی، اور مزاحمت کرنے لگی۔

’’بہت پسند ہوں، تمہیں۔ پھر یہ ناگواری آج کیسی؟‘‘

اپنی بے بسی۔ بے وقعتی پہ ذوباریہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

’’پلیز آپ ہوش میں نہیں ہیں۔ چھوڑ دیجیے مجھے۔‘‘ وہ اس کی درندگی سے پناہ مانگ رہی تھی۔

’’اتنا ہوش تو ہے مجھے۔ کہ...... تمہاری...... آنکھوں...... میں لکھی...... چاہت...... کا...... جواب لوٹا سکوں۔‘‘ ذوباریہ اس کی طرز گفتگو پہ کٹ کر رہ گئی۔

آخر کب تک......

کب تک، وہ مزاحمت کر سکتی۔

بالآخر اس کے جنون کی بھینٹ چڑھ گئی اور اس کی وحشت کے آگے بے بس ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

دور سے فجر کی اذانوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اور وہ گھٹنوں میں سر چھپائے سسک سسک کر رو رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر جہاں داد کی طرف دیکھا۔ جو بے حد لاتعلق اور بے خبر پڑا سو رہا تھا۔

وہ نامراد شے اس کے قریب پڑی تھی۔

نفرت کے اظہار کے بعد وہ کس قدر پرسکون نیند لے رہا تھا۔

اور وہ، محبت پا کر بھی، تہی دامن۔ اور تہی دست ہی تھی۔

اس نے دوبارہ سر اپنے گھٹنوں پہ پٹخ دیا۔

یہ نہیں چاہا تھا میں نے۔

ایسا نہیں چاہا تھا۔

ایک مکمل مرد کی خواہش میرے لیے محض اپنی ذات کی تسکین نہیں تھی۔

بلکہ...... بلکہ اس لیے عورت کئی لحاظ سے محفوظ ہو جاتی ہے۔کوئی احساس کمتری اسے بھٹکنے نہیں دیتا۔

خوبصورت مرد کی تمنا میرے دل میں ہمیشہ اس لیے اول رہی تھی کہ عورت آخری دم تک اس سے وفا کرتی ہے۔

اس سے وفا کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔

اس سے وفا نبھانا بھی اچھا لگتا ہے۔

وہ پھر زمانے کے کسی دوسرے حسن کو نہیں دیکھتی، بار بار یہ نہیں سوچتی کہ اس کی قسمت میں ایسا کیوں لکھا گیا۔ کیونکہ بے صبری اسے بے وفائی کی طرف راغب کرتی ہے حالانکہ وہ خود راغب نہیں ہوتی، بہت سارے محرکات ہوتے ہیں۔جو خود بخود متوجہ کرتے ہیں۔

یہ بات تو طے ہے انسان کی سب سے پہلی خوبی اس کی ظاہری شخصیت اس لیے شمار ہوتی ہے کہ اور خوبیوں کی بہ نسبت اس خوبی کا ادراک ایک عام سے عام ذہن اور سادہ نظر بھی کر لیتی ہے۔خوبصورت چیز کو سراہنے کے لیے دماغی صلاحیتوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ سادہ سی نگاہ بھی حسن کو پرکھ لیتی ہے۔ایک عام شخص جتنا اچھا دیکھ سکتا ہے اتنا اچھا سوچ نہیں سکتا۔اور یہ پورا معاشرہ عام دماغوں سے بھرا پڑا ہے۔اچھے دماغوں سے نہیں۔

اور بس، یہی سر، یہی...... میری تمام عمر کے تجربے کا نچوڑ تھا۔ایک روز ماما نے کہا تھا۔

''مرد اور عورت کے انداز محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔مرد ہمیشہ اپنے سے ہر معاملے میں کم ہی کا خواہاں ہوتا ہے۔اس لیے کہ قدرتی طور پر برتری مرد کے خمیر میں شامل ہے جبکہ عورت ہمیشہ برابری کی تمنا کرتی ہے۔کیونکہ کائنات کا توازن عورت کے وجود کا مرہون منت ہے۔''

اسی لیے ماما کہتی تھیں۔

''ازدواجی زندگی میں ظاہری خوبیوں کا توازن بڑی اہمیت رکھتا ہے۔''

باوجود ماما کے خیالات کے عجیب بات تھی۔ پاپا اور ماما کی زندگی آئیڈیل طریقے سے گزر رہی تھی۔

حالانکہ مما حسین ترین عورت تھیں۔ ہر لحاظ سے مکمل، اور زبردست قوت ارادی کی مالک، اور خود مختار۔ ہمہ وقت مکان اور مکینوں پہ چھائی ہوئی شخصیت کی مالک، عام طور پر جب پاپا اور مما اکٹھے بیٹھے ہوتے، تب بھی ماما اپنی شخصیت کی وجہ سے پاپا پہ حاوی ہی نظر آتیں۔اور پھر پاپا کا خود انداز بھی تو ایسا تھا۔ ہمیشہ برتری دے دینے والا۔ پاپا کتنی محبت کرتے تھے مما سے، اتنی کہ اس کا حساب نہیں کیا جا سکتا۔

جو کچھ وہ کہہ دیتیں۔بس وہی ہوتا۔

پاپا، مما کی ہر بات سراہتے۔

ہر بات کی تعریف کرتے۔

پھر یکا یک کیا ہوا، دونوں کی زندگی کے رخ پلٹ گئے۔

پاپا کی اپنی زندگی تھی۔اور مما کی اپنی زندگی۔

پاپا تو مصروف ہی رہتے تھے۔مما کی مصروفیات بھی دیکھتے ہی دیکھتے بڑھ گئیں۔

پھر پاپا کی طرف سے دی ہوئی مکمل خودمختاری۔پاپا بالکل تنہا ہو کر رہ گئے۔

ادھر مما اپنی تنہائی کو سوشل سرگرمیوں میں تقسیم کرتی پھرتی تھیں۔رفتہ رفتہ دونوں کی زندگی دریا کے دو کناروں کی شکل اختیار کر گئی۔

دونوں نے خوشی تو خوشی ایک دوسرے کے غموں میں بھی شامل ہونا چھوڑ دیا تھا۔ایک ہی چھت کے نیچے اتنی فصیلیں قائم ہو گئی تھیں شاید اسے کبھی بھی پتا نہ لگتا، اگر پاپا اس رات شدید بیمار نہ ہوتے۔

کھانسی تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی اور بخار تھا کہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔چند دن سے پاپا بیمار تھے، ملازم ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں لیکن ماما کی دلچسپی معمولی بھی نہیں تھی۔حالانکہ ڈاکٹرز نے تاکید کی تھی کہ انہیں بہت زیادہ آرام کرنا چاہیے اور ٹینشن سے محفوظ رکھا جائے۔کیونکہ ان کا دل اپنے حجم سے بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔جس کا اب واپس اپنے مقام پہ جا کر ٹھہرنا ناممکن تھا۔

اس کے باوجود مما کی لاپروائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔پاپا کی بگڑتی ہوئی حالت، اور گرج چمک کے ساتھ برستی بارش، گھر کا منظر کتنا ہولناک ہو گیا تھا۔مما ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھیں۔کچھ ہو جانے کا اندیشہ اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا۔خوف و دہشت سے وہ بولائی بولائی پھر رہی تھی۔اچانک مما کو گاڑی سے نکلتا دیکھ کر اس کے سارے خوف ختم ہو گئے۔

اور وہ ان سے لپٹ گئی۔"مما پلیز۔جلدی چلیں پاپا کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

کس قدر عجیب لگا تھا اس وقت ماما کا یہ کہہ دینا۔

"تم نے ڈاکٹر انکل کو فون کیا؟ میڈیسن وغیرہ دی ہوتیں۔"

"ماما! مجھے کچھ نہیں پتا۔سب ملازم بھی جا کر سو گئے ہیں۔آپ خود چل کر پاپا کو دیکھیں۔"

"ٹھیک ہے تم چلو۔میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔"

"مما! پاپا کو اس وقت آپ کی ضرورت ہے۔" مما کی بے حسی پہ اسے رونا آ گیا۔

"مجھے معلوم ہے، انہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔فی الحال تم ان کے کمرے میں جاؤ، میں لال دین کو جگاتی ہوں۔"

"مما قطعی سے انداز میں کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔اور وہ حیران و پریشان پاپا کے کمرے میں آ گئی۔

اب وہ پرسکون لیٹے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر انہیں چیک کر کے چلا گیا تھا۔لال دین دوائیں لینے گیا ہوا تھا۔ڈاکٹر انکل کہہ کر گئے تھے۔اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔لیکن

اتنی بے فکری کی بھی بات نہیں تھی، کہ مما پاپا کے کمرے میں آئیں اور بس کھڑے کھڑے انہیں دیکھ کر ملازمین کو ہدایت دے کر چلی گئیں۔ مما کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اسے مما سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی لاتعلقی اس کے لیے سوہان روح سے کم نہیں تھی۔ اس کے آنسو نجانے کب سے پاپا کے ہاتھ پہ گر رہے تھے کہ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بے چین ہو کر اٹھنا چاہتے تھے اس نے انہیں زبردستی روک دیا۔ اور خود چہرہ چھپا کر آنسو صاف کرنے لگی۔

''میں ٹھیک ہوں زیبی بیٹا! مجھے کچھ نہیں ہوگا۔'' پاپا کی بات پہ اسے رونا آ گیا۔ ''چاہنے والے پاس ہوں تو موت کوسوں دور بھاگ جاتی ہے۔'' انہوں نے پیار سے اس کا گال چھوا۔

''مما ہم سے دور کیوں ہوتی جا رہی ہیں پاپا؟''

''چاہنے والے یوں ایکدم سے دور نہیں ہو جاتے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے، پاپا۔ کیا ہو گیا ہے؟''

فائق احمد کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹے رہے۔

''کیا آپ دونوں کے مابین کوئی لڑائی ہوئی ہے؟ آپ نے مما کو کچھ کہا ہے یا مما کی کوئی بات آپ کو بری لگی ہے۔ پاپا! آخر کون سی بات ہے ایسی جو آپ دونوں یوں غیروں کی طرح رہنے لگے ہیں۔ مجھے بتائیں پاپا۔ میں مما کی طرف سے آپ سے معافی مانگوں گی۔ آپ کی طرف سے مما کو مناؤں گی۔ مگر اب میں ایسے ماحول میں نہیں رہ سکتی۔'' وہ بضد تھی، بے چین تھی، رو رہی تھی۔

فائق احمد نے تڑپ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

''اگر اب، ہمیشہ یونہی رہا تو، پھر......؟''

ذوباریہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

''نہیں پاپا! مما میری ہر بات مانتی ہیں۔ میں انہیں منالوں گی۔ کیوں رہے گا ایسا سب کچھ۔ ویسے ہی رہیں گے جیسے ہم رہتے تھے؟''

فائق احمد تاسف سے ہنس پڑے۔

''اب ایسا ناممکن ہے۔''

''کیوں ناممکن ہے پاپا کیوں؟'' میں مما سے پوچھتی ہوں'' وہ کھڑی ہو گئی۔ ''آخر ایسا کون سا جھگڑا ہوا تھا آپ لوگوں کے مابین کہ یکا یک دوریاں پیدا ہو گئیں؟'' وہ جذباتی ہونے لگی۔

فائق احمد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

''سچ اس قدر کڑوا ہے، ادھر سے سنو گی یا ادھر سے......سوائے دکھ کے کچھ نہیں ملے گا۔ بہتر نہیں۔ ہم یونہی رہتے رہیں۔''

''پاپا!'' ذوباریہ کی آواز رندھ گئی۔

''وہ کون سی حقیقت ہے جو آپ مجھ سے چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ میں نے آپ لوگوں کو کبھی براہ راست جھگڑتے بھی نہیں دیکھا۔

معمہ کیا ہے۔ مجھے کچھ سمجھائیں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔''

فائق احمد نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اب تو یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔ لیکن تمہاری ماں کا میں مشکور ہوں کہ وہ اپنا وعدہ نبھا رہی ہے۔''

''کون سا وعدہ پاپا!'' آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔''

''اب روشن آرا کا اور میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ تمہاری ماں تو ہے لیکن میری بیوی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ قبل۔ میں اسے طلاق دے چکا ہوں۔''

باپ کے لفظوں پہ ذوبار یہ ان کے پاس سے اس قدر تیزی سے پیچھے ہٹی جیسے ماں کے تعلق کے ساتھ ہی اس کا تعلق بھی ختم ہو گیا ہو۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پاپا؟'' اس نے بے حد حیرانی سے سوال کیا۔ یقین اس کے لیے ناممکن ہی نہیں محال بھی تھا۔

فائق احمد تکلیف سے مسکرائے۔

''اب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا، یقین نہ آئے تو اپنی ماں سے پوچھ لو۔ ظاہر ہے تمہیں پھر دوبارہ ایسی ہی تکلیف ہو گی۔

''مگر پاپا! کیوں، کب، اور کیسے ہوا یہ سب کچھ؟ ہکلاتے ہوئے انتہائی شاکڈ انداز میں پوچھا۔

''عورت اسی شخص سے پرستش کرانا پسند کرتی ہے، جو اس سے خوب تر ہو۔ کم شکل مرد۔ خواہ، کتنی ہی حیثیت رکھتا ہو۔ حسین ترین عورت سے محبت کرتے ہوئے ہمیشہ کم تر ہی لگتا ہے۔

''پاپا!'' باپ کے لفظوں پہ چیخ اٹھی۔

''آپ اس قدر بے بس کیوں ہو گئے۔ اپنی تضحیک کے بعد مما کو آزاد کر دیا۔'' اسے باپ پہ غصہ آیا۔

''جب دلوں میں گنجائش نہ ہو بیٹا، تو جبر کے رشتے ناسور بن جاتے ہیں۔ وہ شاید میرے ساتھ خوش رہ لیتی۔ اگر ہم دنیا میں تنہا ہوتے مگر یہ دنیا۔ یہ دنیا جینے نہیں دیتی۔ جب وہ میری زندگی میں آئی تھی۔ میں نے اپنی قسمت پہ بہت ناز کیا تھا۔ پھر اسے یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہے دنیا کی ہر نعمت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد وہ میرے ساتھ صرف خلوت میں خوش رہنے لگی اور لوگوں میں آنا جانا ترک کر دیا۔ حالانکہ لوگوں کی نظریں میرے لیے کم مضحکہ خیز نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن۔ میں نے ہمیشہ خود کو کم تر محسوس کرنے کے بجائے تمہاری ماں کی سنگت میں خود پہ فخر ہی کیا تھا۔

وہ چاہتی تو ان نگاہوں پہ کبھی نظر نہ رکھتی، کبھی زمانے کی آوازوں پہ کان نہ دھرتی۔ لیکن پتا نہیں کیوں۔ میری ذات کی کمی اس کے اندر کا شدید کمپلیکس بن گئی۔ چونکہ مجھے تمہاری ماں سے شدید محبت تھی۔ اور میں اسے بہت عرصہ تک ناخوش نہیں دیکھ سکتا تھا کہ جن لوگوں سے محبت کی جائے انہیں آزمانا یوں بھی اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی محبت کے جواب میں اس سے کبھی محبت نہیں مانگی اس کا ساتھ ہی میرے لیے سب سے بڑا انعام تھا۔ جب میں نے اس کے ساتھ میں کھنچاؤ محسوس کرنا شروع کیا تو چپ چاپ اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔''

ذوباریہ حیرانی سے باپ کی شکل دیکھتی رہی۔

''وہ جانے لگی۔ تب میں نے اس سے ایک گزارش کی۔ جب تک ذوباریہ کے مستقبل کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ ہم دونوں زمانے کو دکھانے کے لیے ایک ساتھ رہیں گے۔ تاکہ اس کے مستقبل پہ ہمارے فیصلے، ہمارے طرز زندگی کا منفی اثر نہ پڑے۔ بہر حال وہ مان گئی۔ اب اس کی اپنی زندگی ہے اور میری اپنی زندگی۔''

فائق احمد چپ ہو گئے۔ ذوباریہ خود پہ حیران تھی۔ اتنا بڑا سانحہ گھر میں ہوا تھا اور اس کے فرشتے بھی اس سے لاعلم تھے۔ بہت دن تک وہ صدمے کی کیفیت میں رہی۔

دن رات کے ہر پہر میں اس نے والدین کی زندگی کے پہلوؤں پہ غور کیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا قصور کس کا ہے۔

کبھی ماں کی جگہ پہ رکھ کر خود کو سوچتی۔

پاپا، مما کی سنگت میں خود پہ فخر کرتے تھے۔

ظاہر ہے بالکل ایسے ہی جیسے وہ کرتی تھی۔

مما اس کے اسکول میں آجاتیں، تو اسکی سہیلیاں، اس کے ٹیچرز اس کی مما کی کتنی تعریفیں کرتے تھے۔

اور وہ ان کی تعریفوں پہ ایسے خوش ہوتی جیسے مما کے حسن کو نہیں اس کے کسی کارنامے کو سراہا جا رہا ہو۔ ظاہر ہے پاپا بھی اسی طرح خوش ہوتے ہوں گے۔''

لیکن مما۔ مما کے بھی کچھ احساسات ہوں گے۔ وہ اس وقت کیا محسوس کرتی ہوں گی۔

مما نے تقریباً ہیل والی جوتی پہننا چھوڑ دیا تھا۔

تاکہ وہ اور پاپا ساتھ ساتھ چلیں تو تقریباً ایک جیسے لگیں۔

لیکن ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود پاپا کے برابر اور پاپا ان کے برابر نہیں آسکے۔ دونوں میں دن رات جیسا ظاہری فرق تھا۔ اس کے باوجود اس نے پاپا کو مجبور کیا کہ وہ مما کو پھر سے اپنا لیں۔ لیکن ایسا اب ناممکن تھا۔

شاید پاپا نے درست فیصلہ کیا، آخر مما کے بھی تو کچھ جذبات تھے۔ شاید ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس نے جیسے اس فیصلے پہ صبر کر لیا۔

وقت عجیب بے تکے انداز میں گزرتا رہا۔

اچانک مما کو اسکا بیاہ رچانے کی جلدی ہو گئی۔ اور پھر یہ خواہش شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ مما اس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر کے آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ تب ہی اتنا واویلا مچا رہی ہیں۔ پھر بھی اس نے صبر و ضبط سے کام لیا۔

''مما! ابھی تو میرا ایف اے کا رزلٹ بھی نہیں آیا۔ ابھی اتنی جلدی کیا ہے؟''

''رشتہ اچھا ہے بیٹا! شادی دو تین سال کے بعد رکھ لیں گے۔'' فی الحال تم ہامی تو بھرو۔''

لیکن کامران کا نام سن کر وہ جیسے اکھڑ گئی۔ مما کامران کی خوبیاں بیان کر رہی تھیں۔ اور وہ گنگ سی بیٹھی تھی۔ مما نے اسے سوچنے کا کہا تھا۔

کامران۔ مما کا کزن تھا۔ عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا۔ لیکن مما سے اس کی بے تکلفی شروع سے ہی بہت زیادہ تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اور بڑھتی چلی گئی وہ ان کے گھر آتا جاتا تھا۔ لیکن، وہ شروع سے ہی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ عجیب چاپلوس طبیعت تھی اس کی۔

خصوصاً عورتوں کی محفلوں میں گھسنا اور ان کی تعریفیں اور ذکر کرنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ ایسے مرد اسے مرد ہی نہیں لگتے تھے جو خواتین کے موضوع کو سب سے زیادہ پرکشش سمجھیں۔

اس کے باوجود۔ کامران، مما کی اولین ترین پسند تھا۔ اور وہ چاہتی تھی وہی اس گھر کا داماد بنے۔

ان کی عجیب خواہش ابھر کر سامنے آ رہی تھی۔ ''جب انہیں وہ اتنا پسند تھا تو پھر داماد بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

وہ بسا اوقات جل کڑھ کر سوچتی۔ کتنی دلچسپی تھی مما کی خود کامران میں۔

وہ کس قسم کے رشتے کو تشکیل دینا چاہتی ہیں یہ کون سی ڈھکی چھپی خواہش ہے۔ جس کی زنجیر مجھے بنا رہی ہیں۔

مما کی اور کامران کی قربت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

کامران، مما کی اتنی تعریفیں کرتا تھا، اس کے باوجود اس کی نگاہ ان کی بیٹی پہ بھی تھی۔

یعنی وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا اور مما شوق سے شکار ہو رہی تھیں۔

نکلتا ہوا قد تھا اس کا اور شکل صورت بھی ایسی تھی کہ اچھوں میں شمار ہو جاتا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ مما اپنی شخصیت کو ہی نظر انداز کر دیتیں۔ یا پھر مما خود دوہری چال کھیل رہی تھیں۔

وہ سوچ سوچ کر کڑھتی رہی۔

پاپا نے تمام تر فیصلے کا اختیار ابھی بھی مما کو دے رکھا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق مائیں بیٹیوں کے فیصلے بہتر طرح سے کر لیتی ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق شاید وہ ماں سے زیادہ قریب تھی۔

لیکن اب تو وہ اتنی دور جا چکی تھی کہ ماں کے سائے سے بھی دور بھاگنا چاہتی تھی۔

مما کا کامران کے ساتھ گھومنا پھرنا پھر اسے کامران کے لیے راضی کرنا۔ وہ اس گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئی۔

مما نے آج پھر اسی موضوع پہ بات چیت کی تھی اور وہ جیسے پھٹ پڑی۔

''پلیز مما، پلیز بند کر دیجیے یہ ڈرامہ۔ آپ کو خود بھی پتا نہیں کہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ اور کیا کرنا چاہتی ہیں۔ ہاں لیکن یہی سچ ہے۔ آپ بذات خود کامران میں انوالو ہیں۔ مگر آپ کو اندازہ نہیں ہو رہا کہ اس کے ہیر پھیر سے کس طرح نکلیں یا چھپیں۔''

روشن آرا گنگ رہ گئیں۔

ذوباریہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ وہ ماں کے داغدار کردار کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اسے کرنا پڑی۔ اس نے ہتھیلی سے آنسو رگڑ دیئے۔

''میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اسے چاہتی ہیں یا وہ آپ کو چاہتا ہے ہاں مگر اتنا ضرور کہنا چاہوں گی عورت کو کوئی چاہے یا نہ چاہے، مگر سراہے ضرور، عمر کے آخری حصے تک اسے یہی خواہش رہتی ہے اور یہی...... یہی سراہے جانا آپ کو تباہ کر رہا ہے۔ آپ کی شخصیت مسخ کر رہا ہے مما۔''

وہ روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

آج اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کی ماں اچھے کردار کی عورت نہیں ہے۔ تب ہی تو پاپا نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

محض شکلوں کی بات ہوتی تو شاید نبھ ہی جاتی تان تو کردار پہ آ کر ٹوٹی تھی۔

لیکن۔ کیا پاپا، مما کو سمیٹ نہیں سکتے تھے؟ سدھار نہیں سکتے تھے؟ ایک کمزور مرد ہونے کا ثبوت کیوں دیا پاپا نے؟

مرد ایسے تو نہیں ہوتے۔ مرد تو غیرت منداور اپنی امانت پہ تنگ نظر، خون خرابا کر دینے والے، اپنی بات منوانے والے۔ اپنی عزت کو سنبھال کر رکھنے والے ہوتے ہیں۔

پاپا جیسے نہیں ہوتے اسے پاپا پہ شدید غصہ تھا۔

بات کھل جانے کے بعد مما وہ گھر چھوڑ کر اسٹیٹس چلی گئیں۔

باوجود نفرت کے، مما کے جانے کا اسے گہرا دکھ ہوا تھا۔

وہ مما کے بہت قریب تھی۔ پاپا تو بہت دیر کے بعد اس کے قریب آئے تھے۔

بہت عرصے تک تو اس نے پاپا کو ہی موردِ الزام ٹھہرائے رکھا۔ کیونکہ سب کچھ ان کی کمزور قوت ارادی کے ہی نتیجہ کے تحت ہوا تھا۔ کوئی ان کے اندر کا احساس محرومی تھا۔ جس نے انہیں مضبوط اقدام سے باز رکھا تھا۔ وگرنہ وہ سب کچھ برداشت کرتے تھے۔ سب ہی کچھ۔

اور بس، یہی احساس اس کے اندر بیٹھ گیا تھا۔

مرد کو ہر لحاظ سے مرد، ہر لحاظ سے بالاتر اور خوبرو ہونا چاہیے۔

اپنی خواہش کا خیال آتے ہی، اس کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ اور وہ سسکی بھر کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

گھر میں معمول سے زیادہ چہل پہل اور شور ہنگامہ تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی۔

اس نے آنکھیں چندھیا کر وقت دیکھا۔

دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ بستر چھوڑ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ باوجود فریش ہو جانے کے اس کا دماغ ابھی بھی حاضر نہیں ہوا

تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکلا تو بہت ساری خواتین کو وسطی کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ ان سب کے درمیان گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔

یقیناً یہ سب، اس کی سہیلیاں، کزنز اور آنٹیاں وغیرہ تھیں۔ اچانک اتنی ساری خواتین کو دیکھ کر اسے بہت گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ ایسے لگا، جیسے ساری ہی عورتیں بہت چالاک ہیں۔

اور اسے اچھی طرح سے پڑھ رہی ہیں۔ آنکھوں میں رات کا خمار ابھی تلک قائم تھا۔ سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ پھر ان لوگوں کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ حالانکہ اسے بیٹھنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس کی آمد سے خواتین میں کھلبلی سی مچ گئی اور ہنسی مذاق ہونے لگا۔

ورشہ سب سے زیادہ مسرور اور سرشار تھی۔ اور سب سے زیادہ اس نے آفت مچائی ہوئی تھی۔ جہاں داد اس وقت اس آفت لڑکی سے دل ہی دل میں پناہ مانگ رہا تھا۔ کہیں یہ اس کی جان کو نہ آجائے۔

اس نے کن اکھیوں سے دیکھا، وہ ذوباریہ کے پہلو میں چپکی بیٹھی تھی۔

''ہم ذوباریہ کو لینے کے لیے آئے ہیں۔ آپ کی اجازت ہو تو لے جائیں؟'' ورشہ نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ آہستہ سے مسکرا دیا۔ ''ابھی تو آپ لوگ آئے ہیں، کچھ دیر تو بیٹھیے۔''

''ماشاءاللہ، جناب۔ ہم بہت دیر سے آئے ہیں، یہ اور بات ہے کہ آپ دیر سے ہمارے پاس پہنچے ہیں۔''

وہ شرمندہ ہو کر صفدر کی طرف متوجہ ہو گیا، جو تواضع کا سامان میز پہ سجا رہا تھا۔

''جہاں داد صاحب! اس معاملے میں آپ بہت خوش نصیب ہیں۔'' ذوباریہ کی ایک کزن بولی۔

''وہ کیسے؟'' اسے مسکرا کر شامل گفتگو ہونا پڑا۔

''آپ کو بیوی بہت سمجھدار ملی ہے، ابھی سے آپ کے آرام کا اتنا خیال ہے اسے کہ ہمیں اپنے کمرے میں بٹھانے کے بجائے یہاں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ مبادا آپ کی نیند ڈسٹرب نہ ہو جائے۔'' اس بات پہ ایک زوردار نسوانی قہقہہ پڑا۔

''لیجیے۔ آپ لوگ، چائے وغیرہ لیجیے۔'' اس نے گویا اپنی طرف سے ٹالا۔

ورشہ سب کو چائے سرو کرنے لگی۔

''ویسے اس موقع پر ساس نندوں کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے اب دلہن بے چاری خود ہی مہمان اٹینڈ کر رہی ہے۔'' کسی آنٹی نے کہا۔

''ہاں۔ آپ کے گھر والوں کو رات چلے نہیں جانا چاہیے تھا۔ بڑا عجیب سا لگا، ان لوگوں کا چلے جانا۔ کیا ان لوگوں کی پسند سے نہیں ہوا یہ رشتہ؟'' دوسری بھی شامل گفتگو ہو گئی۔

اسکے چہرے پہ سنجیدگی چھا گئی۔

''نہیں، ایسا تو نہیں ہے۔'' اس کے بجائے ورشہ نے جلدی سے جواب دیا۔

''جولڑ کے اپنی پسند کی شادی کر لیتے ہیں۔ والدین ان کی شادیوں میں مہمانوں کی طرح ہی شریک ہوتے ہیں، معاف کیجئے گا۔ جہاں داد کے گھر والوں کے رویوں سے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا۔''

ورشہ نے گھبرا کر جہاں داد کی طرف دیکھا۔

وہ چپ چاپ چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

''نہیں، ایسا تو نہیں ہے آنٹی! سب ہی کچھ سب کی آمادگی اور پسند سے ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ شہری زندگی زیادہ پسند نہیں کرتے۔''

''کیوں سر؟ ایسا ہی ہے ناں؟'' ورشہ نے جہاں داد کی طرف دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔

''آپ اب بھی مجھے سر کہہ کر مخاطب کریں گی؟ حالانکہ اب ہمارا رشتہ خاصا تبدیل ہو گیا ہے۔''

''ذوباریہ نے بے انتہا چوک کر جہاں داد کی طرف دیکھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے نگاہیں جھکا لیں۔

(جس رشتے کو آپ نے خود قبول نہیں کیا۔ دوسروں پہ کس حیثیت سے لاگو کریں گے) ذوباریہ کرب سے سوچ کر رہ گئی۔

ورشہ کھسیا کر ہنس پڑی۔

''آئی ایم سوری، بس عادت پڑ گئی ہے آپ کو سر، سر کہنے کی، اسی لیے دوسرے کسی رشتے کا خیال ہی نہیں آیا۔''

''کہیں ذوباریہ کو تو یہ عادت نہیں ہے۔'' ذوباریہ کی آنٹی نے چٹکلہ چھوڑا۔ اس طرح جیسے گھیرے میں لیا ہو۔ جہاں داد ہنس پڑا۔

''ابھی عادت ایک دوسرے پہ منکشف نہیں ہوئی۔'' ذوباریہ کا دل جیسے کسی نے نوچ لیا ہو۔

(اس سے بڑھ کر بھی ابھی کچھ اور مجھ پہ منکشف کرنا باقی ہے)

''مان لیا، اگر ذوباریہ نے بھی آپ کو سر ہی کہا تب؟'' اس کے کزنز نے جان بوجھ کر مزہ لیا۔

''تب تو مجھے سر بننا ہی پڑے گا۔'' اس نے چہرے پہ رعب لا کر کہا۔

سب ہنس پڑیں۔

''اچھا بیٹا! اب ہمیں اجازت دو، چلتے ہیں۔'' ورشہ کی امی اٹھ کھڑی ہوئی۔ باقی سب نے بھی انکی پیروی کی۔

باری باری سب نکلنے لگے۔

''خدا حافظ۔ جیجا جی!'' آخر میں ورشہ نے شرارت سے کہا۔

''جیجا جی!'' اس نے آنکھیں نکالیں۔

ورشہ ہنس پڑی۔

''اب یہ تو میں اپنی سہیلی سے پوچھ کر فیصلہ کروں گی، کہ آپ کو جیجا جی بنانا زیادہ مناسب ہے یا آپ دولہا بھائی ہی ٹھیک رہیں گے۔''

جہاں داداس کی شرارت پہ ہنس پڑا اور وہ یونہی ہنستے مسکراتے گھر سے نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

پاپا سے مل کر اس نے اپنے حوصلے کو کتنا آزمایا تھا کہ ایک آنسو بھی ان کے سامنے گرنے نہیں دیا تھا۔اور وہ کتنی بے کلی سے پوچھ رہے تھے۔

''تم خوش تو ہوناں میری جان!''

''ان کے لہجے میں بے پناہ اندیشے ناچ رہے تھے۔کئی فکریں، کئی بے چینیاں دل میں کلبلا رہی تھیں۔

اور وہ سب سمجھ سکتی تھی کہ انہیں اندیشوں نے کیوں گھیر رکھا ہے۔بس اسے تو اپنی طرف سے انہیں مطمئن کرنا تھا ہر ممکن طریقے سے کہ وہ واقعی خوش ہے۔اور پھر وہ جیسے شانت ہو گئے تھے۔

سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد ورشا اسے اس کے کمرے میں لے آئی، وہ بے حد مشتاق تھی یہ جاننے کے لیے کہ اسے رونمائی میں کیا تحفہ ملا ہے۔

''آخر تمہیں اتنی بے چینی کیوں ہے؟'' ذوباریہ تاسف سے مسکرا کر بولی۔ورشا اسکے قریب دھرنا مار کر بیٹھ گئی۔

''رونمائی میں دیا گیا تحفہ نئے ہم سفر کی طرف سے پہلا باضابطہ اظہار کہلاتا ہے۔یعنی دینے والے کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔

جو مرد رونمائی میں اپنی بیویوں کو زنجیر پہناتے ہیں وہ بیویوں کے لیے حاکم قسم کے مرد ثابت ہوتے ہیں۔لیکن اس تعلق کو تمام عمر نبھاتے بھی ہیں۔

جو مرد زنجیر کے ساتھ لاکٹ بھی پہنائے، وہ خاصا عاشق مزاج ہوتا ہے۔

جو مرد آویزے پہنائے، وہ زندگی میں توازن کا قائل ہوتا ہے۔یعنی اسے گھریلو عورتیں زیادہ پسند ہوتی ہیں۔

جو مرد ہاتھ میں کنگن پہناتے ہیں۔ان کی محبت پاکیزہ اور لازوال ہوتی ہے۔اور جو انگوٹھی پہناتا ہے اسکے کردار پہ بیوی کو زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہیے اس کی ذات میں تھوڑی بے وفائی ہوتی ہے۔

جو مرد لباس کا تحفہ دیتا ہے۔اس کی رگ رگ میں تحفظ کا احساس رچا بسا ہوتا ہے۔اور تم یہ بتاؤ تمہیں کیا ملا؟''

اس کے بے پناہ اصرار پہ ذوباریہ نے اپنی ہتھیلی ورشہ کے سامنے کھول دی۔ہتھیلی کے وسط میں جلے ہوئے زخم کا نشان، ورشہ گنگ رہ گئی۔

''اس بارے میں تمہاری نفسیات کیا کہتی ہے؟''

''ورشہ نے تحیر سے ذوباریہ کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ورشہ نے تڑپ کر بے ساختہ اپنے ہونٹ اس کے زخم پہ رکھ دیئے۔

''یہ.......یہ...... یہ کیا ہے؟ زبی!'' وہ تڑپ اٹھی۔

اس کی تکلیف کا احساس اسے اپنے وجود میں محسوس ہونے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ذوباریہ اس کا لمس پاتے ہی نئے سرے سے بکھر گئی۔

''وہ، اچھے آدمی نہیں ہیں ورشہ وہ بالکل اچھے آدمی نہیں ہیں۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ یہاں تک کہ وہ سب کچھ کہہ گئی جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

ورشہ ورطہ حیرت میں مبتلا تھی۔

☆ ☆ ☆

ابھی اس کی نیند اچھی طرح سے نہیں ٹوٹی تھی کہ ورشہ نے آ کر دل ہلا دیا۔

''جلدی سے اٹھ جاؤ۔ تمہارے صاحب جی آئے بیٹھے ہیں تمہیں لے جانے کے لیے۔''

''واٹ؟'' اس کے دماغ پہ زوردار دھماکہ ہوا۔

''کیوں، کیا دوبارہ گھر نہیں جانا تھا؟'' ورشہ کو اس کی بات پہ غصہ آیا۔

ذوباریہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی، وہ سخت خفا اور بے بس دکھائی دے رہی تھی۔

''دل تو چاہتا تھا نواب صاحب کے ہوش ٹھکانے لگا دوں۔ بڑے معزز بن کر آئے ہیں، ایسا سیدھا کروں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ بد تمیز شخص۔''

''افسوس کی بات ہے، ابھی تک اپنے ارادے پر عمل نہیں کیا۔''

ذوباریہ نے اس کے پھولے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا یوں جیسے اس کی اور اپنی بے بسی پہ ایک ساتھ ہنس رہی ہو۔

''کیا کروں۔ رشتہ ہی ایسا ہے؟ وگرنہ میں ایک منٹ میں سیدھا کر کے رکھ دیتی، انہیں۔ امی کہتی ہیں جس شخص کو ایک بار بیٹی دے دی جاتی ہے۔ ساری عمر اس کے ساتھ بندھ جاتی ہے۔ اپنی عزت کی خاطر اسے تمام تر اچھائیوں اور برائیوں سمیت ہمیں قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ زندہ انسانوں کے فیصلے ہیں کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں، بعض اوقات آنکھوں دیکھی مکھی بھی نگلنی پڑتی ہے صرف عزت کی خاطر۔''

ذوباریہ کو اپنی ماں کا خیال آ گیا اور اس کے دل سے گہری سرد آہ نکلی۔

''ہر ماں کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔''

''لیکن بیٹیوں کے معاملے میں تمام ماؤں کے نظریات ایک جیسے ہوتے ہیں اور ویسے بھی میری امی تو تجربہ کار عورت ہیں۔''

ذوباریہ تاسف سے ہنس پڑی۔ ورشہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''یوں پڑے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ فٹافٹ اٹھو اور دس منٹ میں تیار ہو جاؤ انکل نے سختی سے تاکید کی ہے دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے بھی وہ کافی دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور میں مہمان نوازی کے دو راؤنڈ مکمل کر چکی ہوں۔''

''مگر، ورشہ میں کیسے چلی جاؤں؟'' اسے رونا آ گیا۔

ورشہ بھی کچھ دیر تک خاموش بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''اب یوں رکنا بھی تو مناسب نہیں، انکل وجہ پوچھیں گے۔ بات بڑھے گی۔ پھیلے گی۔ انہیں دُکھ ہوگا تمہیں جانا ہی ہوگا۔''

''مگر میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ تقریباً رو پڑی۔

ورشہ اس کے قریب آ گئی۔ ''ہوسکتا ہے آج حالات مختلف ہوں۔ انہیں اپنے کل کے رویے پر یقیناً شرمندگی ہوگی۔ تب ہی تو لینے آئے ہیں اور پھر وہ ایک پڑھے لکھے شخص ہیں یہ غیر مہذب حرکت ان کی شخصیت کا خاصہ نہیں لگتی۔ تم جاننے کی کوشش کرو کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔''

ظاہری سی بات ہے میں انہیں پسند نہیں ہوں۔'' ذوباریہ نے چڑ کر کہا۔

''اتنی پیاری لڑکی کو کوئی پاگل بھی ناپسند نہیں کر سکتا۔ میں آج تمہیں اتنا پیارا تیار کر کے بھیجوں گی کہ وہ واقعی تمہیں دیکھ کر بے ہوش ہو جائیں گے اور ساری خفگی سارا غصہ بھلا دیں گے۔ چلو اٹھو، فٹافٹ۔''

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔'' ذوباریہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

اسی لمحے فائق احمد خود کمرے میں آ گئے۔

''کیا بات ہے، ذوبی بیٹا! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئی ورشہ بیٹا تم نے بہن کو بتایا نہیں تھا۔''

وہ اسے تساہل سے لیٹا دیکھ کر کچھ فکرمند ہوئے۔

''انکل یہ سو رہی تھی۔ بس اسی لیے دیر ہو گئی۔ آپ چلیے، بس ہم ابھی آتے ہیں۔''

''او کے، زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ واپس چلے گئے۔

ذوباریہ نے ورشہ کی طرف بے حد بے بسی سے دیکھا۔ پھر آنسو صاف کرتے ہوئے طوعاً کرہاً بستر چھوڑ دیا۔

اس کی تمام تر تیاری میں ورشہ کی کوشش التجاؤں اور دھمکیوں کا اثر تھا۔ اس نے گم صم سے انداز میں آئینے پہ آخری نگاہ ڈالی۔ بلیک جارجٹ کی مقیش والی ساڑھی ہم رنگ ہاف سیلولیس سلاؤز سادہ نفیس جیولری۔ اور رات کی مناسبت سے میک اپ۔

''پیارا آ رہا ہے خود پہ۔'' ورشہ برابر میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

ذوباریہ نے کھوئے کھوئے انداز میں ورشہ کی طرف دیکھا۔

''کل کیا میں بہت بری لگ رہی تھی، جو انہوں نے میرے ساتھ ایسی بدسلوکی کی؟'' ورشہ لاجواب ہو گئی۔ ذوباریہ کے آنسو نکل پڑے۔

''دیکھو ذوباریہ! اگر تم نے پھر سے یہ مینہ بہانے شروع کیے ناں میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گی۔ ابھی جا کر لڑ پڑوں گی ان سے بھلے تمہارے ساتھ پھر کچھ بھی ہو۔ پھر مجھے پھاپھا کٹنی مت کہنا۔''

ذوباریہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔ ساڑھی کا پلو سمیٹ لیا۔

''پاپا کے سامنے میں اس حلیے میں جاؤں گی۔'' اسے اپنے ننگے بازوؤں پہ شرمندگی ہوئی۔ ورشہ نے شال اس کے کاندھوں پہ ڈال دی۔

''اب تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' ذوباریہ تشکر سے ہنس دی۔ دونوں ساتھ ساتھ باہر آ گئیں۔

جہاں داد فائق احمد ایک دوسرے سے محوِ گفتگو تھے۔ شاید سیاست پہ بات چیت ہو رہی تھی۔

وہ نکھرا ستھرا ان کے مقابل بیٹھا تھا۔ کس قدر تہذیب سے شائستہ گفتگو کر رہا تھا۔

یہی تو خواب دیکھا تھا اس نے، پھر تعبیر اس قدر الٹ کیوں ہوئی! اس کے دل پہ گھونسا سا لگا۔

''لیجیے سر! آپ کی مسز حاضر ہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی ورشہ کا لہجہ کھردرا ہو گیا تھا۔

جہاں داد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بہت ساری شکایات درج تھیں۔ اس کا مطلب تھا، ذوباریہ نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

اس نے ذوباریہ کی طرف دیکھا۔ تو گنگ رہ گیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے نگاہیں پھیر لیں۔ پھر اجازت طلب کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا سر! اجازت دیجیے۔ چلتے ہیں۔''

''بھئی یہ کیا مصیبت ہے۔ وہ تمہیں سر، تم مجھے سر۔ کیا ہم نے ابھی تک نئے رشتے قبول نہیں کیے۔ یہ کیا اجنبیت ہے۔'' فائق احمد برا مان گئے۔

جہاں داد نے باری باری ورشہ پہ پھر ذوباریہ پہ نگاہ ڈالی۔ پھر تلافی سے مسکرا کر جتانے والے انداز میں بولا۔ ''پرانی عادت ہے، سر! چھوٹتے سے ہی چھوٹے گی۔''

ورشہ تو ورشہ ذوباریہ بھی حق دق رہ گئی، بہرحال فائق احمد نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔

وقتِ رخصت فائق احمد نے بیٹی اور داماد کو دستِ شفقت سے نوازا دونوں آگے پیچھے گھر سے نکل گئے۔

راستہ خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔ ذوباریہ نے ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خود کوئی بات کرے گا، لیکن وہ بے حس پتھر کی طرح بیٹھا تھا۔ نہ اس پہ نگاہ ڈالی تھی، نہ ہی کوئی اور بات کی تھی۔

ذوباریہ نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ کل کے رویے کا اس کے چہرے پہ کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہ شرمندگی، نہ افسوس۔

اس کی روح کانٹوں کے جھاڑ میں الجھنے لگی۔ ذلت کا احساس دل ہی دل میں کچوکے دے رہا تھا۔ کہ وہ اس کے ساتھ کیوں چلی آئی۔ اور کس خوش فہمی کے تحت چلی آئی۔ وہ تو اس طرح بیٹھا تھا۔ جیسے وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، بالکل ٹھیک ہے۔

کوئی مرد اس قدر بے حسی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔

ذوباریہ کو اپنی بے قدری پہ رونا آ گیا۔

لیکن اس نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا کہ وہ آج بالکل نہیں روئے گی، کم از کم اس کے سامنے تو بالکل نہیں۔

اس نے گھر کے سامنے گاڑی روک لی۔

زوباریہ اس سے پہلے اتر کر اندر چلی گئی۔ راستے بھر جس طرزِ عمل کا اس نے مظاہرہ کیا تھا۔ اچھا سلوک اس کے ساتھ نہیں کر سکتا۔

ہر طرح کی خوش فہمی دم توڑ چکی تھی۔

اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے یہی سوچا تھا کہ وہ آج وہاں نہیں جائے گی۔ جو اس بھیڑیئے کی خلوت گاہ ہے۔

اس نے آناً فاناً سارے گھر کا جائزہ لے ڈالا۔

اس کے ذاتی بیڈروم کے علاوہ ڈرائنگ روم، کچن، اسٹور۔ صد شکر کہ ایک کمرہ اور بھی تھا۔ جو اس کے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے تشکر بھرا سانس خارج کیا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے پھر مایوس ہو گئی اس کمرے میں بستر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جس پہ وہ جیسے تیسے رات گزار لیتی۔

اس نے ساڑھی کا پلو سمیٹا۔ پھر بھاگ کر اس کے کمرے میں آئی۔ بیڈ پہ سے ایک تکیہ اٹھالیا۔ پھر کمبل سمیٹا۔ ایک عدد چادر کھینچی۔ اتنی ساری چیزیں اور کوفت زدہ لباس ساڑھی، جس میں وہ پہلے ہی الجھن محسوس کر رہی تھی۔

کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ سب پہلے اپنا لباس تبدیل کر لیتی۔

باری باری وہ سب چیزیں اپنے کمرے میں رکھ آئی۔

پھر جلدی جلدی سینڈل اتارے۔ اب بھاگنے دوڑنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ پھر واپس اس کے کمرے میں آئی۔ وارڈ روب کھولا۔ اپنا ایک ہلکا پھلکا سا جوڑا نکالا۔ اسے سینے سے لگا کر مڑی لیکن۔ دوسرے ہی لمحے۔ اس کے قدم زمین میں جم گئے۔ وہ کمرے سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ وہ دروازے میں ایستادہ تھا۔

زوباریہ نے نفرت سے نگاہیں پھیرلیں۔ وہ بالکل کل والی پوزیشن میں آچکا تھا۔

"میرے راستے سے ہٹ جایئے۔" اس نے سلگ کر کہا۔

"جہاں داد نے اس کے ہاتھ سے کپڑے لے کر دور پھینک دیئے۔

"چلی جانا مگر......ابھی......ابھی......ابھی......نہیں......"

زوباریہ غصے سے کانپ اٹھی۔ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

"جب آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔ تو پھر یہ تعلق بھی زبردستی نبھ نہیں سکتا۔ سب سودے محبت کے ہوتے ہیں۔" اس کی بات پر وہ یکدم بھڑک اٹھا۔ اس کے بالوں کو پکڑ کر پیچھے کی طرف جھٹکا پھر اس پہ جھک کر غضبناک لہجے میں بولا۔

"جو......جو......تعلق تم زبردستی بنا سکتی ہو۔ اسے......زبردستی نبھاؤ بھی۔"

''وہ اس وحشت سے چلایا تھا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ پھر ایک جھٹکے سے اس نے اپنی مٹھی سے اس کے بال آزاد کر دیئے۔

''آپ کے دل میں میری طرف سے جو بھی نفرت ہے اس کا اظہار ہوش میں آ کر کیجئے۔ یہ کھوکھلے سہارے لینے کی ضرورت کیوں؟'' وہ تقریباً غرائی۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اور پھر جیسے پھٹ پڑی۔

میں بھی تو دیکھوں۔ میری طرف سے کتنی نفرت ہے آپ کے دل میں۔ انتقام کی کیا حد ہے؟ ہر طرح کا ظلم سہہ جائے گی ذوباریہ...... احمد مگر۔ یہ بے خبری کی موت نہیں۔ سمجھے آپ۔

ہمت ہو تو کبھی ہوش میں آ کر نفرت کا اظہار کیجئے گا مجھ سے۔ ملک صاحب۔ ہوش میں آ کر''

دوسرے ہی لمحے جہاں داد کا زناٹے دار تھپڑ اس کی زبان بند کر گیا۔

''زیادہ بکواس پسند نہیں ہے مجھے۔'' وہ غرایا۔

اور وہ جیسے جہنم میں جا پڑی۔ اس نے لبالب پانیوں سے بھری نگاہیں اٹھائیں۔ وہ بالکل دھت تھا۔ اسے خود خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

اس کی طرف دیکھ کر ذوباریہ نفرت سے ہنس پڑی۔

''تکلیف دے کر شوق نظارہ کی صلاحیت تو پیدا کیجئے پہلے۔ تا کہ...... زخم سہنے میں مجھے بھی لطف آئے اور آپ کو بھی۔''

وہ کمرے سے باہر نکلنے لگی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جہاں داد نے اس کی ساڑی کا پلو پکڑ لیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ خود بری طرح سے لڑکھڑایا۔ اور اگلے ہی لمحہ کسی شکستہ دیوار کی طرح بستر پہ ڈھیر ہو گیا۔

جیسے کوئی بلائے ناگہانی ٹل گئی ہو۔

کچھ اسی کیفیت میں ذوباریہ نے اس کے مدہوش وجود کو دیکھا۔ پھر بڑی احتیاط سے اس کا بازو اپنی گردن پہ سے ہٹا دیا اور سیدھی ہو بیٹھی۔

وہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اور وہ درز دیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور پھر نہ جانے کتنے ہی لمحے اس نے چپ چاپ آنسو بہاتے گزار دیئے۔

''یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔'' اس نے قابل رحم نگاہ اس کے وجود پہ ڈالی۔

معاشرے کا ایک مہذب اور ذمہ دار شخص۔ اس نے تلخی سے سوچا۔

''اس طرح آپ کسے اذیت پہنچا رہے ہیں سر! مجھے یا خود کو؟''

وہ متاسف انداز میں اس کے وجود پہ کمبل ڈال کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ واش بیسن پہ جھکا کھڑا تھا۔

کئی قے کر لینے کے بعد بھی، طبیعت کی متلی اور دماغ کی چکراہٹ رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

سراب بھی بری طرح چکرا رہا تھا۔ جیسے۔ ریل گاڑی سے ابھی ابھی اتر کر کھڑا ہوا ہو۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے تولیہ سے ہاتھ منہ پونچھا۔

شرٹ اتار کر پھینک دی۔ جس میں سے غلاظت کی بو آ رہی تھی۔ دوسری شرٹ بدلنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ کہ اسی اثناء میں فون کی بیل بج اٹھی۔

چند ثانیے اس نے فون کی گھنٹی پہ غور کیا۔ پھر باہر نکل کر فون اٹھا لیا۔

دوسری طرف ورشہ تھی۔

جہاں داد کو بہ وقت تمام خود کو حاضر کرنا پڑا۔ ورشہ نے لمبی چوڑی بات نہیں کی۔ مختصر حال احوال کے بعد ذوباریہ کا پوچھنے لگی۔

اسے خود پتا نہیں تھا کہ ذوباریہ کہاں ہے۔ ساری رات اتنا بے خبر رہا تھا۔

اسے یہ تک معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے گھر میں بھی ہے یا نہیں۔ اسے ہولڈ کرنے کا کہہ کر وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پہ کمبل میں لپٹی سمٹی ہوئی ملی۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس نے اس طرح کمبل تان رکھا تھا۔ جہاں داد کو چند لمحے رک کر سوچنا پڑا کہ وہ کس طرح سے کمبل ہٹائے جو اس کے چہرے کے درشن ہوں۔ پھر اس نے جھنجھلا کر ایک طرف سے کمبل ہٹا دیا۔ صبح کی روشنی کی طرح اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے روشن تھا۔ جہاں داد ٹھٹک گیا۔ اور چند ثانیے ساکت کھڑا اس کے مدہوش حسن کو دیکھتا رہا اور پھر جیسے خود بخود اس کی نگاہیں اس کے حسن سے الجھ کر رہ گئیں۔

سوئی ہوئی عورت بند کتاب کی طرح ہوتی ہے جو تجسس ابھارتی ہے۔

سو اس وقت وہ اسے کسی حسین راز کی طرح لگی پوشیدہ، چھپی ہوئی، معصوم اور پاکیزہ...... پھر نہ جانے اس پہ کس قسم کے احساسات غالب ہونے لگے۔ اس نے سر جھٹک دیا۔ اور دوسرے ہی لمحے۔ وہ جگانے کی غرض سے اس پہ جھکا اور اس کا گال تھپتھپا دیا۔

ذوباریہ نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں اور پھر اسے خود پہ جھکا پا کر اس کی چیخ نکل گئی۔

اس کا ردعمل اس قدر بے ساختہ اور فوری تھا کہ جہاں داد خود اس کی چیخ سے ڈر گیا۔ ڈر گیا کیا۔ بلکہ ہوش میں آ گیا۔

''واٹ نان سینس۔'' اگلے ہی پل اس کی پیشانی پہ ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔ ذوباریہ سکڑ سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''ورشہ کا فون ہے، جا کر سن لو۔'' بے لچک انداز میں کہتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔

ذوباریہ فون کی اطلاع پہ بستر سے اٹھ گئی۔ لیکن اس کا دل ابھی بھی تیز تیز دھڑک رہا تھا۔

جاتے جاتے ذوباریہ نے ایک بار پھر مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ نیلی پتلون پہ بنا شرٹ کے اس سخت سردی میں وہ کس طرح دندناتا پھر رہا

تھا۔ لاحول ولا انسان ہے یا کوئی پتھر، اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ جو انسان احساسات سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔ کیا ان پہ موسم بھی اثر انداز ہونا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ فون سننے کمرے میں چلی گئی۔

ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھی کہ جہاں داد واپس کمرے میں آ گیا۔ وارڈ روب کھولی، اپنے کپڑے نکالے۔ پھر باتھ روم میں گھس گیا۔

ذوباریہ ورشہ کا پیغام ریسیور کر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ابھی وہ منہ ہاتھ دھو رہی تھی کہ صفدر آ گیا۔ سلام جھاڑنے کے بعد وہ اپنے معمول کے کاموں میں لگ گیا۔ وہ کچن میں آ گئی۔

''کیا ناشتا کریں گی بی بی جی آپ؟'' وہ سب کام چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔

''ناشتا'' ذوباریہ کو سوچنا پڑا کہ وہ کیا ناشتا کرے۔ ''ایسا کرو۔ ایک کپ اچھی سی چائے بنا دو۔ بنانی آتی ہے؟''

''کیوں نہیں جی۔''

''مگر تمہارے صاحب تو چائے نہیں پیتے؟''

''پر میں تو پیتا ہوں جی۔''

''اچھا۔ چلو پھر بناؤ۔'' وہ اخبار کھول کر وہیں بیٹھ گئی۔

''آپ ناشتا کیا کریں گی بی بی جی؟ میرا مطلب ہے مجھے بتا دیجئے گا، میں لے آؤں گا۔'' وہ چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے بولا، ذوباریہ نے چائے اس کا ہاتھ سے لے لی۔

پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''تمہارے صاحب کس چیز کا ناشتا کرتے ہیں؟''

''وہ تو جی بہت کچھ کھاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے روزانہ کوئی ایک چیز کا ناشتہ نہیں کرتے۔''

''میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی کون سی چیز بناؤں، جو تمہارے صاحب شوق سے کھانا پسند کریں۔''

''وہ تو جی ہر چیز شوق سے کھا لیتے ہیں۔ سوائے چائے کے۔'' صفدر دانت نکوستے ہوئے بولا۔

''شاید یہی سچ ہے۔'' ذوباریہ تلخی سے ہنسی۔

''ٹھیک ہے، تم ایک تازہ ڈبل روٹی اور انڈے لے آؤ'' اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ صفدر نے حکم کی تعمیل کی۔

تقریباً دو گھنٹے ہو گئے تھے اور وہ ابھی تک کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ اسے عجیب سا لگنے لگا۔

''چھٹی کا دن ہے۔ صاحب جی دیر تک سونے کے عادی ہیں۔'' صفدر نے اس کی پریشانی سمجھتے ہوئے اطلاع پہنچائی۔ لیکن جس وقت وہ فون پہ بات کر رہی تھی۔ وہ نہانے گیا تھا۔ اس نے دماغ پہ زور ڈالا۔ پھر جھنجھلا کر بولی۔

''صفدر! کمرے میں جھانک کر دیکھو۔ تمہارے صاحب کیا کر رہے ہیں؟''

صفدر کمرے میں جھانک کر آ گیا۔ ''بی بی جی، وہ سو رہے ہیں۔''

''حیرت کی بات ہے۔ کوئی نہا کر دوبارہ بھی سو جاتا ہے۔'' پھر وہ اس کے بغیر ہی ناشتا کرنے لگی۔

تھوڑی دیر میں جہاں داد کی آواز آئی۔ وہ صفدر کو پکار رہا تھا۔ صفدر الٹے پیروں لپکا۔ ذوباریہ نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

وہ اسے کسی دوا کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ میڈیکل اسٹور سے خرید لائے۔

صفدر بازار چلا گیا۔ وہ کچن میں بیٹھی پریشان ہوتی رہی۔ جب تک وہ بازار سے نہیں آ گیا۔ اس کی پریشانی دور نہیں ہوئی۔ صفدر اسے دوا اور پانی دے آیا تھا۔

''بغیر ناشتے کے ہی تم نے اپنے صاحب کو دوا دے دی؟''

''وہ جی۔ میں نے پوچھا تھا۔ کہنے لگے۔ جب ضرورت ہوگی لے لوں گا۔ ابھی فی الحال دوا دے دو۔''

ذوباریہ اور بھی پریشان ہوگئی۔ ''کیا بخار وغیرہ ہے انہیں؟''

صفدر نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔

''آپ کو نہیں پتا جی؟'' دوسرے ہی پل ذوباریہ شرمندہ ہوگئی۔

(ملازم کیا محسوس کرے گا۔ دو دن کے میاں بیوی اور اتنی لاتعلقی)

''وہ تمہارے صاحب ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے ناں۔ میں اس لیے کہہ رہی تھی۔ خود بخود دوا تجویز کر لینا تو اچھا نہیں ہوتا ناں۔'' ذوباریہ کھسیا کر بولی۔

پھر کہنے لگی۔ ''صاحب سے پوچھ کر آؤ۔ زیادہ طبیعت خراب ہے تو ڈاکٹر کو بلاؤں؟''

صفدر پیغام لے کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں اترے چہرے کے ساتھ باہر آیا۔

''وہ جی۔ صاحب مجھ پہ بگڑ پڑے ہیں کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ اور اب میرے کمرے میں بھی مت آنا۔''

لگتا تھا، بے چارہ اچھی خاصی ڈانٹ سن کر آیا ہے۔ ذوباریہ خاموشی سے کچن سے باہر نکل گئی۔

صفدر گھر کے کام کاج کرتا رہا۔ کچھ دیر تک ٹی وی چلا کر یونہی بیٹھی رہی۔ پھر اسے میوزک سننے کا خیال آیا تو ٹیپ ریکارڈ تلاش کرنے لگی۔

ٹیپ یا ڈیک نما چیز اسے کہیں دکھائی نہیں دی۔ تو اس نے صفدر کو آواز دی۔ صفدر لپک کر دوڑ آیا۔

''سنو، تمہارے صاحب گانے وانے نہیں سنتے؟'' اس نے سخت بوریت سے پوچھا۔ اسی اثناء میں اس کی نگاہ جہاں داد پر پڑی۔

وہ قمیص کے بٹن بند کرتا ہوا کوریڈور سے باہر نکلا تھا۔

''سنتے ہیں جی۔ مگر اپنے کمرے میں۔'' صفدر کی چونکہ اس طرف سے پشت تھی اس لیے اسے معلوم نہیں ہو سکا کہ جہاں داد اس کے پیچھے

سے گزر کر باہر نکل گیا ہے۔

''اچھا!'' ذوباریہ چپ ہو گئی۔

''بی بی جی! آپ کے جہیز میں تو ٹیپ ریکارڈ ہو گا'' ذوباریہ نے چونک کر صفدر کی طرف دیکھا۔

''مطلب آپ شوقین لگتی ہیں۔ اس لیے پوچھ رہا تھا''

''ہاں ٹیپ رکارڈ تو ہے اور بہت اچھا ہے لیکن سب ہی کچھ ابھی ادھر ہی رکھا ہوا ہے۔ ادھر کچھ بھی شفٹ نہیں ہوا۔ شادی جلدی ہوئی تھی ناں۔ اس لیے۔

رفتہ رفتہ سارا سامان ادھر ہی آجائے گا۔ لیکن تب تک تمہارے صاحب کی چیزوں سے ہی گزارہ کرنا ہے۔ اس نے ہنس کر سادے سے لہجے میں کہا۔ صفدر مسکرا کر کچن میں واپس چلا گیا۔

سارا دن ہو گیا تھا اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

ذوباریہ کا انتظار کر کے برا حال تھا۔ ورشہ کے تین فون آچکے تھے۔ اس نے رات کے کھانے پہ انوائیٹ کیا تھا۔ لیکن اس کا اصرار یہ تھا کہ وہ جلدی پہنچ جائے جبکہ ذوباریہ نے ابھی تک جہاں داد کو مطلع بھی نہیں کیا تھا کہ وہ رات کھانے پہ مدعو ہے۔ صبح چونکہ وہ سو رہا تھا۔

پھر طبیعت کی ناسازی کا اسے پتا چلا تھا اور اب تو حد یہ تھی کہ وہ جب سے گیا، لوٹا ہی نہیں تھا۔

مغرب کی اذانیں ہو کر بھی کافی دیر ہو چکی تھی۔ تب وہ گھر میں داخل ہوا، صد شکر کہ صورت تو نظر آئی۔ ذوباریہ نے اسے دیکھ کر دل ہی دل میں سوچا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ رسالہ رکھ کر سوچنے لگی کہ اب جا کر اس سے بات کرنی چاہیے۔

اگر اس نے انکار کر دیا تو وہ ورشہ کو روک دے گی۔ اور اگر ہامی بھر لی تو تیاری شروع کر دے گی، تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہ سر پہ رومال باندھے جاءِ نماز پہ کھڑا تھا شاید مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا۔ وہ اسے نماز کی حالت میں کھڑا دیکھ کر گنگ رہ گئی۔

کس قدر تعظیم سے وہ اپنے رب کے سامنے عجز و انکساری سے کھڑا تھا۔ کتنا ادب اور لحاظ تھا اس کے ایک ایک انداز میں۔ پھر وہ رکوع میں گیا۔ پھر سجدے میں۔

جب وہ سجدے سے دوبارہ اٹھا تو ذوباریہ کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ کتنی عقیدت سے نماز کا ایک ایک رکن ادا کر رہا تھا۔ اس نماز کا حسن اس کے چہرے بلکہ پورے ماحول پہ چھا گیا تھا۔

وہ تو ایک وقت کی نماز ادا نہیں کرتی۔ اسے بے حد ندامت محسوس ہوئی۔

لیکن دوسرے ہی پل شیطان نے اسے مطمئن کر دیا۔ اور دلیل بھی ایسی یاد دلائی کہ وہ خود بخود اپنے آپ کو اس سے زیادہ پاک اور معتبر سمجھنے لگی۔

تین انسانوں کی نماز تو کسی بھی حالت میں قبول ہی نہیں ہوتی۔ (اور ان میں سے ایک شرابی ہے) اور ان میں سے ایک جہاں داد ملک

آپ جیسا شخص ہے۔

وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ اور اس کی فراغت کا انتظار کرنے لگی۔

جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا بالوں میں برش پھیر رہا تھا۔

''ورشہ کا فون آیا تھا'' اس نے ذرا توقف سے کہا۔

جہاں داد کے ہاتھ رک کے پھر اپنا کام کرنے لگے۔

''آپ کو اور مجھے رات کو کھانے پہ انوائیٹ کیا ہے۔ اس نے صبح ہی مجھے پیغام دے دیا تھا۔ لیکن آپ کی مصروفیت اتنی تھی کہ مجھے پیغام......''

''تم جانا چاہتی ہو؟'' جہاں داد نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہاں۔ مگر کیا آپ نہیں چلیں گے؟'' وہ تیزی سے بولی۔

''نہیں۔'' ......وہ بھی تیزی سے بولا۔

ذوباریہ چند ثانیے کھڑی رہی۔ ''کیوں؟''

''میں تمہیں جواب دینے کا مجاز نہیں ہوں۔''

(مائی گاڈ۔ اس شخص نے ابھی نماز پڑھی ہے۔ لیکن فرعونیت جوں کی توں قائم ہے)

''ڈرائیور کو فون کر دیں، تمہارا ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔''

''اگر میں آپ کے ساتھ چلنا چاہوں تو؟''

''میرا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ برش پھینک کر سکون سے بستر میں گھس گیا۔ ذوباریہ سلگ کر رہ گئی۔

''تو پھر کس قسم کا رشتہ ہے ہمارا؟''

ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔

جہاں داد نے کمبل سر تک تان لیا۔ ذوباریہ کو اپنی بے وقعتی پہ رونا آ گیا۔ لیکن چونکہ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ روئے گی نہیں، کم از کم اس کے سامنے تو بالکل نہیں۔ اس لیے وہ بنا بولے ہی کمرے سے نکل گئی۔

اور پھر اس نے ورشہ کے ہاں اکیلے ہی جانے کا ارادہ کر لیا۔

وہ یہاں سے اس قدر مایوس ہو کر جا رہی تھی کہ دوبارہ آنے کے اس میں رتی بھر بھی خواہش نہیں تھی۔

وہاں جا کر سب لوگوں کو مطمئن کرنا اس کے لیے پل صراط سے کم نہیں تھا، لیکن پھر بھی وہ چلی گئی۔

ورشہ کے گھر والے ان دونوں کے انتظار میں تھے۔ لیکن اسے اکیلا دیکھ کر تقریباً سب ہی کو مایوسی اور حیرانی ہوئی۔ اور اسے جھوٹ موٹ

جواز گھڑنا پڑا کہ وہ اچانک کام کے سلسلے میں شہر سے باہر چلے گئے ہیں اس لیے مجھے اکیلے آنا پڑا۔
ورشہ سمجھ گئی تھی کہ یہ جھوٹ ہے لیکن باقی سب مطمئن ہو گئے۔

رات کھانے کے بعد اس نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ایک رات اور پورا دن بالکل پر لگا کر اڑ گیا۔

اگلے روز شام کو پاپا کا فون آ گیا۔ وہ بے حد پریشان تھے۔ ان کا فون سن کر اس کے خود ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

انہوں نے بتایا کہ جہاں داد کی طبیعت بہت خراب ہے۔

''صفدر کا فون شام کو ہی آیا تھا میرے پاس۔ تب سے اب تک میں یہیں ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔
''مگر انہیں ہوا کیا ہے؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ فوڈ پوائزن ہے۔ یا اس نے کوئی زہریلی نشہ آور چیز کھالی ہے۔''
وہ فکر مندی سے بتا رہے تھے۔

ذوباریہ کے سر پہ دھما کا ہوا۔
وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باپ پہ یہ راز کھلے۔
''نہیں پاپا! بھلا وہ کیا کھا سکتے ہیں۔ شاید فوڈ پوائزن ہوا ہے۔ کل تک تو ٹھیک ہی تھے۔''
''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ بہر حال تم فکر نہیں کرنا۔ ڈرائیور کے ساتھ ابھی گھر آ جاؤ۔''

''میں آ رہی ہوں پاپا!''
اور جب وہ گھر آئی تو وہ کمبل اس کے جسم پہ ڈالے ہوئے تھے اور وہ مدہوش پڑا تھا۔
ایک ہاتھ میں ڈرپ کی سوئی لگی ہوئی تھی۔ دوسرے ہاتھ کی نبض ڈاکٹر چیک کر رہا تھا۔ پاپا اس کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ صفدر ہراساں و پریشان کھڑا تھا۔

اس نے بوکھلا کر پاپا کی طرف دیکھا۔ فائق احمد نے اسے پیار کر کے اپنے پاس بٹھا لیا۔
چند ثانیے وہ باپ سے چمٹی خوفزدہ سی یونہی بیٹھی رہی۔ جیسے اس کی سب سے مہنگی، سب سے پسندیدہ چیز کو خود اسی سے نقصان پہنچ گیا ہو۔
''اچھا فائق صاحب! مجھے اجازت دیجئے۔ یہ ڈراپ ایک گھنٹے تک مکمل ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی ٹمپریچر بھی اب آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہے۔ ڈرپ کے بعد آپ انہیں ہر چار چار گھنٹے کے بعد دوا دیتے رہیے گا۔''
ذوباریہ تیزی سے اس کے قریب آ گئی۔

اس نے پیشانی کو ہاتھ لگایا۔ وہ انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔
اور اگر بخار زیادہ تیز ہونے لگے تو آپ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے رہیئے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے مزید کہا۔
فائق احمد ساتھ ساتھ اسے باہر تک چھوڑنے چلے گئے۔ ان کے ساتھ صفدر بھی باہر چلا گیا۔

ذوباریہ نے بے قراری سے اسے ہلایا۔

اتنا تندرست توانا وہ کس طرح بے جان سا پڑا تھا۔ بشاش چہرے پہ زردی سی کھنڈ رہی تھی۔ اسے رونا آ گیا۔

اف یہ ظالم محبت اس وقت وہ اس سے لڑ رہی تھی۔ اور آج...... آج...... یوں لگ رہا تھا جیسے وہی ہوگی۔ وہی متاع حیرت۔

اس کی بے قراری ایک ایک عمل سے عیاں ہو رہی تھی۔

فائق احمد ڈاکٹر کو رخصت کر کے کمرے میں واپس آ گئے۔ اسے تسلی تشفی دیتے رہے۔

انہیں خیال آیا تو اس کی خوراک کے بارے میں پوچھا۔

آخر اس نے کیا کھایا تھا۔ جو اچانک اتنی حالت خراب ہوئی۔ ذوباریہ کو جھوٹ بولنا پڑا۔

''کل ہم نے ہوٹل میں لنچ کیا تھا شاید وہیں کوئی چیز خراب ہوگی۔'' وہ مطمئن ہو گئے۔

اور پھر بہت دیر تک بیٹی کے پاس بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ اس کی ڈرپ خود اتاری۔ اس کی دوا کی ایک خوراک اپنے ہاتھوں سے پلائی اور جب کسی حد تک اطمینان ہو گیا تو پھر گھر گئے۔

لیکن وہ اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھی رہی۔ کبھی اس کا سر سہلاتی۔ کبھی اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم کرتی۔ بخار کی تیزی کی وجہ سے جہاں داد کے جسم میں عجیب طرح کی توڑ پھوڑ تھی۔ جب اس کا ٹمپریچر حد سے زیادہ ہوا تو اس نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنا شروع کر دیں۔ مگر اس کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب جہاں داد کی حالت بگڑنے لگی۔ کاش وہ صفدر کو آج یہیں روک لیتی۔ وہ اپنا سر کبھی تکیہ پر ادھر پٹختا اور کبھی ادھر۔

بخار کی شدت کی وجہ سے بے قراری ایسی تھی کہ اسے ایک پل چین نہیں آتا تھا۔ ادھر دوا کا وقت ہو چکا تھا۔

وہ اس کی بے چینی کی وجہ سے پریشان تھی کہ اسے کس طرح دوا پلائے۔ آیا اس کا سر سہلاتی رہے۔ اس کی پیشانی پہ پٹیاں بدل بدل کر رکھتی رہے۔ یا اس کے کھلانے پلانے کے بارے میں سوچے۔ ایک لمحہ بھی وہ اپنی پیشانی پہ اس کا ہاتھ ہٹنے نہیں دیتا تھا۔ بدقت تمام اس نے اسے دوا پلائی پھر آہستہ آہستہ اسکا سر دباتی رہی۔ جب اسے کسی پل چین نہیں آیا تو بے چین ہو کر اس نے ذوباریہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کبھی اس کے نرم گداز ٹھنڈے ہاتھ کو اپنی آنکھوں پہ رکھتا، کبھی پیشانی پہ۔ کبھی سینے پہ۔ اور پھر اسے اپنے ہونٹوں پہ رکھ لیا۔ ذوباریہ کو لگا جیسے اس کی زخمی ہتھیلی پہ دو مہربان ہونٹوں نے مرہم رکھ دیا ہو۔ وہ ساکت وصامت بیٹھی رہی۔

کیا قیامت تھی۔ اس کا سر اس کی گود میں تھا۔ لیکن وہ اپنی مسیحائی کے لمس سے بالکل ناواقف تھا۔ جب اس نے زخم دیا تھا تب بھی وہ بے ہوش تھا۔ اور اب مرہم رکھ دیا تھا، تب بھی بے ہوش تھا۔ روح کی جلن آنکھوں میں تیر گئی۔ اور دو موتی پلکوں سے ٹوٹ کر اس کے سینے میں جذب ہو گئے۔

اس نے ایک پل بھی نیند سے آنکھ نہ ملائی۔ دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔

تب اس نے بڑی احتیاط سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔ پھر اسی احتیاط و محبت سے اس کا سر تکیہ پہ رکھ دیا۔ اور اس پہ اچھی طرح کمبل پھیلا دیا۔ اس سارے عمل میں وہ بے خبر ہی تو تھا۔

ذوباریہ کا دل شدت سے چاہا۔ کاش وہ اس کی محبت کو محسوس کر سکتا۔ وہ اس کے بستر سے اتر کر نیچے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ پھر حسرت سے ٹھوڑی اس کے بستر پہ ٹکا لی۔

''پلیز سر! اٹھ جائیے۔ آپ یوں سوئے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ آپ تو بس لڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ نفرت کرتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ قہر ڈھاتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ پلیز سر! پلیز۔'' وہ اس کی لمبی لمبی پلکوں کو تکتے تکتے نجانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

جہاں داد کو پیاس کا احساس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول کر دائیں بائیں دیکھا۔ اور پھر جیسے ٹھٹھک گیا۔ وہ اس کے قریب ہی بستر پہ اپنا سر رکھے بیٹھے بیٹھے سو رہی تھی۔ اس نے سوچا اس سے پانی مانگے لیکن نہیں اس نے خود ہی آہستگی سے مڑ کر ٹیبل کی طرف دیکھا۔

قریب ہی گلاس میں پانی رکھا تھا، وہ ذرا سا کھسک کر نیم دراز ہوا، پھر ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس اٹھا لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ لیکن اندر کی آگ تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے نڈھال سے انداز میں گلاس میز پہ رکھ دیا۔ فضا میں ارتعاش پیدا ہوا، ذوباریہ چونک کر اٹھ گئی۔ وہ بستر میں واپس گھس رہا تھا۔

ذوباریہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

پھر اپنی ہتھیلی اس کی پیشانی پہ رکھ کر بخار چیک کرنے لگی۔ حالانکہ وہ جاگ رہا تھا لیکن آنکھیں بند کیے پڑا رہا، اور اسے اپنے جاگنے کا احساس ہونے نہیں دیا۔ ذوباریہ کو اس بات کا گہرا دکھ ہوا لیکن پھر بھی وہ مطمئن سے انداز میں کمرے سے باہر نکل گئی، اگلے ہی پل فائق احمد ڈاکٹر کے ہمراہ چلے آئے۔ اس نے ناشتا بنا کر صفدر کے ہاتھ اندر بھیج دیا۔

پاپا اور ڈاکٹر کے شدید اصرار پہ اس نے معمولی ناشتا کیا تھا لیکن باقی ناشتا ویسے کا ویسا باہر آ گیا۔ اس کی کمزوری محسوس کرتے ہوئے ڈاکٹر نے ایک ڈرپ اس کے اور لگا دی۔

دن بھر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ورشہ کے گھر والے آ کر چلے گئے لیکن ورشہ شام تک اس کے پاس رہی اور پھر وہ بھی چلی گئی۔ شام کو پاپا پھر اس سے ملنے کے لیے آئے۔ اب اس کی طبیعت کافی بہتر ہو چکی تھی۔

پاپا نے اسے سختی سے منع کیا تھا کہ وہ سگریٹ ہرگز نہیں پئے گا اور ذوباریہ کو تلقین کی تھی کہ اس کی خوراک کا خاص خیال رکھے۔

پاپا کے چلے جانے کے بعد جب وہ اس کے پاس آئی۔ تو دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے وہ بستر سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اور مسلسل چھت کو گھور رہا تھا۔ ذوباریہ کو اسے دیکھ کر پریشانی ہوئی تو یہ کہ اس کے ہونٹوں پہ سگریٹ سلگ رہا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اور ہاتھ بڑھا کر سگریٹ اس کے منہ سے نکال کر دور پھینک دیا۔

جہاں داد نے اس کی طرف ناگواری سے دیکھا۔ اس کی اتنی جرات۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

''بدتمیزی نہیں نقصان دہ ہے۔'' وہ سکون سے نزدیک ہی پڑی سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر اٹھانے لگی۔ جہاں داد نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اور سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیے۔

''یہ آپ کی صحت کے لیے مضر ہے۔'' وہ رسان سے بولی۔

''میں اپنے معاملات میں تمہاری اتنی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔''

''پلیز۔'' ذوباریہ کا دل پارہ پارہ ہو گیا، پھر وہ اپنے آنسو اندر ہی اندر پیتے ہوئے بولی۔ ''کیوں کرتے ہیں آپ ایسا؟'' ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ کچھ دیر چپ رہی۔ ''اچھا اب آپ کیا کھائیں گے؟'' اس نے اپنا لہجہ بشاش کیا۔

''زہر'' لٹھ مار جواب ملا۔

''وہ تو آپ نے جتنا پینا تھا پی لیا۔ اب مزید نہیں۔''

''آئی سے گیٹ لاسٹ۔'' وہ اکتا کر بولا۔

دوسرے ہی پل ذوباریہ نے ہمت کر کے اس کے ہاتھ سے سگریٹ جھپٹ لیا۔

جہاں داد کو بری طرح طیش آیا۔ وہ اس کی طرف غضب ناک حالت میں دیکھنے لگا۔ وہ باقاعدہ مسکرا رہی تھی۔

''سمجھ لینا۔ اب تم اسے خود اپنے ہاتھوں سے مجھے پلاؤ گی۔ اور بے انتہا مجبور ہو کر۔''

''ہاں پلاؤں گی، جو کہیں گے، وہ آپ کو پلاؤں گی، مگر یہ نشہ نہیں۔ آپ کو سوپ پلاؤں گی، جوس پلاؤں گی، حتیٰ کہ اپنا لہو بھی پلاؤں گی، مگر یہ زہر نہیں پینے دوں گی آپ کو۔ نہیں پینے دوں گی۔'' اس نے ہتھیلی سے آنسو رگڑے۔ جہاں داد کے ہونٹوں پہ تلخ سا تبسم پھیل گیا۔

''جذباتی اداکاری خوب کر لیتی ہو تم۔ کاش میں داد دے سکتا۔'' ذوباریہ کے تلووں سے لگی اور سر پہ آ کر بجھی۔ ذلت کے احساس سے چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''محبت کرنا میرا قصور ٹھہرا۔ صرف محبت۔'' اس نے سگریٹ اور لائٹر اس کے بستر پہ پھینک دیا۔

(رات بھر کی کارگزاری کا اس نے یہ صلہ دیا تھا)

''مجھے آپ سے کبھی بھی صلے کی توقع نہیں۔ اور نہ ہی میں اپنی محبت کے عوض آپ سے کچھ لینا چاہتی ہوں۔ جہاں داد عجیب طریقے سے مسکرا دیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو۔ ان باتوں سے مجھے فتح کر لو گی؟''

ذوباریہ بلبلا اٹھی۔ ''یہ سگریٹ یہاں سے اٹھاؤ اور اسے لگا کر میرے منہ میں دو اسی جرات سے جس جرات سے تم نے اسے نکال کر پھینکا تھا۔'' ذوباریہ اس کی ہٹ دھرمی پہ کانپ گئی۔

''تم نے سنا نہیں میں نے کیا کہا تم سے؟''

''وہ اس کی کلائی مروڑ کر سختی سے بولا۔

''اگر میں نہ دوں تو؟'' وہ اس سے زیادہ ہٹ دھرمی پہ اتر آئی۔

''سوچ لو۔ یہ تو صرف سگریٹ ہے کہیں کچھ اور پلانا نہ پڑ جائے تمہیں۔''

ذوباریہ نے کرب سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو پھیل گئے۔

وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

''تم نے سنا نہیں۔'' وہ سخت چڑ کر بولا۔ ذوباریہ نے جھک کر بستر پہ سے لائٹر اور سگریٹ اٹھائے اور اس کی طرف بڑھا دیئے

''اس طرح نہیں۔ کھول کر میرے منہ میں دو۔'' ذوباریہ یونہی کھڑی رہی۔ وہ سخت جھنجھلا گیا۔

''تمہیں ایک بات پہلی بار میں سمجھ میں نہیں آتی۔'' اس نے جھٹکا دے کر اپنی طرف گرا لیا۔ ذوباریہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح اس پہ آ گری۔

جہاں داد نے اس کے جبڑے پکڑ کر سختی سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ ذوباریہ تکلیف کے احساس سے تڑپ اٹھی۔

سگریٹ نکال کر اس کے منہ میں دے دیا۔ جہاں داد نے اس کا چہرہ اپنی آہنی انگلیوں سے جھٹک دیا۔

''لائٹر جلاؤ۔'' وہ چپ رہی۔

''لائٹر جلاؤ۔'' وہ تقریباً چلا پڑا۔

ذوباریہ نے کسی روبوٹ کی طرح لائٹر جلایا۔ پھر اس کی آنچ کی طرف یوں دیکھنے لگی۔ جیسے وہ اسے اپنی عمر بھر کی پونجی میں آگ لگانے کا کہہ رہا ہو۔

اگلے ہی پل اس نے اس لائٹر کی لو کو اپنی مٹھی میں دبوچ لیا۔ جہاں داد ایک جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا۔

''یو نان سینس گرل۔''

اس نے بے ساختہ اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور دوسرے ہی پل اس کی مٹھی سے جلتا ہوا لائٹر نکال لیا۔ ذوباریہ کی ساری ہتھیلی جل گئی تھی۔

''یہ تم نے کیا کیا؟'' وہ پریشان بھی ہوا اور مشتعل بھی۔

جلن کے احساس سے ذوباریہ تڑپ اٹھی۔ اور اگلے ہی پل اس کے حصار سے نکل کر باہر بھاگ گئی۔

☆ ☆ ☆

''بی بی جی صاحب نے یہ برنال بھیجا ہے۔ کہا ہے اسے زخم پہ لگا لیں۔''

ذوباریہ نے گھٹنوں پہ سے سر اٹھایا۔ متورم آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ دیکھ کر صفدر حیران رہ گیا۔

''لگتا ہے بی بی جی۔ آپ کو زخم زیادہ آیا ہے۔

''لائیے، میں آپ کے زخم پہ مرہم لگا دوں۔'' وہ اپنائیت سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ (تمہارے صاحب نے اتنے زخم دیئے ہیں صفدر...... کس کس زخم پہ مرہم لگاؤ گے)

''جلتے ہوئے ہاتھ میں اتنی تکلیف تھی کہ اس نے ہتھیلی اس کے سامنے کھول دی۔

''بہت جل گیا ہے بی بی جی! کیا کر رہی تھیں آپ۔ حالانکہ کچن میں کام تو کوئی نہیں تھا۔'' وہ ہتھیلی پہ ٹیوب لگانے لگا۔

(تمہیں کیا بتاؤں صفدر۔ تمہارے صاحب سے محبت کر رہی تھی، شاید وہ شخص مٹی سے نہیں آگ سے بنا ہوا ہے۔ دہکتی ہوئی آگ سے۔ میری محبت کی پھوار بھی اسے ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔ اس سے دور رہتی ہوں تو جھلسا تا رہتا ہے۔ قریب جاتی ہوں تو بھسم کر دیتا ہے۔ اس کی نفرت میں اتنی طاقت ہے۔ میری محبت میں کیوں نہیں؟)

آرام سے لیٹ جایئے بی بی جی! اب آپ کو یقیناً سکون آ جائے گا۔

(آہ۔ میری زندگی میں سکون کہاں) ذوبار یہ سرد آہ کھینچ کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز شام کو فائق احمد آفس ٹائم کے بعد ادھر ہی چلے آئے۔

''اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ انہوں نے اسے لیٹا دیکھ کر پوچھا۔

''بالکل ٹھیک۔ بس ایسے ہی سستا رہا تھا۔ آیئے بیٹھیے۔'' وہ انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا اور بشاش لہجے میں بولا۔

''ذوباریہ بہت پریشان رہی ہے تمہاری بیماری کے دوران۔ ذرا سی شکل نکل آئی ہے اس کی۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

جہاں داد نے کن انکھیوں اسے سر کے چہرے کا جائزہ لیا۔

''آپ ذوباریہ سے مل لیے؟'' اس کی آواز دھیمی تھی۔

''ہاں بھئی۔ میں ابھی سے یہی سمجھا رہا تھا، رونے یا فکر مند ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ معمولی بخار ہی تو ہے مگر بس......'' وہ گہرا سانس لے کر رہ گئے۔

''بے حد حساس لڑکی ہے۔ میں بیمار ہو جاتا تو بری طرح پریشان ہو جاتی تھی۔''

پھر وہ ہلکا سا مسکرا دیے۔

''کسی کو تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی اتنا سا دل ہے اس کا، لیکن اس کے باوجود خود بڑی سے بڑی تکلیف سہہ جانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اس نے ہی اپنی پریشانیوں میں مجھے پریشان کیا ہے۔'' ان کے چہرے پر تفاخر جھلکنے لگا۔

''حالانکہ اکلوتا بچہ زیادہ پریشان کرتا ہے۔ مگر ذوباریہ نے مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اکیلی ہے اور میں اسے زیادہ توجہ اور زیادہ وقت دوں۔''

جہاں داد اس کی ذات کے بارے میں انکشاف بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔

اگلے ہی پل فائق احمد مسکرا دیئے۔

''لو میں کیا باتیں لے بیٹھا۔ میں یہ کہنے آیا تھا بیٹے! اپنی بیماری کی اطلاع اپنے گھر دیدیتے۔ وہ لوگ بھی آجاتے یا اطلاع دے دی؟''

''نہیں اطلاع تو نہیں دی۔''

فائق احمد نے استفہامیہ نگاہ اس پہ ڈالی۔

''شادی میں بھی وہ لوگ سرسری سے انداز میں شامل ہوئے تھے، کہیں کوئی......؟'' ان کا اندیشہ خود ان کی زبان پہ آ گیا۔ جہاں داد کا دل چاہا۔ کہے ہاں۔ ایسا ہی کچھ ہے۔ جان بوجھ کر انجان تو نہ بنیے۔ لیکن اس نے صبر وضبط سے کام لیا اور مسکرا کر بولا۔

''میں نے ان لوگوں کو اس لیے پریشان نہیں کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ ہم لوگ خود وہاں جائیں۔''

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ آب وہوا بھی تبدیل ہو جائے گی اور وہ لوگ بھی خوش ہوں گے۔ پھر کب تک ارادہ ہے جانے کا۔''

''دیکھیے کل صبح یا کل شام تک۔''

''ٹھیک ہے، پھر تم لوگ جانے کی تیاری کرو۔ میں بھی چلتا ہوں۔''

''آپ کچھ دیر تو بیٹھتے۔''

''نہیں۔ بس چلوں گا۔ ویسے بھی دن بھر کا تھکا ہوا ہوں۔ بس تم جلد از جلد ٹھیک ہو جاؤ۔ آفس کے کام بھی ادھورے پڑے ہیں۔''

انہوں نے اس کے شانے پہ اپنائیت سے دباؤ ڈالا۔ پھر مصافحہ کر کے کمرے سے نکل گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد جہاں داد بہت دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کل شام سے اب تک وہ اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی۔ نجانے اس کا زخم کیسا ہے، وہ ساتھ چل بھی سکتی ہے یا نہیں۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ اور صفدر ڈرائینگ روم میں ٹی وی پہ کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ ذوباریہ بڑے اطمینان سے کمبل میں لپٹی سمٹی صوفے پہ نیم دراز تھی۔ صفدر اپنی گرم چادر میں لپٹا ہوا کارپٹ پہ بیٹھا تھا۔ اور بڑے انہماک سے اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ ڈرائنگ روم کے وسط میں پہنچ گیا۔ اور ہمیشہ کی طرح ٹی وی کے رسیا صفدر کی محویت نہیں ٹوٹی، جبکہ ذوباریہ نے پہ ایک نگاہ ڈال کر دوبارہ سکرین پہ نگاہ جمالی تھی۔

وہ کچھ متذبذب سا کھڑا رہا۔ پھر صفدر کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

''ذوباریہ آپ ذرا کمرے میں آئیں۔''

ذوباریہ اس کے انداز پہ بڑی حیران ہوئی۔

دوسرے ہی پل وہ پلٹ گیا۔ ذوباریہ کچھ سوچتے ہوئے کمبل سے آزاد ہوئی۔ پھر اسکے پیچھے پیچھے آگئی۔ وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ دروازے میں رک گئی۔

''آؤ بیٹھو۔'' ذوباریہ نے متجسس و پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بیٹھ گئی۔

''اب تمہارا زخم کیسا ہے؟''

ذوباریہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے بے پناہ خوش فہمی سے سر اٹھایا۔ لیکن وہ اتنی خوش قسمت کہاں تھی۔ اس کے سرد سپاٹ تاثرات پہ اس کے تمام تر احساسات لمحوں میں منجمد ہو گئے۔ نہ جانے اس کے کیا عزائم تھے۔

''کون سا زخم؟'' وہ فرش کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ جہاں داد نے بے انتہا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ نظریں چرا کر بولا۔

''ہم لوگ صبح یہاں سے گاؤں جا رہے ہیں۔ تم اپنی تیاری کر لینا۔ میرا مطلب ہے دو چار سوٹ لے لینا۔''

پھر اس نے اس کے سراپے پہ ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ ہمیشہ کی طرح وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس بڑی سی جیکٹ چڑھائے الٹرا ماڈرن لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

''تمہارے پاس قمیص شلوار کا لباس نہیں ہے؟'' ذوباریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اس طرح کے لباس شہر میں پسندیدگی کی سند پا سکتے ہیں۔ لیکن گاؤں میں یہ لباس بے حیائی کا درجہ رکھتا ہے۔ ویسے بھی تم پنجابی فلمیں

دیکھتی ہو۔ تھوڑی بہت کلچر کی پہچان تو ہو گی تمہیں۔''

ذوبار یہ اس کے کاٹ دار لہجے پہ دل ہی دل میں غصے کے گھونٹ پیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

یہ بات تو اسے صبح ہی پتا چلی تھی کہ صفدر بھی ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ چلو یہ بھی خوب ہوا، راستہ اچھا کٹ جائے گا۔ صفدر کا باتونی پن اسے اول روز سے ہی اچھا لگا تھا۔

ڈگی میں سامان ڈال کر وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ صفدر پیچھے بیٹھنا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے پہلے پیچھے بیٹھ گئی۔

''بی بی جی! آپ آگے آئیں ناں۔'' وہ آگے بیٹھتے ہوئے جھجکا جہاں داد ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔

''نہیں پلیز، مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں لیٹنا چاہوں گی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے گاڑی کا دروازہ بند کر لیا۔

صفدر آگے بیٹھ گیا۔ جہاداد نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

چونکہ اسے صبح جلدی اٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے وہ جلدی ہی سو گئی۔

جہاں داد اور صفدر کا تمام سفر باتوں میں گزر گیا۔

''بی بی جی۔ اٹھ جایئے۔ گاؤں آ گیا ہے''

''لاحول ولا'' صفدر کی پاٹ دار آواز پہ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

جس وقت وہ گھر سے نکلے تھے صبح طلوع ہو رہی تھی۔ لیکن اب آفتاب پوری طرح پھیل چکا تھا۔ گاؤں کا وہی روایتی ماحول، کچی پکی گلیاں۔ اونچے نیچے مکان۔ ننگ دھڑنگ بچے۔ اس نے وقت دیکھا۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ جہاں داد نے گاڑی احتیاط سے ایک طرف کھڑی کر دی۔ صفدر نے دروازہ کھولا۔ وہ باہر نکل آئی۔

نیند سے بیدار ہوتے ہی تیز چمک دار دھوپ اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی۔

اس نے پرس کھول کر فوراً ہی سن گلاسز چڑھا لیے۔

پھر جہاں داد کی رہنمائی میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ سر پہ سامان لادے صفدر بھی چل رہا تھا۔

اماں جی اچانک اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اور پھر جب دیکھا، وہ بھی ساتھ آئی ہے۔ تو ان کی خوشی میں عجیب جوش و خروش بھی شامل ہو گیا۔

''زہرہ! زہرہ! دیکھ تو کون آیا ہے۔''

انہوں نے شور مچا دیا۔ وہ اپنی ماں سے ملا۔ ذوباریہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

''تو دور کیوں کھڑی ہے بہو رانی۔'' اماں جی نے دوسری طرف سے بہو کو لپٹا لیا۔ اور دعاؤں سے نوازنے لگیں۔

''اماں جی۔ میں بھی ہوں۔'' صفدر نے ہاتھ اٹھا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔

''دیکھ رہی ہوں۔ دیکھ رہی ہوں۔ بہورانی آئی ہے پہلی بار میرے گھر۔ اسے تو دیکھ لوں۔'' اماں جی اس کی بے تابی پہ ہنس پڑیں۔ پھر اسے پیار کرنے لگیں۔

زہرہ شور شرابا سن کر کمرے سے نکل آئی۔

''سلام بھرجائی!'' جہاں داد نے زہرہ کو دیکھ کر احترام سے سلام کیا۔

زہرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی پل فخر و انبساط سے اس کا سر بلند ہو گیا۔ جیسے وہ آج سرخرو ہو گئی۔

''وعلیکم السلام۔ کیسا ہے تو؟''

''آپ لوگوں کی دعائیں ہیں۔''

''السلام علیکم۔'' ذوباریہ نزدیک آ گئی اس کا دل چاہا۔ وہ بھی اسے بھرجائی کہے، لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ زہرہ نے پیار سے اسے اپنے قریب کر لیا۔

''بابا کہاں ہیں۔'' جہاں داد کو باپ کا خیال آیا۔

''وہ نماز ادا کرنے گئے ہیں۔ تم لوگ بیٹھو۔ لمبا سفر طے کر کے آئے ہو۔ تھوڑا آرام کر لو۔''

''نہیں اماں! بہت بھوک لگی ہے۔ بس جلدی سے کھانا نکال دیں۔'' وہ منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے شرٹ کی آستینیں چڑھانے لگا۔

زہرہ اس کی بے چینی پہ مسکراتے ہوئے رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔ صفدر بھی بھوک کی شدت سے نڈھال ہوا جا رہا تھا۔ وہ بھی منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

ذوباریہ، ساس کے پاس بیٹھ گئی۔

''دھیئے، تجھے بھی بھوک لگ رہی ہو گی۔ تو بھی منہ ہاتھ دھو لے۔ زہرہ کھانا گرم کر کے لاتی ہی ہو گی۔'' ذوباریہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''غسل خانہ کدھر ہے اماں جی؟''

''ادھر۔ سامنے ہے پتر۔'' اماں جی نے اشارہ کر دیا۔

ذوباریہ اندر چلی گئی۔

کھانے کے بعد جہاں داد کو سخت نیند آنے لگی۔ اور سونے کی خواہش شدید تر ہو گئی۔

''جا پتر! جا کر سو جا۔ باتیں ہوتی رہیں گی۔ لگتا ہے تو کافی تھکا ہوا ہے۔''

اکبر ملک نے بیٹے کی تھکاوٹ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ تو جہاں داد ان لوگوں کے درمیان میں سے اٹھ گیا۔

صفدر اتنا تھکا ہوا تھا کہ وہیں سو گیا۔

''دھیئے تو بھی جا کر اب آرام کر۔''

اکبر ملک نے بڑے پیار سے کہا۔

ذوباریہ کو ان کی محفل دلچسپ لگ رہی تھی۔

''مجھے آپ لوگوں کے پاس بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔اور ویسے بھی مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔''اس نے اپنائیت سے کہا۔

ساس، سسر اس کی ملنسار طبیعت پر وارفتہ ہو گئے۔

پھر بہت دیر تک محفل جمی رہی۔

کچھ دیر کے بعد اماں بھی لیٹ گئیں۔اکبر ملک سے کوئی ملنے آگیا۔وہ باہر چلے گئے۔

تب زہرہ اور ذوباریہ چائے کی طلب کی وجہ سے رسوئی میں آگئیں۔

''مجھے حیرانی ہوئی، آپ اتنی اچھی چائے بنا لیتی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''زہرہ آہستہ سے مسکرائی۔

''میرا خیال تھا کہ آپ لوگ بھی چائے نہیں پیتے ہوں گے۔''اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔جہاں داد چائے پسند نہیں کرتا ناں اس لیے۔کیا وہ اب بھی چائے نہیں پیتا؟''ذوباریہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

زہرہ ہنس پڑی۔''شروع سے اس کا یہی خیال ہے، چائے نہایت فضول چیز ہوتی ہے۔تب ہی تو اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔''

''اور سگریٹ کے بارے میں ان کا خیال کیا ہے؟''

ذوباریہ کی سنجیدگی پہ زہرہ چونک گئی۔پھر مسکرا کر پوچھنے لگی۔

''تمہیں سگریٹ کی خوشبو اچھی نہیں لگتی؟''ذوباریہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''تو پھر تم نے اسے روکا کیوں نہیں ابھی تک؟''زہرہ نے شرارت سے کہا۔ذوباریہ تلخی سے سر جھکا کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔

(روک کر دیکھا تھا۔بہت بڑی سزا اٹھائی ہے۔اب کبھی نہیں روکوں گی)

''ویسے یہ عادت اچھی نہیں اس کی۔تم چھڑوا دینا۔بیویاں تو نجانے کیا کیا عیب چھڑا دیتی ہیں، یہ تو پھر معمولی نشہ ہے۔''

''ہاں جب بیوی کو بیوی سمجھا جائے جب ناں!''

ذوباریہ کی چائے یکا یک زہر کی مانند ہو گئی لیکن وہ آہستہ آہستہ گھونٹ بھرتی رہی۔

زہرہ اس سے مسلسل باتیں کر رہی تھی۔

''تم بہت کم بولتی ہو، حالانکہ سنا ہے۔شہر کی لڑکیاں بہت تیز ہوتی ہیں۔''

زہرہ نے شرارت سے اسے چھیڑا تو وہ ہنس پڑی، معاً اس کی نگاہ جہاں داد پہ پڑی جو سامنے سے ادھر آرہا تھا۔اسے دیکھ کر ساری تلخی

ذوباریہ کے لبوں پہ آ گئی۔

''سنا تو یہ بھی ہے کہ گاؤں کے لوگ بہت پیار کرنے والے ہوتے ہیں۔''

وہ چلتا ہوا رسوئی کے نزدیک آ چکا تھا۔اس کے لفظوں پہ جیسے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

نجانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔

''تو کیا دیور جی تمہیں پیار نہیں کرتے؟'' زہرہ کی چونکہ اس کی طرف سے پیٹھ تھی، اپنی ترنگ میں بولی۔

اب کی بار ذوباریہ کا رنگ اڑ گیا۔اسے شاید زہرہ سے اس بے تکلفی کی امید نہیں تھی۔ پھر سامنے ہی وہ جما کھڑا تھا۔دوسرے ہی پل جہاں داد وہاں سے کھسک گیا۔

ذوباریہ اس کی بات ہنسی میں ٹال کر برتن سمیٹنے لگی۔

''نہیں رہنے دو۔ میں خود سمیٹ لوں گی۔'' زہرہ نے اسے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آئی اور شام کا کھانا بنانے تک چھوٹے موٹے کاموں میں اس کی مدد کرتی رہی۔

''تمہیں کھانا بنانا آتا ہے؟'' زہرہ نے اس کی دلچسپی بھانپتے ہوئے پوچھا۔

''گزارے لائق بنا لیتی ہوں۔'' وہ کھسیا کر بولی۔

''مثلاً کیا کیا بنا لیتی ہو؟'' زہرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''تقریباً سب ہی کچھ۔''

''کیا روٹی بالکل گول بنا لیتی ہو؟'' زہرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''بالکل، کوکنگ میں سب سے پہلے میں نے روٹی بنانا ہی سیکھا تھا۔ پاپا کا خیال تھا اگر میں نے ڈشز میں پہلے طبع آزمائی کی تو پھر روٹی کبھی اچھی نہیں پکا سکوں گی۔ پاپا کو گھر کی روٹی ہی پسند تھی۔اس لیے انہوں نے مجھے سب سے پہلے ہی روٹی پکانا سکھایا تھا۔''

''حیرت کی بات ہے تمہیں سب کچھ کرنا آتا ہے۔'' زہرہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

ذوباریہ کسی خیال کے تحت افسردہ ہوئی۔

''ہاں شاید سب ہی کچھ کرنا آتا ہے سوائے دل جیتنے کے۔''

کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی پھر کسی خیال کے تحت بولی۔

''ایک بات پوچھوں بھرجائی!'' اس نے جھجکتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ زہرہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''جہاں داد کی بھرجائی ہوں تو پھر تیری بھی بھرجائی ہوئی، اس میں شرمانے والی کون سی بات ہے۔'' ذوباریہ کو اس کے رویے سے کچھ تقویت ملی۔

''ہاں پوچھو، کیا پوچھ رہی تھیں''

''آپ کے شوہر کیسی طبیعت کے مالک تھے؟''

''بہت اچھے، بہت فراخ دل اور ٹوٹ کر محبت کرنے والے۔'' زہرہ یکا یک رنجیدہ ہوگئی۔

ذوباریہ متاثر ہوجانے والے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کتنے برس کے بعد وہ آپ سے جدا ہوئے؟''

''ابھی تو سال بھی نہیں ہوا تھا۔''

''کیا نام تھا ان کا؟'' ذوباریہ کے سوال پر زہرہ چونک گئی۔

''کیا یہ باتیں تمہیں جہاں داد نے نہیں بتائیں؟'' ذوباریہ شرمندہ ہوگئی اور بغلیں جھانکنے لگی کہ اسے کیسے مطمئن کرے۔

''سرسری سا بتایا تھا؟''

(اتنی محبت کرتا تھا وہ دلدار سے، اس کا ذکر تمہارے سامنے اتنا سرسری کیا کہ اس کا نام بھی نہیں بتایا)

زہرہ کو گہرا دھچکا لگا۔

''لگتا ہے بہت مصروف رہتے ہیں دیور جی۔''

''نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔'' ذوباریہ نے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

زہرہ اس کی کوشش کو بھانپتے ہوئے دلدار کی زندگی کے بارے میں بتانے لگی، تاکہ وہ بہت دیر تک شرمندہ نہ ہوتی رہے۔

☆ ☆ ☆

ویسے تو موسم سردیوں کا ہی تھا لیکن شہر کے موسم اور گاؤں کے موسم میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ حالانکہ سردی تو اسے پہلے بھی بہت لگتی تھی یہاں کی سردی تو آسمان سے باتیں کررہی تھی۔

جیسے جیسے شام ڈھلتی گئی۔ موسم کی ٹھنڈک میں اضافہ ہوتا گیا۔ پوری رات پھیل جانے کے بعد سردی کا حال ہی اور تھا۔ تیز چلتی ہوائیں اور کھلے آسمان سے برستا کہر اس نے دو سویٹر چڑھائے پھر بھی کپکپی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

بہت دیر تک زہرہ کے بستر میں گھسی رہی جب جہاں داد آگیا تو زہرہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ گئی۔ اسے یہ روایت بہت اچھی لگی یعنی گھر کی عورتیں نئی نویلی دلہن کو شروع شروع میں اس کے کمرے میں خود چھوڑ کر جاتی ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

کمرہ اس کی توقع کے خلاف بہت بڑا تھا اور اس میں بے شمار کھڑکی دروازہ تھے۔ کمرے میں تین عدد جہازی سائز پلنگ مع بستر کے بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف لکڑی کی چار کرسیاں اور ایک درمیانے سائز کی میز رکھی تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں تین چار چھوٹے بڑے صندوق اوپر تلے رکھے ہوئے تھے۔ جس پہ نفاست سے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ ایک عدد لکڑی کی سنگھار میز اور ایک لوہے کی الماری کھڑی تھی۔

کمرے کی چھت کافی اونچی تھی اور فرش سرخ، اینٹوں کا جو کافی ٹھنڈک کا احساس دلا رہا تھا۔ وقت دیکھا ساڑھے دس بج رہے تھے۔ شہر میں یہ وقت کتنی رونق والا ہوتا ہے لیکن یہاں ایسا لگ رہا تھا جیسے آدھی رات بیت گئی ہو۔

اس نے لحاف کھولا اور اپنے اوپر پھیلا لیا۔

مگر بستر میں گرمائش قطعی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے دوسرے بستر پہ سے کمبل اٹھا کر اپنے اردگرد پھیلا لیا۔ لیکن پھر اگلے ہی پل اسے خیال آیا۔ تیسری کوئی چیز نہیں ہے جہاں داد کیا اوڑھے گا، سو اس نے کمبل واپس اس کے پلنگ پر رکھ دیا۔

بہت دیر تک بستر میں بے چینی محسوس ہوتی رہی۔ اسے جہاں داد کی عقل پہ دل ہی دل میں غصہ آ رہا تھا۔ کیا وہ بتا نہیں سکتا تھا یہاں اتنی پریشان کن سردی ہوتی ہے، وہ سوتی جوڑے لے کر چلتی۔

سوٹ کیس دوسرے کمرے میں تھا۔ گرم شال بھی نہیں لے سکتی تھی۔ ''اف اللہ، کس قدر سردی ہے۔'' اس نے آپس میں ہتھیلیاں مسلیں جس وقت تک جہاں داد کمرے میں آیا، وہ سردی سے خاصی پریشان ہو چکی تھی۔

اسے دیکھ کر بولی۔ ''کیا یہاں گیس کے ہیٹر وغیرہ نہیں ہوتے؟''

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہاں ابھی گیس نہیں پہنچی۔''

''تو پھر آتش دان جیسی تو کوئی چیز ہوگی''

''ہے مگر دوسرے کمرے میں۔''

'تو پھر ہم یہاں کیا کر رہے ہیں، ہمیں بھی دوسرے کمرے میں چلنا چاہیے۔''

جہاں داد اس کی سفید ہوتی شکل دیکھ کر سمجھ گیا کہ اسے سردی لگ رہی ہوگی، مسکرا کر سر جھکا لیا اور جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولا۔

''دراصل آج کل وہ آتش دان برساتی نالے کے طور پر کام کرتا ہے۔ میرا مطلب ہے، بارشوں کے موسم میں چھتوں کا سارا پانی اسی کے ذریعے نکلتا ہے۔''

ذوباریہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ پھر اگلے ہی پل غصے میں آ کر بولی۔

''آپ نے اگر مجھے پہلے بتا دیا ہوتا کہ یہاں مری جیسی ٹھنڈ ہوتی ہے تو میں کاٹن اور شنیل کے سارے سوٹ بھر لاتی۔''

جہاں داد جوتے اتار کر بستر پہ لیٹ گیا۔

''میرا خیال ہے، اتنی سردی بھی نہیں ہے یہ اور بات ہے تم سردی زیادہ محسوس کرتی ہو۔''

''محسوس!'' ذوباریہ چڑ گئی۔ ''آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟''

''بہت خوشگوار اور انجوائے کرنے کا موسم ہے۔'' وہ شوخ ہوا۔ ذوباریہ خاموشی سے بستر پہ لیٹ گئی۔

وہ سیٹی پہ کوئی دھن گنگنانے لگا۔

''اگر زیادہ سردی لگ رہی ہے تو میرے بستر میں آ جاؤ۔''

ذوباریہ بھک سے اڑ گئی۔

اگلے ہی پل اس نے اٹھ کر بتی بجھا دی وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔

وہ اس کی مسکراہٹ پہ چڑ گئی۔

''آپ کے گھر والے تو بہت اچھے ہیں، نجانے آپ کس پہ چلے گئے۔''

وہ بس اتنا کہہ سکی۔

''آپ کے گھر والوں پہ۔'' بڑے سکون سے جواب ملا۔

ذوباریہ بستر میں لیٹ رہی تھی۔ تلملا کر اٹھی، لیکن وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھ چکا تھا۔

فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو وہ اس پہ کمبل ڈال رہا تھا۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر اس حقیقت کو محسوس کرنا چاہا تب وہ اس کے نزدیک اپنا تکیہ ڈالتے ہوئے بولا۔

''نماز ادا کرنے جا رہا ہوں۔ نجانے تم کس وقت تک بستر میں پڑی رہو۔ اس لیے یہ سب کچھ ضروری ہے۔''

دوسرے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے رویے پہ ذوباریہ بری طرح دل برداشتہ ہوئی۔

تو رات کی پیش کش اس دکھاوے کے تحت ہو رہی تھی، کتنا سنگدل شخص ہے یہ، اس کے دل میں خود کوئی احساس نہیں۔

کوئی جذبہ نہیں اس کی زندگی میں۔

اس کی آنکھیں گرم پانیوں سے بھر گئیں۔

کتنا سفاک اور بے رحم تھا وہ، فجر کے وقت بھی تکلیف پہنچانے سے باز نہیں آیا...... کیا ایسے لوگوں کی نمازیں خدا کے ہاں قبول ہو جاتی ہیں۔

''لیکن بے نمازی سے تو بہتر ہے۔'' اس کے اندر سے آواز آئی۔ اگلے ہی پل اس نے نماز کے ارادے سے خود بھی بستر چھوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

گاؤں کی بہت ساری عورتوں کے درمیان وہ بجی سنوری بیٹھی تھی۔ بچے اور خواتین اسے بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔

''سبحان اللہ، اب یہ وقت بھی آنا تھا۔'' وہ اپنی حالت پہ خود ہی رحم کھا رہی تھی۔

تب ہی زہرہ اور جہاں داد کی بہنیں اس کو تقریباً کھینچتے ہوئے، ہنستے مسکراتے اندر کمرے میں لے آئیں اور اسے زبردستی اس کے قریب بٹھا دیا۔

''یہ آپ مجھے خواتین میں کیوں لے آئی ہیں؟''اس نے نہ سمجھتے ہوئے الجھ کر پوچھا۔ ذوباریہ کو خود کچھ نہیں پتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اتنے میں اماں بھی چلی آئیں۔

''گھبرا نہیں پتر! شگن کی رسم کرنی ہے۔''

اماں جی نے مٹھائی کی ٹوکری ان کے سامنے رکھ دی۔ تمام خواتین دلچسپی سے ان کے اردگرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔

''تیری شادی اتنی جلدی ہی ہوئی کہ کوئی بھی رسم نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ رسم تو ہم ضرور کریں گے۔''بہنوں نے مچل کر کہا۔

''گویا سانپ نکل گیا، لاٹھی اب پیٹی جائے گی۔''اس نے ان کے ارمان ٹھنڈے کرنا چاہے۔

''پتر! یہ رسم تو شادی کے بعد ہی ادا کی جاتی ہے۔

''مگر یہ رسم ہے کیا؟''

''گود بھرائی کہتے ہے اس رسم کو۔ سات سہاگنیں بہو کی گود میں موسم کے سارے پھل ڈالیں گی۔ تاکہ خدا بہو کی گود جلد از جلدی ہری کرے۔''

''مگر اس میں میرا کیا حصہ ہے؟''وہ پھر بھی نہیں سمجھا۔

''تمہیں اس کی گود میں سے پھل اٹھا اٹھا کر کھانے پڑیں گے۔''

''لاحول ولا، اگر آپ نے مجھے پھل ہی کھلانے ہیں تو ایسے ہی کھلا دیں۔ گود میں ڈالنے کی ضرورت کیا ہے۔''

''یہی تو رسم ہے اصل، اگر تو اپنی دلہن کی گود میں سے سارے پھل اٹھا کر کھا گیا تو، تیری دلہن جواب میں تیرے سر پہ دوشالہ باندھے گی اور اگر تو سارے پھل نہ کھا سکا، تو سزا کے طور پہ تجھے اپنی دلہن کے ہاتھوں میں چوڑیاں پہنانا پڑیں گی۔''

زلیخا نے وضاحت کی، اسے یہ رسم نہایت دلچسپ لگی۔

''مگر اس کے ساتھ ہی تجھے بہنوں کو نیگ بھی دینا پڑے گا۔''اماں نے اسے بروقت یاد دلایا۔

''تاکہ بہنوں کی دعا تیرے آنگن کی پھلواری میں سدا بہار رہے۔

''بہت خوب تو پھر کریں رسم شروع۔''وہ جم کر بیٹھ گیا۔

رشتے کی بہنیں، بھابیاں اس سے ہنسی مذاق کرنے لگیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ذوباریہ کی گود پھلوں سے بھر گئی۔

''چلو اب تم کھانا شروع کرو۔''سب کی دلچسپی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ذوباریہ کو اس رسم سے بہت ہی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

تب ہی وہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جہاں داد نے کچھ لمحے سوچا کہ وہ کیا کرے پھل اتنے تھے کہ وہ سارے کھا نہیں سکتا تھا۔ پھر اس نے ذوباریہ کی طرف دیکھا۔

وہ اس وقت کسی دیہات کی پردہ دار اور پرانے آزمودہ طریقوں سے تیار شدہ دلہن دکھائی دے رہی تھی۔ جہاں داد کو اس کے مضحکہ خیز حلیے

پہ ہنسی آ گئی۔

اسی لمحے جہاں داد نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ہر ممکن طریقے سے سارے پھل کھا جائے گا اوراس سے ضرور دوشالا وصول کرے گا۔ ذوباریہ دل ہی دل میں مطمئن تھی کہ وہ سارے پھل نہیں کھا سکتا۔ دیکھتے ہیں وہ چوڑیاں کس طرح پہناتا ہے۔

جہاں داد نے پھل کھانا شروع کردیے۔ خواتین نے خوب ہلڑ بازی مچائی ہوئی تھی اوراس سے زیادہ اس نے بے ایمانی کا ثبوت دیا۔ آدھے آدھے پھل یہ کہہ کر چھوڑتا رہا۔

''فلاں چیز میں کیڑا ہے۔ فلاں گلا ہوا ہے۔ یہ ایسا ہے، یہ ویسا ہے۔'' اس چالاکی سے وہ سارے پھل کھانے میں کامیاب ہو گیا۔

''چلو بھئی دلہن، اب تم اٹھ کر شگن پورا کرواور اپنے شوہر کے سر پہ دوشالا باندھو'' ذوباریہ اس کے سامنے کھڑی ہونا نہیں چاہتی تھی اسے اپنے حلیے پر سخت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ ہتھیلیوں پہ پسینہ رینگنے لگا۔

اماں جی نے اس کو سرخ دوشالا تھما دیا۔

مجبوراً ذوباریہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ خواتین کی دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ جہاں داد کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ اسے اس وقت آئینہ دکھائے۔

ذوباریہ تقریباً رو دینے کو تھی۔ اس کی اس ہچکچاہٹ کو سب ہی نے شرم پر محمول کیا۔

''چلو اب کوشش کرو۔'' تب ہی اس کی مدد کے لیے جہاں داد کی بھابھی اور بہنیں آگے بڑھ آئیں۔ وہ اس کے دائیں طرف کھڑی ہو گئی اور دوشالا اس کے سر پہ لپیٹنے لگی۔ لیکن وہ کبھی دائیں طرف سر ہلا دیتا کبھی بائیں طرف کبھی جھک کر کسی سے بات کرنے لگتا۔ دوشالہ بندھ کر نہیں دے رہا تھا۔

''کیا سارا دن وہ تمہیں باندھتی ہی رہے گی۔ خدا کے واسطے سر ایک طرف رکھو، تاکہ ہم جلد از جلد نیگ لے سکیں۔''

زلیخا نے پیچھے کھڑے ہو کر اس کا سر پکڑ لیا۔ ذوباریہ نے پھرتی سے الٹا سیدھا دوشالہ اس کے سر پہ لپیٹ دیا۔ یوں کہ اس کی آنکھیں تک چھپ گئیں۔ خواتین تالیاں بجا کر داد دینے لگیں وہ اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

''چلو اب جلدی سے ایک دوسرے کا منہ میٹھا کراؤ۔

''خدا کی قسم بالکل گنجائش نہیں ہے۔'' جہاں داد نے احتجاج کیا۔

''ہمیں نہیں پتا، منہ تو میٹھا کرنا ہی پڑے گا۔''

اس کے ساتھ ہی زہرہ نے ذوباریہ کے ہاتھ میں گلاب جامن دی اوراس کا ہاتھ پکڑ کر گلاب جامن جہاں داد کے منہ میں دے دی۔

''چلو اب تمہاری باری ہے۔''

جہاں داد نے آنکھوں پہ سے دوشالا ہٹا دیا۔ ''یہ بے ایمانی ہے، مجھے کیا معلوم، میرا منہ کس نے میٹھا کرایا ہے۔''

سب ہنسنے لگیں۔ ''ہونہیں تمہیں نہیں پتا کس نے کرایا ہے، ہم گواہ ہیں۔ ذوباریہ نے ہی تمہارے منہ میں گلاب جامن دی تھی۔'' لیکن وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور بضد تھا کہ اس کا منہ دوبارہ میٹھا کرایا جائے۔ بہت دیر تک ہنگامہ آرائی ہوتی رہی۔

سب اس کی شوخیوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ لیکن ذوباریہ کا دل اس کے دوغلے پن پہ متاسف تھا۔

''کاش اس کے یہ احساسات، یہ سب جملے، یہ سب شوخیاں نیچرل ہوتیں تو وہ بھی اس رسم سے لطف اندوز ہو سکتی۔ سب کچھ بناوٹی اور کھوکھلا تھا۔''

اپنی راندہ درگاہ کیفیت پہ ذوباریہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور اس نے مزید سر جھکا لیا۔

''تم نے منہ میٹھا کرانا ہے یا سزا کے طور پر تمہیں چوڑیاں سونپی جائیں۔'' بہنوں نے اسے دھمکی دی۔

بالآخر اماں نے اس بحث کا اختتام کر دیا اور بیٹے کے ہاتھ میں لڈو دے کر بہو کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ ذوباریہ نے وہ لڈو منہ میں لینے کے بجائے ہاتھ میں لے لیا اسے معلوم تھا کہ وہ صرف قرض اتار رہا ہے۔ اس کی مہربانیوں پہ زیادہ دیر تک اسے مسرور نہیں ہونا چاہیے۔

☆ ☆ ☆

ذوباریہ، اماں جی کے ساتھ بی بی جی کے ہاں گئی جن سے گاؤں کی بچیاں قرآن پاک پڑھا کرتی تھیں۔ بابا بھی گھر پہ نہیں تھے۔ موقع بہت مناسب تھا۔ زہرہ کچھ سوچ کر جہاں داد کے پاس چلی آئی۔

''جہاں داد مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔ کیا میں جو کچھ پوچھوں گی، تم سچ سچ بتاؤ گے؟''

''کیوں نہیں بھرجائی۔''

''یہی تو افسوس کی بات ہے، تم مجھے بھرجائی بھی کہتے ہو اور پرانے خیال کو۔''

''بھرجائی!'' جہاں داد چیخ کر اٹھ کھڑا ہوا، دوسرے ہی پل اس نے زہرہ کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

''جس روز میں نے اپنے سر پہ سہرا باندھا تھا، اسی روز اس خیال کو اپنے دل سے نکال پھینکا تھا۔ یہ اور بات ہے، آپ کو مطمئن کرنے کے لیے اس بات کی گواہی میں کسی سے نہیں دلا سکتا، کیونکہ میرا دل، میرا ایمان ہی جانتا ہے۔''

''میری طرف سے پیٹھ موڑ کر نہیں میری طرف منہ کر کے بات کرو۔'' زہرہ اس کی بات سے شاید مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ جہاں داد ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔

''تمہارے اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات کیسے ہیں؟'' جہاں داد چونکا اور گہری فکر انگیز نگاہ اس پہ ڈال کر رہ گیا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟'' وہ خاموش رہا۔

''کل گود بھرائی کی رسم میں جہاں سب خوش تھے حتیٰ کہ تم بھی خوشی کا اظہار بڑھ چڑھ کر رہے تھے۔ اس کے باوجود تمہاری بیوی اداس تھی اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ سر جھکا کر رو رہی تھی۔ حالانکہ وہ وقت خوشی کا تھا۔ رونے کا نہیں۔''

''مجھے کیا معلوم، آپ اسی سے پوچھ لیتیں۔ جہاں داد نے دانستہ ٹال دیا۔

''لیکن تم بھی تو کچھ بتاؤ۔ میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔''

وہ پھر بھی چپ رہا۔

''کس قسم کی لاتعلقی اور اجنبیت ہے تم دونوں کے مابین۔ باوجود تمہاری زندگی میں شامل ہو جانے کے، تمہاری بیوی تمہاری ذات سے بے خبر اور لاتعلق کیوں ہے۔ کس قسم کا خلا ہے تم دونوں کے مابین؟''

ذوباریہ اسی وقت گھر میں داخل ہوئی تھی۔

''جب تم نے اپنی پسند کی شادی کی تھی، تو پھر اتنی جلدی کس قسم کے اختلافات پیدا ہو گئے؟'' زہرہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ تو اس کے قدم کمرے کے باہر ہی رک گئے۔

''پسند کی نہیں۔ زبردستی کی شادی کہیے۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''کس قسم کی زبردستی؟ کیا تم ذوباریہ کو پسند نہیں کرتے تھے؟'' زہرہ کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''وہ تو اسے پتا ہوگا، یا اس کے باپ کو پتا ہوگا جو یہاں آیا تھا۔ یہ بتانے کہ میں نے اس کی بیٹی کے ساتھ بڑی عیاشیاں کی ہیں۔'' وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

''یہ نہیں کہا تھا اس نے، یہ کہا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہو۔''

''لیکن بابا نے تو یہی سمجھا تھا، جب ہی میرا اعتبار نہیں کیا اور سنی سنائی بات کو حرف آخر سمجھ بیٹھے اور زبردستی رشتہ طے کر دیا۔ ذوباریہ گنگ رہ گئی۔

''میری بھی کوئی عزت تھی۔ انا تھی، زبان گروی رکھ کر گیا تھا یہاں۔'' ذوباریہ کے سر پہ دھماکہ ہوا۔

''بغیر کسی گناہ کے آپ لوگوں نے مجھے سزا کا مستحق قرار دے دیا۔'' وہ جیسے آگ اگل رہا تھا۔

زہرہ نے درزدیدہ نگاہ اس پہ ڈالی۔

''اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ تیری جان اب بھی مجھ میں اٹکی ہوئی ہے۔''

''یہ دھماکہ پہلے دھماکے سے زیادہ شدید تھا، ذوباریہ ہل کر رہ گئی۔

''بھرجائی!'' جہاں داد احتجاجاً چیخ اٹھا۔

''مت کہو مجھے بھرجائی۔ گود میں پالا ہے تجھے، تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔ جس روز تیری شادی ہوئی تھی۔ اسی روز مجھے تیرا مزاج بڑا کھٹکا تھا۔ انسان زندگی کی نئی راہ میں قدم رکھے اور مسکراہٹ اس کے قریب بھی نہ آئے۔ کتنا عجیب لگتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب اور خوفزدہ کرنے والا لگا تھا مجھے تیرا رویہ، لیکن جب تو یہاں آیا اور تو نے مجھے ایک عرصے کے بعد بھرجائی کہہ کر پکارا۔ تو میرے سارے دکھ، سارے اندیشے ڈھل گئے اور بالکل ہلکی پھلکی ہو گئی۔ لیکن، لیکن میں اندھی نہیں ہوں۔ تیرا اپنی بیوی کے ساتھ رویہ محض اسی لیے اجنبیت لیے ہوئے نہیں ہے کہ اس کے باپ نے یہ رشتہ دھوکے سے زبردستی طے کیا بلکہ تیرے دل سے پرانی محبت ختم نہیں ہوئی۔ وہ جنوں، وہ دیوانگی تیری اب بھی قائم ہے۔ ورنہ وہ لڑکی ایسی نہیں کہ تو اس سے نفرت کرے۔''

اور بس پھر ذوباریہ ایک لمحہ بھی وہاں نہیں رکی۔ دوسرے ہی پل وہاں سے ہٹ گئی۔

جہاں داد نے تاسف سے زہرہ کی طرف دیکھا جو ناراض و مشتعل کھڑی تھی۔

''یہ بھی کہتی ہے کہ تو نے مجھے گود میں پالا ہے۔ پھر اپنی گود کے وصف سے ناواقف ہے۔''

دکھ و تذلیل کے احساس سے جہاں داد کا چہرہ ہی نہیں آنکھیں بھی سرخ ہو گئی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور اس کے قدموں میں بیٹھ گیا زہرہ ٹھٹھک کر پیچھے ہٹنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ مقابل بیٹھ چکا تھا۔

''اعتبار، محبت سے بھی بڑی چیز ہوتی ہے لیکن تو نے کبھی میرا اعتبار نہیں کیا۔ مجھے تجھ سے محبت تھی ہے اور رہے گی لیکن یہ اور بات ہے کہ اس محبت نے درمیان میں کچھ اور گنجائش نکال لی تھی۔ تو نے اسے میرا پاگل پن سمجھا اور بابا نے مجھے گھر بدر کر دیا۔'' وہ بولتے بولتے رکا پھر کہنے لگا۔

''جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں، خواہ وہ چیز ہو یا انسان، تو ہم یہ چاہنے لگتے ہیں کہ اسے تمام خوشیاں دے دیں، وہ اپنے تمام ترجذبات سمیت مکمل ہو۔ وہ میری محبت کی انتہا تھی، کہ میں تجھے تحفظ اور مکمل پن سے قریب تر کر دینا چاہتا تھا اور بس۔ میں نے اس سے آگے کچھ نہیں سوچا تھا مگر آج میں تیرے قدموں پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں۔ جس وقت میری زندگی میں کوئی اور شامل ہوا، باوجود گہری شکست کو دوچار ہونے کے میں نے تیرا خیال نہ صرف اپنے دل سے نکال دیا بلکہ تیرے حقیقی رشتے سے ایک بار پھر قبول کر لیا تھا۔''

اس کی باتوں سے زہرہ کے دل میں گہرا اطمینان اتر گیا اور اس نے شانت ہو کر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لیے۔ پھر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولی۔

''مجھے تیرا اعتبار آ گیا۔ لیکن اب اس اعتبار کی کسی اور کو بھی ضرورت ہے۔''

جہاں داد نے اپنے بازو سے نم آنکھوں کو صاف کیا۔

''پھر اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں بولا۔

''بعض لوگوں کو یہ زعم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ چاہیں گے، حاصل کر لیں گے لیکن انسان چیز نہیں ہوتا۔''

''پاگل!'' زہرہ آہستہ سے مسکرائی ''بس اتنی سی بات کو تو نے انا کا مسئلہ بنا رکھا ہے حالانکہ وہ تجھ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ یہ تو محبت کی جنگ ہے اس میں فاتح یا مفتوح کوئی نہیں ہوتا، بس محبت کرنے والا دل ہوتا ہے۔ محبت کرنے والی آنکھیں ہوتی ہیں جو غافل دل کو چپ چاپ تسخیر کر لیتی ہیں۔ تیری ضد اس کے آگے کچھ نہیں چل سکے گی۔''

''شاید وہ مجھے تسخیر کر چکی ہے'' وہ آہستہ سے بولا۔

زہرہ کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر وہ مسکرا کر بولی۔

''تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟''

''میرے اقرار میں اس کی فتح ہے اور اب میں اسے فاتح بننے نہیں دوں گا۔''

''کیا مطلب؟'' زہرہ الجھ گئی۔

وہ ہنس پڑا پھر سامنے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا ''بہت شوق ہے اسے چیلنج کرنے کا، اب ایک مرد سے واسطہ پڑا ہے۔ اسے بھگتے بھی۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔'' زہرہ اسے خاموش دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''کچھ نہیں بھرجائی! تم فکر نہیں کرو، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ مسکرا کر اس کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

زہرہ سارے گھر میں کام کاج کرتی پھر رہی تھی۔اس کے کنگنوں میں ایسی جھنکار تھی، وہ صرف گلاس بھی اٹھاتی تو ان کا مدھر تان بج اٹھتی۔ ذوباریہ بہت دیر سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''اس میں ایسی کون سی خوبی تھی، جو اسے برتری دیتی تھی۔'' وہ بہت دیر تک اس سے اپنا موازنہ کرتی رہی پھر نہ جانے اس کے اندر کیسے احساسات بیدار ہونا شروع ہوئے کہ اس نے زہرہ سے نگاہیں ہٹالیں۔اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے۔

''اماں جی! میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' اس کے اچانک واپسی کے ارادے پر سب ہی چونک گئے۔

''کیوں تمہیں ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔'' اماں جی نے پیار سے کہا۔

''بس میرا دل نہیں لگ رہا یہاں۔'' اس کے انداز میں بے پناہ اجنبیت تھی۔

''کوئی غلطی ہوگئی ہے پتر ہم سے؟'' اماں پریشان ہوگئیں۔

''ایسی بات نہیں ہے اماں جی!'' وہ اکتا کر بولی۔ پھر آہستہ سے کہنے لگی۔

''مجھے پاپا بہت یاد آرہے ہیں، میں جلد از جلد گھر جانا چاہتی ہوں۔''

اماں نے پیار سے اسے اپنے قریب کرلیا۔

''کڑیاں شہر کی ہوں یا گاؤں کی، شادی کے بعد سب ایک سی ہوجاتی ہیں۔'' اکبر ملک نے ہنس کر کہا پھر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

''چلی جانا دھیئے پر ابھی نہیں۔صبح کا وقت زیادہ ٹھیک رہے گا۔

وہ تو ایک پل بھی یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔اور وہ صبح کی بات کر رہے تھے۔

''پورا دن پڑا ہے ابھی، اگر ہم اب بھی نکلے تو شام تک پہنچ جائیں گے۔'' اس کی ضد کے آگے سب خاموش ہوگئے۔

''یہ تمہیں اچانک گھر کی یاد کیوں ستائی؟'' جہاں داد نے کمرے میں آکر پوچھا۔ذوباریہ سامان پیک کرچکی تھی۔

ذوباریہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔پھر بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے بولی۔

''اگر آپ یہیں رہنا چاہتے ہیں تو گاڑی کی چابی مجھے دے دیں۔میں تنہا ہی چلی جاؤں گی۔

''معمولی سفر نہیں ہے۔'' اسے اس کی ضد پہ غصہ آرہا تھا، وہ واپسی کے ارادے سے جیکٹ پہننے لگا۔

''سفر کتنا ہی معمولی ہو جس کی منزل نہ ہو وہ زیادہ دشوار ہوتا ہے۔''

جہاں داد اس کے لفظوں پہ چونک گیا، پلٹ کر دیکھا۔

وہ جھک کر بریف کیس اٹھا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جہاں داد گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

صفدر برابر والی سیٹ پہ بیٹھا تھا اور وہ پہلے کی طرح پیچھے ہی بیٹھ گئی تھی۔

اچانک واپس جانے پہ صفدر کا منہ بسورا ہوا تھا اس لیے سفر میں پچھلی بار جیسی چہکار نہیں تھی۔

گاہے بگاہے جہاں داد ہی بول لیتا تو کچھ سکوت ٹوٹ جاتا پھر خاموشی چھا جاتی۔ اس نے اکتا کر کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

نور جہاں کی سریلی آواز سارے ماحول پہ چھا گئی۔

فلم ہیر رانجھا کا گیت چل رہا تھا۔

اور رنجھن وے کینوں اپنا حال سناواں۔

میری اکھیاں وچ اتھرے۔

کد ویکھاں سپنے تیرے۔

میرا ہور سوال نہ کوئی، بس درد ونڈا لے میرے۔

میرا کوئی نہ دردی وے

کی پھوکاں کی کرلاواں

اور انجھن وے

ذو بار یہ جو سکون سے لیٹی ہوئی تھی، اٹھ بیٹھی، وہ اس کے انتخاب کو بڑے شوق وانہماک سے سن رہا تھا۔

''صفدر! ٹیپ بند کرو۔'' اس نے پیچھے سے حکم دیا۔

جہاں داد نے بیک مرر میں اس کا چہرہ دیکھا۔

وہ سخت خفا دکھائی دے رہی تھی۔

ملازم کی موجودگی کے خیال سے اس نے خود ٹیپ بند کر دیا۔

''چلنے دیتیں بی بی جی! اتنا لمبا سفر کیسے گزرے گا۔'' صفدر پہلی بار بولا۔

''کوئی اور کیسٹ لگا لو۔ مگر یہ نہیں چلانا۔''

جہاں داد کے چہرے پہ تبسم بکھر گیا۔

''انسان کی پسند اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے، میں تو تمہارے سب جذبات سے واقف ہوں۔ کس سے چھپانا چاہتی ہو۔'' وہ گاڑی چلاتا رہا۔

''مگر جذبات صرف پسند سے نہیں، انسان کے معمولی معمولی عمل سے بھی عیاں ہو جاتے ہیں۔''

''تمہیں پتا ہے صفدر! تمہاری بی بی جب سڑک پہ گاڑی چلاتی ہیں تو ان کی خواہش کیا ہوتی ہے کہ ان کی گاڑی سڑک پہ سب سے آگے ہو۔'' پھر وہ خود ہی ہنس پڑا۔ ''حالانکہ یہ ناممکن ہے۔''

ذوباریہ پچھلی سیٹ پہ نیم دراز تھی۔ اس کی بات پہ تلخی سے مسکرا دی۔

''ساری بات ایک دوسرے کو سمجھنے کی ہے۔'' سر سلطان بیگ کے لفظ اس کے کانوں گونج رہے تھے۔ ''ہر انسان میں دو طرح کا آدمی چھپا ہوتا ہے ایک بیوقوف اور ایک عقلمند، جس آدمی کو ہم زیادہ استعمال کرتے ہیں، وہی ہماری شخصیت کی پہچان بن جاتا ہے۔''

اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں اور اپنی ذات کا تجزیہ کرنے لگی۔ زندگی میں ایسا کئی بار ہوتا ہے کہ ہم اپنی محرومیوں کا اظہار کسی طرح سے بھی دوسروں پہ نہیں کرنا چاہتے۔ اور خود کو بہت خوش اور کامیاب ثابت کرنے پہ تلے رہتے ہیں۔ یہ ہماری شخصیت کا دوہرا پن ہے۔ ہمارا اصل تو چھپا دیتا ہے۔ مگر دوسروں پہ ہمارا آپ مثبت انداز میں ظاہر نہیں کرتا۔

کسی کے آگے ہم ہاتھ پھیلائیں، اسے عزت دینے کی غرض سے تو ضروری تو نہیں وہ بھی یہی سمجھے اگر مقابل کا دل اور جیب خالی ہو۔ تو وہ اسے اپنی ذلت سمجھے گا نہ کہ عزت افزائی۔

ساری بات سمجھنے کی ہے۔ جہاں دار ملک! آپ نے مجھے صرف ایک جذباتی لڑکی سمجھا۔

میں اپنی بے وقوفیوں کی شکر گزار ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک بے حس شخص پہ منکشف ہونے سے بچا لیا۔'' ذوباریہ نے آنسو پونچھے اور اطمینان سے آنکھیں موند لیں۔

جب وہ اپنے علاقے میں داخل ہوئے تو ذوباریہ الرٹ ہو کر بیٹھ گئی۔ ''مجھے پاپا کی طرف اتار دیجئے گا۔''

جہاں داد نے اسے اس کے پاپا کے گھر ڈراپ کر دیا۔ اپنے گھر کی راہ لیتے ہوئے جہاں داد کے دماغ میں یہ بات بار بار آئی تھی کہ اس نے اسے اندر آنے کی آفر کیوں نہیں کی۔

☆ ☆ ☆

''بیٹی کی شادی کر دی فائق احمد! اور مجھے اطلاع نہیں دی۔'' روشن آرا کی اچانک آمد فائق احمد کے لیے اتنی ہی حیرت انگیز تھی، جیسے کوئی مرحوم زندہ ہو کر واپس آ گیا ہو۔ ذوباریہ بھی باپ کے ساتھ ناشتا کر رہی تھی۔

ماں کو ایک طویل عرصے کے بعد دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔

بادامی کلر کی نفیس جارجٹ کی ساڑھی میں ان کا دراز قد اور دلکش وجود آج بھی حسین لگ رہا تھا، چہرے پہ آج بھی پہلے جیسی بشاشت تھی۔

شاید میک اپ بھی انہوں نے بہت خوبصورت کیا ہوا تھا۔

''زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔'' روشن آرا نے بڑھ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔

ذوباریہ بہت دیر تک ماں کے سینے سے لگی رہی۔ لیکن ایک بھی آنسو آنکھ سے نہیں نکلا۔

ہاں لیکن دل سے سرد آہ ضرور نکلی تھی۔

''کاش مما! آپ مجھے چھوڑ کر نہ جاتیں تو یوں میری زندگی تجربوں کی نذر نہ ہوتی۔''

وہ ماں سے علیحدہ ہوئی۔ پھر جھجک کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ ناشتے کی میز پہ موجود نہیں تھے، وہ ماں کو ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

''آپ کو کیسے ملی اطلاع؟''

''تمہارے فادر کے جاننے والوں سے ہی ملی۔ آئی مین ان کے کاروباری دوستوں نے بتایا تھا۔''

اس کے ساتھ ہی روشن آرا نے ایک خوبصورت سا ڈائمنڈ کا لاکٹ پرس سے نکالا اور بیٹی کے گلے میں ڈال دیا۔

ذوباریہ ہیرے کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھنے لگی۔

''(پاپا کہتے ہیں۔ جو تحفہ وقت پہ ملتا ہے وہی تحفہ ہے۔ بے وقت کے تحفے یا تو قرض ہوتے ہیں۔ یا نذرانے)

اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ جو شوق سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کہاں ہوتی ہیں آپ آج کل؟'' ذوباریہ نے پوچھا۔

''تمہارے ماموں کے پاس نیویارک میں۔ کئی بار سوچا، تم سے ملوں۔ لیکن اس خیال نے ہمیشہ روک دیا کہ شاید تمہارے پاپا پسند نہ کریں۔''

ذوباریہ تاسف سے مسکرا کر رہ گئی۔

''ڈیئر! تم خوش ہو؟''

''او یس مما۔'' وہ ہنس پڑی، روشن آرا مطمئن ہو گئیں۔

''میں نے تصویر دیکھی تھی تمہارے ہسبینڈ کی۔ بہت خوبصورت داماد ڈھونڈا ہے تمہارے پاپا نے۔ ان کے انتخاب سے ایسا لگتا ہے جیسے انہیں اپنی زندگی سے کوئی گلہ تھا۔ وہ دھو دیا ہو۔''

ذوباریہ کے سینے میں تیر سا پیوست ہوگیا۔

(ہاں شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ایک بار میں نے پاپا سے ضد کی تھی کہ وہ آپ کو دوبارہ اپنالیں لیکن شاید یہ ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ یہ میری دوسری ضد تھی۔ انہوں نے اپنے تمام اختیارات استعمال کر ڈالے۔ حتیٰ کہ اپنی عزت نفس بھی داؤ پہ لگادی۔ صرف میری خاطر مگر یہ ثابت ہوگیا، زبردستی حاصل کی ہوئی چیز ہمیشہ پہلے سے کسی نہ کسی کی ملکیت ضرور ہوتی ہے)

''مما! آپ رکیں گی یا؟''

''نہیں مائی ڈیئر! میں جاؤں گی۔''

روشن آرا نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا۔

اسی لمحے جہاں داد بلا دھڑک ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

اور پھر اچانک ہی ٹھٹھک گیا۔

ذوباریہ ایک ایسی عورت کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جو جہاں داد کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ اور بے حد متاثر کن شخصیت کی حامل خاتون معلوم ہورہی تھیں۔ ذوباریہ نے اور روشن آرا نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔

''میں ذوباریہ کی مدر ہوں۔'' روشن آرا نے مسکرا کر خود کو متعارف کرایا۔ جہانداد کے قدم زمین پہ جم گئے وہ بری طرح چونکا تھا۔

اسے یاد تھا، ذوباریہ نے ایک دن بتایا تھا کہ اس کی مدر کا انتقال ہوگیا ہے پھر یہ۔

''آؤ بیٹا! کھڑے کیوں رہ گئے۔''

وہ کچھ نروس سا ہوگیا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے جھجکتے ہوئے سلام کیا۔

پھر خود کو مستعدی سے کنٹرول کرتے ہوئے مقابل بیٹھ گیا۔

ذوباریہ نے بڑی دلچسپی سے اس کے تاثرات نوٹ کیے تھے۔

''کیا بزنس کرتے ہیں آپ؟'' روشن آرا نے داماد کی طرف رخ کرلیا۔

''جہاں داد کچھ کنفیوژ نظر آیا۔ اس قدر زبردست خاتون اور پھر ایسا سوال اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

اس نے ذوباریہ کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے پرسکون انداز میں بیٹھی ہوئی تھی پھر اگلے ہی پل مسکرا کر بولی۔

''مما! یہ پاپا کے ساتھ بزنس پارٹنر ہوتے ہیں۔''

اوہ ویری نائس، اتنا سمارٹ بزنس پارٹنر کب سے شراکت داری ہے؟'' روشن آرا نے پھر دلچسپی کا اظہار کیا۔

''اور مما! چھوڑیے بھی آپ کیا باتیں لے بیٹھیں۔'' ذوباریہ نے اکتاہٹ سے کہا اور روشن آرا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

ان کی گفتگو کے دوران جہاں داد نے کئی بار دونوں کو حیرت سے دیکھا۔ ذوباریہ اپنی ماں میں اس طرح مگن تھی جیسے وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ کئی بار اسے اپنا نظر انداز ہو جانا کھٹکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد روشن آرا اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جہاں داد بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

''اچھا مائی سن! اب اجازت دو۔'' روشن آرا نے جہاں داد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ذوباریہ کو پیار کر کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئیں۔ ذوباریہ بھی ان کے ساتھ ساتھ آئی۔ جاتے جاتے انہوں نے ذوباریہ کو اپنا موجودہ ایڈریس تھما دیا۔

''اگر تم چاہو تو مجھ سے رابطہ رکھ سکتی ہو آفٹر آل میں تمہاری ماں ہوں۔'' ذوباریہ نے ایڈریس ان سے لے لیا اور بیرونی دروازے تک انہیں رخصت کرنے گئی۔

جب وہ واپس ڈرائنگ روم میں پلٹی تو جہاں داد منتظر بیٹھا تھا۔

''تم نے تو کہا تھا تمہاری مما کی ڈیتھ ہو گئی ہے؟'' اس کی حیرانی عروج پہ پہنچی ہوئی تھی۔

ذوباریہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے یہ کہا تھا سر! میری مما ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔''

''عجیب بات ہے۔ میں نے ایسا ہی کیوں سمجھا۔'' وہ کھسیا کر ہنس پڑا۔

''شی از ویری نائس لیڈی۔ بڑی زبردست ہیں آپ کی مدر، انتہائی گریس فل۔ بات چیت کا انداز تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے میں حقیقتاً انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔''

''مائنڈ اٹ سر!'' ذوباریہ تند و ترش لہجے میں بولی۔

''وہ آپ کی ماں جیسی ہوتی ہیں۔''

''جہاں داد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''واٹ ڈو یو مین۔'' کیا بیٹے، ماؤں کی تعریف نہیں کرتے؟'' ذوباریہ کی پیشانی پہ ناگواری کی لکیر کھنچ گئی۔

''شاید کرتے ہوں مگر اس میں بیٹے کا با کردار ہونا ضروری ہے۔'' جہاں داد کی آنکھیں پوری کھل گئیں اس بات پہ اس کی پیشانی پانی کی بوندوں سے چمک اٹھی تھی اس نے جیب سے رومال نکال کر پیشانی پہ سے پسینہ صاف کیا۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

ذوباریہ فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے فون بند کر دیا۔ جہاں داد خود کو سنبھال چکا تھا۔

''میں نے صرف اس سینس میں تمہاری مدر کی تعریف کی تھی کہ وہ اتنی شاندار ہونے کے باوجود اس گھر میں کیوں نہیں رہ سکیں۔

''یہ ان کی مرضی۔'' ذوباریہ نے تیکھا سا جواب دیا۔ اس کا رویہ جہاں داد کو بہت برا لگا۔

''تمہارے فادر کے ساتھ شاید ان کی اسی لیے نہیں نبھ سکی کیونکہ یہ بالکل ان میچ جوڑی تھی۔ یقیناً وہ انکے ساتھ بہت آکورڈ لگتے ہوں گے۔''

''مسٹر ملک!'' ذوباریہ نے غرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں اپنے پاپا کے بارے میں کچھ نہیں سن سکتی، ہی از ویری بیوٹی فل پرسن۔ میرے پاپا دنیا کے خوبصورت ترین مرد ہیں اور خوبصورت مرد وہی ہوتا ہے جو عورت کی عزت کرنا جانتا ہے، اس سے محبت کرنا جانتا ہے۔ اس کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے، ہر رشتے کا تقدس بحال رکھتا ہے چہروں سے اور قد کاٹھ سے مرد خوب صورت نہیں بن جاتے۔''

جہاں داد کے چھکے چھوٹ گئے، وہ یکلخت کھڑا ہو گیا۔

''اور سننا چاہیں گے آپ، خوبصورت مرد کی تعریف جو انسان حالات کے بہتے دھاروں کے ساتھ سفر کرے۔ حالات، انسان کے جنون سے رخ نہیں بدلتے سر! انسان کو خود کو حالات کے مطابق بدلنا پڑتا ہے جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ حالات کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ البتہ ان کے رویے اس حد تک بدصورت ہو جاتے ہیں کہ دوسروں کو ان سے خوف آنے لگتا ہے۔''

زندگی میں پہلی بار جہاں داد ذوباریہ سے لاجواب ہوا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا؟'' وہ یکسر انجان ہو کر بولا ذوباریہ استہزائیہ مسکرائی۔

''چہ خوب، یہ بھی میں سمجھاؤں۔ پوچھ لیا ہوتا اپنی بھرجائی کم اور محبوبہ۔''

''آگے ایک لفظ نہیں بولنا۔'' دکھ واشتعال سے اگلے ہی لمحے جہاں داد کا ہاتھ اٹھ گیا۔

ذوباریہ ذرا فاصلے پہ نہ کھڑی ہوتی تو یہ ہاتھ پھر سے اس کے چہرے کی زینت بن جاتا۔

جہاں داد کا ہاتھ فضا میں ہی بلند رہ گیا۔

ذوباریہ پھر کر اس کے سامنے آ گئی۔ پھر اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی۔

''مسٹر ملک! یہ بات دھیان میں رکھنا، یہ میرے باپ کا گھر ہے۔'' آپ کا ذاتی بیڈ روم نہیں۔ جہاں آپ یہ غلطیاں بار بار دہراتے رہیں گے۔ کسی گمان میں نہ رہیے گا کہ ہر بار آپ کی غلطی معاف کرانے کے لیے ذوباریہ باپ کے سامنے ڈٹ جائے گی۔''

جہاں داد بری طرح تلملا گیا۔

اس کے ہوش ہی کیا مزاج بھی ٹھکانے پر آ گئے۔

''پاپا کا فون آیا تھا۔ انہوں نے آپ کو آفس بلایا ہے، جانا چاہیں تو چلے جائیں۔''

ذوباریہ نے جھک کر میز پہ سے اخبار اٹھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

دن بھر وہ سخت ٹینشن میں مبتلا رہا۔

''بالآخر ساڑھے نو بجے کے قریب اس نے فون کھڑ کا دیا۔ ملازم نے فون ریسیور کیا۔

''ذوبار یہ بی بی! آپ کا فون ہے۔''

''کون ہے؟'' اس نے ٹی وی کی آواز ہلکی کر دی۔

''جہاں داد صاحب ہیں۔''

''ان سے کہو، میں گھر پہ نہیں ہوں۔'' وہ پھر اسکرین کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''چھوٹے صاحب پوچھ رہے ہیں ان سے پوچھ کر بتاؤ، وہ کہاں گئی ہیں؟''

''ذوباریہ لال دین کی نااہلی پر تلملا گئی۔

ان سے کہو جہنم میں گئی ہوں۔'' دوسرے ہی لمحے اس نے خود بڑھ کر فون بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆

آج تیسرا روز تھا۔ آفس جانے کے لیے وہ دانستہ دیر سے گھر سے نکلا تھا۔ اس کا خیال تھا فائق احمد اب تک آفس جا چکے ہوں گے تب ہی اطمینان سے وہ اس کے گھر آ گیا۔

لال دین لان میں پانی دے رہا تھا، اسے دیکھتے ہی سلام جھاڑ دیا۔

"وعلیکم اسلام، بڑے صاحب گھر پہ ہیں؟"

"جی وہ تو ابھی ابھی نکلے ہیں۔"

"اور تمہاری، بیگم صاحبہ، آئی مین ذوباریہ بی بی!"

"وہ جی اپنے کمرے میں ہیں۔ آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں انہیں اطلاع دیتا ہوں۔" لال دین نے چابک دستی دکھائی۔

"آں نہیں۔ رہنے دو، میں وہیں چلا جاؤں گا۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ لال دین نے تعظیم سے اس کی کمرے تک رہنمائی کی۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو انگلش میوزک کی اٹھا پٹخ اس کی سماعتوں پہ ہتھوڑے برسانے لگی۔

اس نے ناگواری سے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ سامنے ہی وہ ریشمی گلابی نائٹی میں ملبوس بستر پہ اوندھی اس طرح پڑی تھی کہ پاؤں کے تلوے چھت کی طرف تھے اور میوزک کے ساتھ ساتھ ہل رہے تھے، برہنہ پنڈلیاں اور برہنہ بازو، کشادہ گلے کی نائٹی، وہ بڑے قابل اعتراض حلیے میں تھی۔

جہاں داد کی نگاہیں چکا چوند ہو گئیں۔

سب سے پہلے یہی خیال دل میں آیا کہ اس گھر کے سب ملازم مرد حضرات ہیں، نجانے کتنی بار ملازم کو حکم بجالانے کے لیے اندر آنا پڑا ہوگا۔

اس کے بستر کے قریب ہی ورشہ کارپٹ پہ بیٹھی تھی، اس کے ہاتھ میں بھی کافی کا مگ تھا۔ دونوں کے سر قریب قریب تھے۔ جیسے باہم ہمکلام ہوں۔

"یہ وصف بھی خواتین میں ہی ہے میوزک چاہے کیسا دھما کہ خیز کیوں نہ ہو۔ ہر کام بڑے اطمینان سے کر لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ باتیں بھی۔"

اس نے آگے بڑھ کر ڈیک آف کر دیا۔

دونوں نے چونک کر دیکھا، اگلے ہی پل ورشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"السلام علیکم سر!"

"وعلیکم السلام۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

ذوباریہ ایسے ہی پڑی رہی۔

جہاں داد کو عجیب سا لگا، اس نے ورشہ کی طرف دیکھا۔ پھر بے شائستگی سے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

''پلیز مجھے کچھ پرسنل بات کرنی ہے۔''

ورشہ خود اس سچویشن سے نروس ہو رہی تھی۔ باہر جانے لگی، اگلے ہی پل ذوباریہ بول پڑی۔

''ورشہ تم باہر نہیں جاؤ گی۔'' وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

''کیونکہ میرا ان سے کوئی پرسنل معاملہ نہیں ہے۔''

''ورشہ بوکھلا گئی۔ پھر ذوباریہ کو گھور کر یوں دیکھا۔ جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو۔ ''اپنا حلیہ دیکھو بے غیرت۔''

''سر! آپ بیٹھیں میں باہر جا رہی ہوں۔ اگلے ہی پل وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد جہاں داد نے دروازہ بند کر دیا۔

پھر اس کے نزدیک صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''نائٹ رات کا لباس ہوتی ہے، سحر کے ساتھ ہی اسے بدل لینا چاہیے۔''

ذوباریہ اس کی بات پہ ہنس پڑی، جیسے بہت محظوظ ہوئی ہو۔

''یعنی یہ مردوں کی ذات کی طرح ہوتی ہے بدلنا شرط جو ٹھہری۔''

''کیا تم شادی سے پہلے بھی ایسے لباس پہنتی تھیں؟''

اس کے دوسرے سوال پہ ذوباریہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔

''سر! میں نے تو کبھی نہیں پوچھا آپ سے کہ آپ شادی سے پہلے کیا کرتے تھے۔'' جہاں داد اس کی بات پہ جز بز ہو کر رہ گیا۔

''یہی تمہاری سب سے بڑی غلطی ہے کہ تم نے اس فیصلے میں صرف اپنی ذات کو ترجیح دی اور میرے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کی۔''

''میں اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی ہوں'' ذوباریہ مسکرائی۔

''تمہیں میرے متعلق جو کچھ معلومات ہیں۔ میں اس پہ قطعی شرمندہ نہیں ہوں۔''

''البتہ میں شرمندہ ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ فوراً وہاں سے لوٹ آئی۔''

''بہتر ہوتا کہ تم ساری بات جان کر لوٹتیں۔'' وہ اس کی ہٹ دھرمی پہ کلس کر بولا۔

''مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ آپ کے بارے میں جاننے کی۔''

''مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں ہے اپنے متعلق بتانے کی انڈراسٹینڈ۔ اس لیے کہ یہ تمہارا یک طرفہ فیصلہ تھا۔ اور نہ ہی میں تمہارے سامنے کسی بھی وضاحت کو ضروری سمجھتا ہوں، کون ہوتی ہو تم جس کے سامنے میں اپنا ماضی بیان کروں اور دلیلیں دوں۔ یہ بات تمہیں سوچنی چاہیے تھی۔''

وہ مشتعل ہو کر بولا ذوباریہ نے سکون سے اس کی طرف دیکھا۔

''تو پھر سر! آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟''

جہاں داد انتہائی اطمینان سے بولا۔

''تمہیں لینے آیا ہوں، گھر چلو۔''

''واٹ ڈو یو مین گھر چلو۔'' ذوباریہ بھک سے اڑ گئی۔ اگلے ہی لمحے بستر چھوڑ کر کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

''کس حیثیت سے آپ مجھے لے جانا چاہتے ہیں؟''

''ویری گڈ، شادی سے پہلے یہ سوال تمہیں اپنے پاپا سے کرنا چاہیے تھا کیونکہ انہیں بخوبی اندازہ تھا کہ ان کی بیٹی کس حیثیت سے میرے گھر میں جا رہی ہے، اب یہ سوال بے کار ہے۔'' وہ بھی صوفے پہ سے کھڑا ہو گیا۔

ذوباریہ تحیر سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

وہ تلخی سے ہنس دیا۔

''ان سب باتوں کو بھول کر مجھے اپنی جگہ پہ رکھ کر سوچو پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ زیادتی کس کے ساتھ ہوئی ہے۔ تمہارے ساتھ یا میرے ساتھ؟ اگر تم اس قدر خود غرضی کا ثبوت نہ دیتیں تو حالات مختلف ہوتے۔ اگر ذرا سی بھی انسانیت ہے تم میں تو سمجھ سکتی ہو۔ کھو دینے کا دکھ نہیں مجھے، جھٹلا دیے جانے کی آگ میں بھڑ بھڑ جلتا رہا ہوں۔''

''صرف جھٹلائے جانے کی آگ؟''

ذوباریہ کی آنکھوں میں پانی تیر گیا۔

''میرا خیال ہے سر! میں اپنا بھگتان بھگت چکی ہوں، اب آپ کو صبر آ جانا چاہیے۔'' اگلے ہی پل اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی تھی۔

جہاں داد نے آگے بڑھ کر بے رحم انداز میں اس کی کمر میں اپنا بازو حمائل کیا اور اس کے بازو پر لٹکی ریشمی ڈوری کو کھینچتے ہوئے بولا۔

''اب صبر نہیں آ سکتا کسی طرح سے بھی۔''

''بتاؤ کتنا تشدد پسند ہے تمہیں۔ کتنا۔'' ذوباریہ رو پڑی پھر جھٹکے سے اس کے حصار سے نکل گئی۔

''سر! آپ کے اور میرے درمیان اب کوئی لین دین نہیں ہے۔''

''یہ حساب تو قیامت تک بھی صاف نہیں ہو سکتا۔'' وہ مسکرایا ''شام کو میں آفس سے ادھر ہی آؤں گا۔ چلنے کے لیے تیار رہنا'' اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

یہ بات جہاں داد کے لیے بہت بھاری تھی۔ وہ دانستہ اسے لینے نہیں گیا تھا اس نے یقیناً انتظار بھی نہیں کیا ہوگا۔
اگر یہی بات وہ کسی اور طرح کرتا تو وہ صبح سے ہی شام کا انتظار کرنا شروع کر دیتی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اتنی محبت کہ وہ اس سے محبت نہ بھی کرے تب بھی وہ اسے چاہتی رہے گی۔

''شاید اسے خود پہ بہت گمان ہے۔ ہر چیز کو تسخیر کر لینے کا گمان اور شاید اسے اپنی محبت پہ بھی بہت گمان ہے میری نفرت سے بھی زیادہ اپنی محبت کو طاقتور سمجھی ہے۔ اس کا یہ گمان ضرور ٹوٹے گا، میری طرف سے محبت پاتی رہے گی۔ پھر بھی محبت کے لیے ترسے گی۔ اقرار نہیں کروں گا، کبھی نہیں بتاؤں گا اسے۔''

وہ بستر چھوڑ کر کھڑکی کے آگے کھڑا ہو گیا اور چاند کو دیکھنے لگا۔

''پاگل لڑکی! تمہاری دیوانگی کے آگے میں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں میں تمہاری محبت کے آگے اسی دن ہار گیا تھا جب تم نے ساری رات میری زندگی کی دعائیں مانگی تھیں۔ حالانکہ تمہیں اس وقت مجھے اکیلے چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ یہ سوچ کر کہ مکافات عمل سب کے ساتھ ہیں لیکن۔ تمہاری محبت تمام جذبات پہ غالب تھی۔ میں اسیر ہو رہا تھا، آہستہ آہستہ تمہاری محبت کی بارش میں بھیگ رہا تھا، اس بارش نے میرے دل کا بغض دھو دیا۔ تمام نفرتوں کو دھو ڈالا میرے روم روم پر تمہاری محبت اوس بن کر گر رہی تھی مجھے اپنی زیادتیوں کا احساس ہو رہا تھا۔
اور میں نے...... میں نے...... پاگل لڑکی...... اپنی زیادتی کا مداوا کیا، تمہارے زخم کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ تم نے سوچا ہوگا۔ کاش میں ہوش میں ہوتا۔ مگر میں ہوش میں تھا۔ اگر تم یہ سب کچھ جان لو تو خوشی سے ناچنے لگو۔ مگر نہیں۔ پھر وہی فتح میں تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گا۔ کبھی بھی نہیں۔''
وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔
''لیکن کیا ایسا ممکن ہے!'' وہ چاند کو تکتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ نہیں پتا تھا کہ وہ کسے آزمار ہا ہے اسے یا خود کو، شام کو وعدہ کر کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد اسے لینے آیا تھا۔ مگر وہ گھر پر نہیں تھی۔

''کہاں گئی ہے؟'' ملازم سے پوچھا۔

''صاحب، کلب۔''

''کلب!'' وہ حیران ہوا۔ ''کون سے کلب؟''

''ایکسر سائز کلب، صاحب جی۔'' حیرانگی کا ایک اور جھٹکا لگا۔

''تمہیں معلوم ہے کلب کا نام۔'' ملازم ہنسنے لگا۔ ''گھر کا ہی کلب ہے۔ جی۔ بھلا کیا نام ہوگا۔ ویسے ذوبار یہ بی بی کہہ رہی تھیں، کلب کا کوئی نام رکھیں گی۔ کیونکہ اس علاقے کی بہت ساری لڑکیاں آتی ہیں یہاں ایکسر سائز کرنے۔''

جہاں داد کو اس کی تفصیل سے الجھن ہوئی۔

''یہ بتاؤ، اس وقت وہ اکیلی ہوں گی یا...... اور بھی خواتین ہوں گی وہاں؟''

لال دین نے وقت دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔

''نہیں جی۔ اس وقت تو وہ اکیلی ہی ہوں گی۔''

وہ لال دین کی ہمراہی میں بنگلے کے پچھلے حصے کی طرف آ گیا۔

گھر کے دونوں طرف لان تھا۔ پچھلے لان سے گزر کر ایک کشادہ راہداری تھی، ساتھ ہی زینہ تھا۔

''یہاں سے چلے جائیں جی۔ اوپر پہلا ہی کمرہ ہے۔''

اس نے گھر کا یہ حصہ پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ کھلی کشادہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ پھر کسی خیال کے تحت رک گیا۔

''سنو لال دین!'' ملازم مستعدی سے مڑا۔

''یہ کلب کب سے ہے''

''یہ تو جی...... بہت پرانا ہے۔ جب بڑی بیگم صاحب یہاں ہوتی تھیں۔ تب سے۔ یا...... شاید۔ ان سے بھی پہلے۔ مجھے یاد نہیں جی۔''

''اچھا تم جاؤ۔''

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اوپر چڑھ گیا۔

شیشے کا براؤن ٹچ سسٹم دروازہ تھا۔ اس نے ہلکا سا پش کیا۔ دروازہ کھل گیا۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا ہال تھا۔ جس میں جدید آلات ایکسر سائز کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ہال کے فرش پہ نیلا قالین بچھا ہوا تھا۔ پوری چھت شیشے کی تھی۔ فرش پہ رکھی ہوئی ہر چیز چھت میں نظر آ رہی تھی۔ پیناسونک کا ڈیک رکھا تھا۔

اس کی نگاہ ذوباریہ پہ پڑی۔ ہلکا آسمانی گہرا نیلا کنٹراس ٹراؤزر شرٹ پہنے جوگرز سمیت وہ رولر پہ کھڑے کھڑے دوڑ رہی تھی۔ جیسے جنونی کیفیت میں بھاگتی چلی جا رہی ہو۔ نہ رکنے کے لیے۔ جہاں داد اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

محبت کرنے والے، جنونی ہوتے ہیں۔ اپنے نفع نقصان سے بالاتر۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ خود کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کا بازو پکڑ کر رولر پہ سے نیچے اتار لیا۔

''یہ تم کیا کر رہی تھیں؟'' جہاں داد نے ایسے پوچھا جیسے وہ خودکشی کر رہی تھی۔

''سارا فگر خراب ہو جائے گا۔'' اس نے تشویش کا اظہار کیا۔

(کاش آپ کو میرے دل کی پروا ہوتی)

ذوباریہ بازو چھڑا کر قریب پڑی کرسی پہ ڈھے گئی۔

''اس کا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اور تنفس تیز ترین تھا۔

جہاں داد نے رحم بھری نگاہ اس پہ ڈالی۔ پھر تولیہ اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ جس سے ذوباریہ چہرہ اور گردن صاف کرنے لگی۔

جہاں داد نے اس پہ سے نگاہ ہٹالی اور ہال کا جائزہ لینے لگا۔ دیواروں پہ عجیب عجیب لوگوں کی تصاویر لگی تھیں۔

کچھ مرد تھے اور کچھ عورتیں۔ یقیناً یہ سب ان آلات کا شاخسانہ تھے۔ جہاں داد کو ان کے جسموں سے گھن آنے لگی ایک شخص نے تو باقاعدہ اسے چونکا دیا۔ اس کی رگیں گوشت سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے جسم پہ کیڑے مکوڑے رینگ رہے ہوں۔

اس نے ذوباریہ کی طرف دیکھا۔ جو تقریباً سانسیں بحال کر چکی تھی۔

''یہ کون صاحب ہیں؟'' اس نے اشارہ کیا۔

''پول ڈیلٹ ...... عالمی باڈی بلڈر۔''

''تم اس جیسا بننا چاہتی ہو؟''

''ذوباریہ نے کوئی جواب نہیں دیا سر جھکا کر جوگرز کے تسمے کھولنے لگی۔

جہاں داد نے دلچسپی سے ایک ڈمبل اٹھا لیا اور اسے ایک ہاتھ سے اوپر نیچے کرنے لگا۔

''بہت ہلکا ہے۔'' اس نے ہنس کر واپس رکھ دیا۔ ذوباریہ۔ ذوباریہ جوتے اتار کر سیدھی ہو گئی۔

''کتنا وزن اٹھانے کی پریکٹس ہوئی؟'' اس نے ذوباریہ کو چھیڑا۔

''ضمیر کا بوجھ اٹھا لیا ہے، اتنا ہی کافی ہے۔'' ذوباریہ نے کرسی کی بیک سے اپنا کوٹ اٹھا کر شانے پہ ڈال لیا۔

جہاں داد بے ساختہ ہنس پڑا۔

''حالت جنگ میں رہنے والے۔ آلات پہلوانی سے خود کو تیار کر رہے ہیں۔'' ذوباریہ جل گئی۔

''مقابلہ ان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جن کی گیم صاف ہو۔''

''جہاں داد نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ تو پھر کیا انتقام کی تیاری ہو رہی تھی؟''

''ذوباریہ نے کوئی جواب نہیں دیا، انٹر کام اٹھا کر بات کرنے لگی۔

''لال دین! پاپا آ گئے ہیں؟''

''وہ دیر سے آئیں گے، ڈنر پہ گئے ہوئے ہیں، باہر سے پارٹی آئی ہوئی ہے۔'' انٹر کام کے بجائے باہر سے جواب موصول ہوا۔ اس نے جہاں داد کی طرف دیکھا۔ لال دین کچھ اور تفصیل بتا رہا تھا۔ اس نے اچھا کہہ کر فون بند کر دیا۔

''آپ ہمیشہ پاپا کی غیر موجودگی میں ہی کیوں آتے ہیں؟''

''لاحول ولا، اپنی بیوی کے پاس آتا ہوں۔ تمہارا اس بات سے مطلب کیا ہے؟''

''ہونہہ۔ بیوی!'' ذوباریہ تلخی سے ہنسی۔

''کیا تم میری بیوی نہیں ہو؟'' جہاں داد کرسی کی ہتھیوں پہ ہتھیلیاں جما کر تقریباً اس کی طرف جھک گیا۔ اور مدہوشی سے اس کی دیکھنے لگا۔ اس کی قربت سے ذوباریہ کی سانسیں الجھنے لگی۔

اگلے ہی پل وہ گستاخی کا ارتکاب کر بیٹھا۔ ذوباریہ کا رنگ اڑ گیا۔ جھنجھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ شوخ نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

ذوباریہ اسے دھکیل کر پھرتی سے کھڑی ہو گئی اور اپنی سانسوں کا زیر و بم سنبھالتے ہوئے رخ موڑ کر بولی۔

''لگتا ہے آپ ہوش میں نہیں ہیں۔''

جہاں داد نے گھوم کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

''ہاں، میں ہوش میں نہیں ہوں، بھلا ایک ہوش مند مرد، کسی بیوقوف لڑکی سے محبت کر سکتا ہے۔''

ذوباریہ اس کی قربت سے دہک اٹھی۔ اس کے جذبے آگ کی طرح آنچ دے رہے تھے۔ یہ تپش محبت کی تھی۔ نہ کہ نفرت کی، لیکن وہ ادراک کے لمحوں سے کوسوں دور تھی، وہ اس کے بازوؤں میں کسمسائی۔

''جائیے پھر۔ کسی عقل مند سے محبت کیجئے۔''

''کالج سے ریزائن کر چکا ہوں۔ محبت کرنے کے زیادہ چانس وہیں ہوتے ہیں۔'' وہ شرارت و سرگوشی سے گویا ہوا۔

ذوباریہ اس کے طنز کا مفہوم سمجھ گئی۔

(نجانے کیوں۔ اس شخص سے توقعات وابستہ کیے بیٹھی ہوں)

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پوری طاقت سے اپنا آپ اس سے چھڑا لیا۔

جہاں داد کو اس کی کوشش نے لطف دیا، پھر شرارت سے داد دینے والے انداز میں بولا۔

''یعنی محنت رنگ لائی ہے۔''

''کاش محبت بھی رنگ لاتی۔'' اس نے افسوس سے کہا۔ اور ہتھیلی سے آنسو رگڑ لیے۔ جہاں داد زور سے ہنس پڑا۔ یہ لڑکی اسے مجبور کر رہی تھی۔ وہ اپنی تمام پیش بندیوں کے سامنے ہار رہا تھا، تمام تر لائحہ عمل بے کار ثابت ہو رہے تھے۔

(آخر، آخر تم کیوں چاہتی ہو کہ میں تمہارے سامنے ہار تسلیم کروں۔ تم خود کیوں نہیں ہار جاتیں مجھ سے)

وہ اس کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہار گیا ہو، تھک گیا ہو۔ پھر اسے شانوں سے پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''جان من! میں ہار گیا، اور تم جیت گئیں۔ لیکن اظہار محبت سے پہلے میں تمہارے دل کو اپنی طرف سے صاف کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس دل کے موسم ہمیشہ میرے لیے تابندہ رہیں۔''

اس نے آہستہ آہستہ اپنی امیر حمزہ سنانا شروع کی۔ ذوباریہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جہاں داد اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''پھر یوں ہوا کہ وہ لڑکا شہر آ گیا، بہت جلد ہی اسے ایک چالاک لڑکی ملی۔ ویسے تو اور بھی لڑکیاں چالاک تھیں، تب ہی اس نے اس بھولے بھالے لڑکے کو اپنے جال میں پھانس لیا۔''

اس نے شرارت سے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیئے۔

''پھر وہ لڑکی اسے محبت سکھانے لگی۔ اس لڑکے کو اس کا کوئی بھی انداز پسند نہیں آیا۔ لیکن ایک رات، ایک رات......''

وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لے آیا۔ ذوباریہ کے ہوش جاتے رہے۔ وہ خوفزدہ سی پیچھے کی طرف پلٹ گئی۔

''وہ لڑکی اس لڑکے کو بے ہوش سمجھ کر مسیحائی کے لمس سے نوازتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ لڑکا اپنی چارہ گر کے فسوں میں قید ہو کر رہ گیا۔''

حیرت سے ذوباریہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ بس زمین پہ گرنے کو تھی۔

''اس لڑکی نے بڑی چالاکی سے اسے اپنی چاہت کا اسیر بنا لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لڑکا اپنی شکست کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔ ایک دن اس نے فیصلہ کر لیا، وہ کبھی اپنے جذبے کو اس پہ عیاں نہیں کرے گا۔ مگر لڑکی۔ لڑکی کی محبت زیادہ طاقتور تھی۔ اس نے لڑکے کو مجبور کر دیا۔''

اگلے ہی پل ذوباریہ گھوم کر اس کے حصار سے نکل گئی۔ اور تیزی سے اس سے دور ہو گئی۔ اس کے ابھی تک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چند ہی لمحوں میں یہ کیا ہوا؟''

یہ سب سچ تھا یا۔ یونہی۔ حیرت وخوف سے وہ جہاں داد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ اس کے قریب آ گیا، پھر اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ کر مسکرایا۔

''اب لڑکے نے فیصلہ کیا وہ باقی کہانی گھر جا کر سنائے گا۔ تاکہ لڑکی اطمینان سے سن سکے۔''

وہ اس کی کیفیت سے حظ اٹھاتے ہوئے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیدھا ہو گیا۔

''چلیے، جانِ جہاں داد، گھر چلتے ہیں۔''

ذوباریہ نے اس کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی ہو۔

☆ ☆ ☆

موسم تھا یا آفت، اس کا آفس جانے کا قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مارے باندھے جانے کی تیاری کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ آفس سے چھٹی حاصل کرنے کے لیے آج کون سا نیا طریقہ اختیار کرے کہ ذوباریہ اس کی چھٹی پہ رضا مند ہو جائے۔ ریسٹ واچ باندھتے ہوئے معاً اس کی نگاہ گھڑی کے نمبروں سے الجھ کر رہ گئی۔

یکم جنوری، انیس سو ننانوے۔

آج سال کا پہلا دن تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھلا۔ اب چھٹی کا مرحلہ آسان تھا۔ وہ ذوباریہ کو تلاش کرتے ہوئے کچن میں آ گیا۔ سرخ ویلوٹ کے سوٹ میں ملبوس بلیک شال ڈالے وہ ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔

پہلے تو موسم کی سازش تھی، اب وہ خود آزمائش بنی کھڑی تھی۔ جہاں داد کا دل اور بھی مچل گیا۔

''ہیپی نیو ایئر۔'' وہ چپکے سے اس کے نزدیک آ گیا۔

''ذوباریہ ڈر گئی۔ وہ ہنس پڑا، دوسرے ہی پل ذوباریہ بھی ہنس پڑی۔

''ٹو یو۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''یوں نہیں کسی اور طرح سے وش کرو۔ تاکہ سال بھر مجھے یہ پہلا دن یاد رہے۔''

''مثلاً کس طرح سے؟'' ذوباریہ نے نہ سمجھتے ہوئے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرے سر سے مجھے آپ چھٹی دلا دو۔'' اس نے معصوم سی صورت بنائی۔ ذوباریہ ہنس پڑی۔

''سال کے پہلے ہی دن چھٹی کی تو سارا سال چھٹیوں میں ہی گزرے گا۔ اس لیے آج کے دن چھٹی کرنا بدشگونی ہے۔ آپ آفس جائیں۔ پاپا کے پہلے ہی دو فون آ چکے ہیں۔'' جہاں داد کا منہ اتر گیا۔

''میڈم پلیز۔'' اس نے ذوباریہ کے شانے پہ ٹھوڑی ٹکا کر فرمائش کی۔

''اوں۔ ہوں۔'' ذوباریہ نے ہنس کر نفی میں گردن ہلا دی۔

''میری پیاری بیوی۔'' وہ بضد ہوا۔

ذوباریہ نے ہنس کر نفی میں گردن ہلا دی۔

''دس از مائی آڈر۔'' وہ استاد بنا۔ ذوباریہ دیر تک ہنستی رہی۔

''مگر آپ چھٹی کر کے کریں گے کیا؟'' وہ اظہار افزائی کرنے لگی۔ ''آپ کو دیکھیں گے۔موسم سے لطف اٹھائیں گے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''پھر تو قطعی آپ کی سفارش نہیں ہو سکتی۔'' ذوباریہ میز پہ ناشتا رکھنے لگی۔

وہ بے چین ہو کر اس کے پیچھے پیچھے آ گیا۔

''چلو اچھا۔کوئی اچھی سی مووی دیکھیں گے جو تمہاری پسند کی ہو۔''

''باز آئی میں آپ کے ساتھ فلم دیکھنے سے،فلم کم دیکھتے ہیں۔ڈائیلاگ کا عملی مظاہرہ زیادہ ہوتا ہے۔''

جہاں داد ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔''اس سے یہ ثابت ہوا کہ آپ کو اکیلے اکیلے محبت کرنے کا شوق ہے،ہم میدان میں آئے اور آپ ''بھگل'' ہو گئیں''

''واٹ ڈو مین،بھگل؟'' ذوباریہ اس نئے لفظ سے محظوظ ہوئی۔

''میدان چھوڑ کر بھاگ جانا۔'' وہ اس کے سوال پہ ہنس کر بولا۔

ذوباریہ سر جھٹک کر ہنس پڑی۔''ایک استاد کی یہ اردو۔''

''گاؤں کے ماحول کا کچھ اثر بھی تو ہونا چاہیے۔'' دوسرے ہی پل خوشی سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''سنو،کیوں نہ گاؤں چلیں؟''

''نا بابا نا۔یہاں اتنی سردی ہے تو وہاں کیا حال ہوگا۔''

ذوباریہ نے گاؤں کے خیال سے پناہ مانگی۔

''اسی لیے تو آفر کر رہا ہوں۔'' جہاں داد نے ہنسی دبائی۔ذوباریہ کے چہرے پہ کئی رنگ آ کر بکھر گئے۔

''اب کی بار میں اتنے موٹے سوٹ لے کر جاؤں گی کہ مجھے لحاف بھی اوڑھنا نہیں پڑے گا۔''

''ہا۔ہا۔ہا یعنی پیراشوٹ کا لباس۔''

ذوباریہ روہانسی ہو گئی۔

''اب تو بالکل بھی چھٹی لے کر نہیں دوں گی۔''

جہاں داد ہنستا ہوا چلا گیا۔پھر اس کے قریب آ کر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔

اینی وے۔میں خود فون کر کے کہہ دیتا ہوں۔سر!آپ کی بیٹی مجھے آنے نہیں دے رہی،مجھ سے زیادہ موسم کا اس پہ اثر ہو رہا ہے۔''

اگلے ہی پل شرم سے ذوباریہ کے ہونٹ سل گئے اور نگاہیں جھک گئیں۔جہاں داد اس کے پیچھے کھڑا تھا،مسکرا دیا۔پھر اسے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے اپنی ٹھوڑی اس کے شانے پہ ٹکا لی۔اور آہستگی سے بولا۔

''زیب!''

''ہوں۔'' ذوباریہ نے اپنے ہاتھ اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں پہ رکھ دیے جیسے اپنے تحفظ پہ ناز کر رہی ہو۔

''تم نے مجھے معاف کر دیا؟'' جہاں داد کے انداز میں جھجک بھی تھی اور ندامت بھی۔

ذوباریہ مسکراتے ہوئے اس کے کف لنکس چھیڑنے لگی۔

''محبت میں معافی کا کیا سوال؟'' ذوباریہ کی وسعت قلبی کے آگے اسے اپنا آپ بے حد حقیر لگا۔ اس نے تڑپ کر ذوباریہ کو اپنی طرف موڑ لیا۔

''میں نے تمہارے ساتھ بہت ظلم کیے ہیں زیب۔ بہت نادانیاں سرزد ہوئی ہیں مجھ سے۔ جائز اور ناجائز تم میرا ظلم سہتی رہی ہو۔ اس کے باوجود تم نے مجھے معاف کر دیا۔ کیا ایک دن بھی۔ ایک دن بھی۔ تمہیں مجھ پہ غصہ نہیں آیا یہاں سے بھاگ جانے کو دل نہیں چاہا۔ مجھ سے نفرت نہیں ہوئی۔ کیسی محبت تھی، تمہاری زیب...... آخر ایسا بھی کیا تھا مجھ میں۔''

ذوباریہ نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔

''میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو آپ مجھے کسی مرد کی طرح لگے تھے اور بس یہی میری تمام عمر کی محرومی کا احساس تھا۔ باوجود آپ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرنے کے میں کبھی اپنی ذات کا یہ در آپ پہ منکشف نہیں کر سکوں گی۔ کیونکہ اس سے میرے والدین کی زندگیوں پہ حرف آتا ہے۔ میں آپ سے سب کچھ شیئر کروں گی، مگر یہ راز نہیں۔''

''میں نے بھی تو آپ کو بہت ستایا ہے۔'' وہ اسے شرمندہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

جہاں داد نے اس کے صبیح روشن چہرے پہ نگاہ ڈالی۔ پھر ملال سے مسکرا دیا۔

''تم تو اپنا کفارہ ادا کر چکیں۔ میں تو تمام عمر اپنے رب کے حضور سجدہ ریز رہوں تب بھی خود کو معافی کے لائق نہیں سمجھتا۔''

اس نے ذوباریہ کی طرف دیکھا، پھر مسکرا کر بولا۔

''تم مجھے معاف کر دو گی وہ بھی شاید مجھے معاف کر دے۔''

ذوباریہ مسکرا دی۔ پھر اس کے گریبان کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''آپ نے کوئی خطا ہی نہیں کی، تو پھر معافی کا کیا سوال؟'' جہاں داد کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

پھر اس نے اپنے بازوؤں کا حلقہ اس کے گرد تنگ کر لیا۔

''تم نے واقعی مجھے محبت کرنا سکھا دیا۔ زیب! ایک دن میں نے سوچا تھا زیب۔ تمہیں ہمیشہ تڑپاتا رہوں گا۔ لیکن جو محبت ہوتی ہے ناں۔ کسی قیمتی خزانے کی طرح ہوتی ہے۔ جو بھی اس سے مالا مال ہو جائے اسے چھپانے پہ قادر نہیں ہوتا۔ بلکہ اظہار کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے جس طرح...... میں میں...... بے قرار رہنے لگا ہوں۔''

ذوبار یہ اس کی شدتوں کے سامنے خاموش تھی۔ وہ اس کے اس قدر نزدیک تھا کہ شرم سے وہ بول نہیں پاتی تھی۔

''کچھ تو بولو زیب!'' وہ اسے خاموش دیکھ کر چھیڑنے لگا۔ وہ کیا بولتی۔

بارش کوئی سی بھی ہو۔

اس میں بھیگتے ہوئے بوند بوند کا حساب نہیں دیا جاتا۔

وہ تو بس محسوس کرنے کا وقت ہوتا ہے۔

اس کا تن من۔ محبت کی بارش میں بھیگ رہا تھا۔

اس نے سرشاری سے اپنا سر جہاں داد کے سینے پہ ٹکا دیا۔ یہ سوچ کر کہ تمام جذبے لفظوں کے مرہون منت نہیں ہوتے۔

سال کا پہلا ہی دن کتنا خوبصورت تھا۔

یوں جیسے عمر کا ہر لمحہ، ہر نیا دن۔ کسی نوخیز دلہن کی طرح آراستہ و پیراستہ ان کا سواگت کرنے کے لیے تیار رہے گا۔

☆ ☆ ☆

ہوناں پھر یگلی

وہاج حسن جاہ مہمانوں سے فارغ ہو کر جب اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھے تو ان کے دل کی دھڑکنوں میں نہ کوئی طوفان موجزن تھا اور نہ ہی وجود میں ہلچل، نہ چال میں سرمستی تھی اور نہ ہی انداز سے سرخوشی جھلک رہی تھی۔ حتیٰ کہ پھولوں اور خوشبوؤں سے معطر سجا سنورا گھر بھی اس کے سوئے ہوئے جذبات میں محشر برپا نہ کر سکا۔

اور کرتا بھی کیوں۔ احساس تعلق سے وابستہ ہوتے ہیں۔ رشتوں سے منسلک ہوتے ہیں۔ جب رشتہ ہی ختم تھا تو پھر جذبے کیوں کر جنم لیتے۔ ان کے دل میں تو یہ تک احساس نہ تھا کہ جب اسے اتنی انوکھی رونمائی ملے گی تو اس کی کیفیت کیا ہو گی۔

وہ بڑے عام سے انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ معاً نگاہ بیڈ پر پڑی۔ وہ بیڈ پر موجود نہ تھی۔ انہوں نے تحیر سے ایڑیوں کے بل گھوم کر دیکھا۔ وہ صوفے پر سادہ سوتی لباس میں صاف ستھرے چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بالکل ایسے جیسے کسی آفس میں بیٹھی ہو، جیسے ابھی ابھی کوئی ماتحت کوئی فائل لے کر آئے گا۔ اور وہ سائن کر کے اٹھ جائے گی۔ ان کی پیشانی پر یکلخت کئی لکیریں ابھریں۔ بڑے تیکھے چتون سے اسے دیکھا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں بولے۔

”آپ کے ڈرامے کی ابھی کتنی قسطیں باقی ہیں۔ مجھے ایک بار ہی بتا دیجیے۔“

اس کی حرکت پر وہ اندر ہی اندر اس طرح تلملائے تھے، جیسے سیر کو سوا سیر مل گیا ہو۔

اس نے ایک گرم سی نگاہ ان پر ڈالی، کچھ کہنا چاہا تھا۔

لیکن وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اسے تحقیر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”یہ جو لباس تبدیل کر کے، چہرے سے رنگ و روغن اتار کے آپ سکون و اطمینان سے بیٹھی ہیں، مجھ پہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ میری پذیرائی نہ کر کے آپ اپنی اوقات میں اضافہ کر لیں گی تو ماہم جاہ، یہ آپ کی بھول تھی اور ہے۔“

ان کے جملے اسے بچھو کے ڈنک کی طرح لگے۔ چہرے پہ جو اطمینان نظر آ رہا تھا یکلخت ہی ہوا ہو گیا۔

”اوقات میں اضافہ سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ غصے سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔

”میں ایک پاک دامن لڑکی تھی اور ہوں۔“ اس نے تفخر سے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

''پاک دامن۔ آہ۔ پاک دامن۔ جس لڑکی کے۔ اتنے دوست ہوں۔''

''منہ سنبھال کر بات کیجئے حسن جاہ!'' وہ تحکم سے تیز لہجے میں بولی۔ جیسے اس کی شہ رگ پر کسی نے چھری رکھ دی ہو۔ یکلخت ہی وہ کھڑی ہوگئی۔

''اوہ۔ بہت برا لگا آپ کو میرا انداز۔''

انہوں نے ٹائی کھول کر بیڈ پر پھینکی، پھر کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہنے لگے۔

''مگر مجھے نہیں لگتا کہ آپ کو برا لگا ہو۔ کیونکہ پوز تو آپ واقعی خوب کر لیتی ہیں۔ کیوں لگا برا آپ کو یہ سب، اپنے چاہنے والوں کے نام خود ہی تو گنوانے آئی تھیں مجھے، میں تو نہیں گیا تھا آپ کے پاس پوچھنے، حساب کرنے کو کتنے لوگ آپ پر تھوک چکے ہیں اور ابھی کتنے باقی ہیں۔''

''حسن جاہ!'' وہ غصے سے کانپ گئی۔

''چلاؤ مت۔'' انہوں نے کوٹ بیڈ پر پھینکتے ہوئے سختی سے اسے حکم دیا۔ ''تمہیں شرم نہیں آئی یہ سب ناٹک کرتے ہوئے۔ اور اب شادی کے بعد جب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو تمہارا ڈوب مرنے کو دل نہیں چاہے گا۔ یہ بات لوگوں کے منہ سے سن کر، واقعی ماہم جاہ ہسٹریا کی مریض تھی، اور شادی ہی اس کا واحد علاج تھا۔

لعنت بھجتا ہوں میں تم جیسی لڑکیوں پر۔ جو اپنی غرض کے آگے اتنی خود غرض اور اندھی ہو جاتی ہیں کہ والدین کی عزت اور محبت کو بھی فراموش کر ڈالتی ہیں۔ ایک روز بھی ترس نہ آیا تمہیں اپنے باپ پر۔ ان کی حالت پر۔ کیسی۔ کیسی لڑکی ہو تم؟ نہ انسانیت ہے۔ تم میں نہ حیا اور نہ ہی ایمان۔''

''میں کہتی ہوں اگر آپ نے ایک لفظ بھی آگے بولا۔ تو۔ تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

''تم سے برا ہو بھی کون سکتا ہے۔

''وہ بیڈ کے کنارے سکون سے ٹک گئے اور موزے اتارتے ہوئے بولے۔

''تم جیسی آوارہ۔ بدچلن۔''

''حسن جاہ آگے۔ آگے کچھ نہیں بولنا'' اس نے انگلی اٹھائی۔

ضبط کی انتہا تھی۔ تنفس تیز سے تیز ہوتا جا رہا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہاج حسن جیسا مرد اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ اور وہ کتنے سکون سے یہ سب کہہ رہے تھے، نہ آواز اونچی ہو رہی تھی اور نہ اس کے جواب دینے پر سانسیں بے ہنگم۔

''میں اپنی تذلیل ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ سمجھے آپ۔ شرم آنی چاہیے یہ سب کہتے ہوئے آپ کو۔ بیوی ہوں میں آپ کی۔''

''بیوی!'' وہ تضحیک سے مسکرائے۔ ''بڑی خوش فہم حقیقت ہے، یہ آپ کے لیے'' انہوں نے گھڑی اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی۔

''آپ جیسی لڑکیاں سب کچھ بنائی جاسکتی ہیں۔مگر بیوی نہیں۔''

''آئینے میں بال سنوارتے ہوئے بڑے سکون سے کہا گیا۔اوراس کا بس نہیں چلا کہ کیا کرڈالے۔ان لفظوں پر کیا کچھ کردے۔

''اتنی بڑی گالی۔اتنی تضحیک۔

اس کا جی چاہا،اردگرد کچھ پڑا ہوتو جان تک لے لے اس شخص کی،جولاپروائی سے اس کی عزت تارتار کیے جارہا ہے۔اتنی دیر سے بلاوجہ ہی۔

''اگر یہی سب کچھ کرنا تھا تو انکار کیوں نہیں کردیا۔حسن جاہ؟''

''ہم۔مت۔ہمت۔نہیں تھی مجھ سے۔انکار کرنے کی۔''

''بڑا زور دے کر،گھوم کر جواب دیا گیا۔''بقول آپ کے۔مجھے تو کوئی لڑکی ہونا چاہیے تھا۔بغاوت۔سرکشی بےحیائی کی مردانہ صفات تو آپ میں موجود ہیں۔''

''انتہا ہوگئی۔حسن جاہ!میں کس شجرہ نسب سے تعلق رکھتی ہوں،خوب جانتے ہیں آپ۔اور یہ جو موٹی تہمتیں آپ مجھ پر لگارہے ہیں۔اس سے آپ خود بھی اچھی طرح واقف ہیں،کہ یہ سب سراسر بےبنیاد الزام ہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔مجھے کیا معلوم۔تم اپنی سابقہ زندگی میں کیا کچھ کرتی رہیں۔اورکس کے انتظار میں تم نے چار ماہ تک ناٹک رچائے رکھا۔''

''بس کیجیے حسن جاہ۔خدا کے واسطے۔ورنہ۔''

ورنہ کیا؟''

''ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔''نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھراگئی۔

''بخوشی۔!''انہوں نے مسکرا کر پورا کا پورا رخ اس کی طرف موڑا۔''سب جانتے ہیں کہ تم ابنارمل ہو۔اورابنارمل لوگ ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔''

''میں ابنارمل نہیں ہوں۔''وہ پوری قوت سے چلائی۔

مگر آواز اتنی پست تھی کہ بےبسی کے آنسوؤں میں رندھ گئی۔

''شادی کے پہلے ہی روز تمہاری بیاری بھاگ گئی۔یہی تکلیف تھی تمہاری؟''وہ تمسخر سے مسکرائے۔

''آپ اتنی گھٹیا اور نیچ طبیعت کے مالک شخص ہیں۔میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ تم جیسی۔لڑکی میری شریک سفر ہوگی۔ذرا بتاؤ میرے آنے سے قبل ہی تم نے دلہناپے کا روپ سنگھار کیوں اتار دیا۔کشش تو ان لڑکیوں کے لیے ہوتی ہے ناں۔ان باتوں میں جوان چھوئی ہوں۔بولو جواب دو۔ہے کوئی تمہارے پاس اس بات کا جواب۔''

''ہاں ہے۔ اور وہ یہ کہ مجھے نہ آپ سے اور نہ آپ کی ذات سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی کوئی انسیت ہے۔ جب میرے دل میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں تو پھر کیوں میں اپنی کھوکھلی ذات آپ کے حوالے کروں۔ سمجھے آپ، میں محبت کا سنگم دل سے چاہتی ہوں، وجود سے نہیں۔ اس لیے میں نے ایسا کیا۔ اور یہی جواز تھا جو میں آپ کو بتانے آپ کے آفس میں آئی تھی جسے آپ کے غبی ذہن نے گالی بنا کر مجھے لوٹایا ہے، جب میرے سامنے تمام راہیں مسدود ہو گئیں تو میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ پاپا کے اصرار پر سر تسلیم خم کر دیا۔ صرف ایک سوچ کے حوالے سے کہ نکاح ایک اٹوٹ بندھن ہے اور نکاح کے وقت ہی خدا فریقین کے دلوں میں محبت ڈال دیتا ہے۔ لیکن میں نے ابھی تک ایسا محسوس نہیں کیا اور جب تک میں ایسا محسوس نہیں کروں گا، ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہیں گے۔'' وہ قطعی انداز میں بولی۔

اس کی بات پر حسن جاہ کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ تن بدن میں آگ کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں گویا جہاں سے کھیل شروع ہوا تھا ابھی تک وہیں ہے، انہوں نے گہرا سانس خارج کیا۔

''بہت خوب۔ کیا ڈرامائی اور فلمی سچویشن ہے آپ کے دل کی۔ تو سینے ماہم جاہ! جیسا آپ چاہ رہی ہیں ایسا تو شاید کبھی بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ پیاسے کو پیاس لگتی ہے اور بھوکے کو کھانے کی طلب۔ پیٹ بھرا بندہ عالی شان سے عالی شان دستر خوان چھوڑ کر چلا جاتا ہے''

وہ مٹھیاں بھینچے کھڑی ضبط سے سنتی رہی۔ کس کی مجال ہوئی تھی آج تک اس کے سامنے اس قدر بکواس کرنے کی۔

اور وہ کہہ رہے تھے۔

''پھر جب نکاح جیسی مبہم آس باقی تھی آپ کے لیے تو آپ نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا۔ خاندان میں لڑکوں کی کمی تو نہ تھی اور پھر لوگ باہر بھی آپ کے نام کا کشکول لیے کھڑے تھے، آپ کے امیدواروں کی اتنی لمبی قطار، کہ آپ صبح نکلتیں منتخب کرنے تو رات کو ہی لوٹتیں۔ پھر آپ نے میرے ہی حق میں ووٹ کیوں دیا؟ خاندان کا بے ضرر سا شخص۔ بقول تمہارے پاگل، بدھو، احمق۔ اس لیے ووٹ دیا میرے حق میں کہ تمہارے عیبوں کی پردہ پوشی کر لوں گا۔''

''بکواس بند کریں۔''

''چلاؤ مت۔ یہ تمہاری بھول تھی۔ تم جیسی لڑکیاں تو مفت بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ نکاح کا تکلف تو ناحق خواری ہے اور کچھ بھی نہیں۔'' انہوں نے دانت پیس کر کہا۔ ''اور ویسے بھی...... آپ کے اور میرے دل میں ایک دوسرے کے لیے جب کچھ ہے ہی نہیں تو پھر اس تکلف کی بھی کیا ضرورت ہے۔ تم نے کہا تھا کہ میں انکار کر دوں، مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لیے بھی کہ میں والدین کے حکم کی سرکوبی نہیں کر سکتا۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہ کہ مجھے خاندان میں سرخرو ہونے کا مزید موقع مل رہا تھا۔ ایک پاگل لڑکی سے شادی کر کے میری توقیر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تو پھر میں کیونکر انکار کرتا۔

میرے فعل نے تو خاندان میں ایسے ایثار کی مثال قائم کی ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔

''اتنا خود پسند شخص'' وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''تو آپ نے مجھ سے صرف اس لیے شادی کی کہ لوگ آپ پر فخر کریں؟''

تو تم کیا سمجھ رہی ہو کہ میں تمہاری محبت میں مر رہا تھا۔ یا اس قطار میں شامل تھا جو صبح شام تمہارے امیدواروں کی تمہارے گھر کے آگے لگتی تھی۔ راشن بانٹنے والے ڈپو کی طرح۔ ہاں۔ بولو۔''

''جتنا طنز کر سکتے ہو کر لو۔ یہ فیصلہ اتنا غلط ہو گا، میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' وہ ملال سے کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔

''میری خواہش تو پوری ہو گئی۔'' وہ کہہ رہے تھے، مگر ضمیر ملامت کر رہا ہے۔'' وہ ہونقوں کی طرح انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

''اور وہ یہ کہ تم جیسی عورت میری بیوی ہو۔ نہیں دل نہیں مان رہا۔ بیوی تو بہت عظیم ہوتی ہے تم جیسی تو مجھے بہت مل سکتی ہیں، پھر میں تمہیں کیوں بیوی بنا کر رکھوں۔ کیوں اپنی ہی نظروں میں گروں۔ اس لیے میں نے طلاق کے کاغذات نکاح سے پہلے ہی بنوا لیے تھے۔ اور پھر فوراً بعد ہی تمہارے حق میں دستبردار ہو گیا۔

''کیا......؟'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ کیا کہہ رہے تھے، کیا یہ سچ تھا۔ وہ آنکھیں پھیلائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''یہ جو تم اتنی دیر سے خود کو بار بار میری بیوی کہہ رہی ہو۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔''

''کیا مطلب ہے؟ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہاج حسن، دوسرے کمرے میں گئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد پلٹے۔ ان کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا۔

''یہ طلاق نامہ ہے۔ شرعاً قانوناً ہر لحاظ سے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے، ایک دوسرے پر حق ختم کر چکے ہیں۔ لیکن ایک چیز تم مجھ سے لینے کی حق دار ہو اور وہ ہے حق مہر۔ یہ لو اپنا حق مہر۔''

انہوں نے دوسرا لفافہ بھی اسکے آگے پھینک دیا۔ کتنی ہی دیر وہ یوں ہی کھڑی رہی۔ جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اعصاب جیسے شل ہو گئے ہوں۔ لیکن پھر اسے جیسے یقین آ گیا۔

وہاج حسن جیسا خاندانی مرد یہ قدم اٹھائے گا۔ اسے امید نہ تھی، ہاں مگر یہ سب اگر اب نہ ہوتا تو کچھ روز بعد ہو جاتا۔ شاید اس کی طرف سے ہی خلع کی درخواست عدالت میں پہنچ جاتی۔ اتنا شکی؟ بد مزاج، کند ذہن، اجڈ قسم کا مرد، کیسے گزارا ہوتا۔ زندگی انتہائی تلخ ہو جاتی۔ لیکن۔ لیکن وہ ایک عزت دار خاندان کی عزت دار بیٹی تھی۔ کتنی بڑی قیامت تھی یہ اس کے لیے کہ شادی کی پہلی رات ہی طلاق یافتہ ہو گئی۔

ایک عورت کے لیے اس سے بڑا عذاب کیا ہو گا کہ اس کا شوہر اس پر بے بنیاد الزام لگا کر اس کے حق سے دستبردار ہو جائے۔ کتنی بے بس ہو جاتی ہے عورت اس لمحے، کوئی بھی تجویز نہیں اس قیامت کو روکنے کی۔ کوئی بھی سدباب نہیں، اتنا مضبوط رشتہ پل بھر میں تین لفظوں سے اس طرح ٹوٹ جاتا ہے جیسے کچا دھاگہ ٹوٹتا ہے۔

نکاح کے وقت جب تک دونوں فریقین کی طرف سے اقرار نہ ہو تو نکاح نہیں ہوتا۔ پھر طلاق کا حق صرف ایک ہی فریق کو کیوں۔

نکاح کے وقت عورت کی خاموشی بھی اقرار بن جاتی ہے۔

اور طلاق کے وقت وہ جتنا بھی چیخ کر انکار کر دے چیپ جائے۔ آنکھیں بند کر لے، پھر بھی طلاق ہو جاتی ہے۔ کیسا رشتہ تھا یہ۔

اور کیسا انصاف تھا۔ وہ جو اتنی تعلیم یافتہ تھی، دولت مند باپ کی بیٹی تھی، خود سر تھی۔ خود اعتماد تھی، بے باک تھی۔ وہ بھی کچھ نہ کر سکی اس لمحے۔ جو اتنی بے دردی سے رد کر دی گئی تھی۔ مرد کا ایک ہی تو اختیار عورت کے تمام حوصلے پست کر کے رکھ دیتا ہے اور پھر جو یہ اختیار استعمال کر لیں تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ نہ بلندی اور نہ پستی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا وجود ریت کی مانند ہوا میں بکھر گیا ہے، وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

پھر ایسا لگا جیسے یکلخت حواس میں آ گئی ہو۔ یہ کیا ہو گیا تھا، وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رو دی۔ آگے کیا ہو گا۔ وہ کہاں ہے، اسے کیا کرنا ہے۔ وہ سب کو کیا بتائے گا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔

انہوں نے طلاق نامہ اس کے سامنے سے اٹھا لیا۔ پھر جیب سے لائیٹر نکالا اور اسے چنگاری دکھا دی۔

وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔ کاش کہ وہ سوچ سکتی کہ بعد میں کیا ہو گا۔ تو وہ یہ ثبوت جسے عورت چھپاتی ہے۔ یہ داغ، جسے پیشانی پر لگوانا نہیں چاہتی۔ کبھی بھی جلنے نہ دیتی۔ یہ تذلیل کا داغ سنبھال کر رکھتی۔ لیکن شاید اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ آگے کیا ہو گا۔ وہ تو حواس میں جب آئی جب، جب طلاق نامہ جل بجھ کر راکھ ہو گیا۔ انہوں نے اس کے ذرے سمیٹے، پانی کے بھرے ہوئے جگ میں ڈال دیے سارا پانی سیاہ ہو گیا۔ اس کی تقدیر کی طرح۔

''اتنے بزدل ہو حسن جاہ کہ اپنے ہی فیصلے کو مٹا رہے ہو۔ سورج کے آگے ہتھیلی کر دینے سے اندھیرا نہیں ہو جاتا۔ شاید آپ نے سوچا نہیں۔ برملا کہیے کہ آپ نے مجھے طلاق دی ہے۔ ہچکچانے کی ضرورت کیا ہے۔'' شکستہ سا لہجہ تھا اور انداز میں بے پناہ تھکن تھی۔ پھر دزریدہ سی نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔

''اچھا کیا آپ نے یہ فیصلہ کر دیا۔ اگر یہ اب نہ ہوتا تو بعد میں ضرور ہو جاتا۔'' یکا یک انداز اتنا مضبوط اور خود سر ہو گیا تھا کہ وہ دیکھتے رہے۔ بڑی نفرت سے حق مہر کی رقم کا لفافہ اٹھایا اور ان کے منہ پر دے مارا۔

''یہ لیجیے میں نے آپ کو خیرات دی۔ میں ان چند سکوں کی محتاج نہیں ہوں۔ سمجھے آپ۔''

''ہاں، مگر جو آپ نے چار گھنٹے قبل اپنی عزت کا پرچم لگایا تھا، مجھ پاگل سے شادی کر کے، اس کے بارے میں نہیں سوچا کہ انجام کیا ہو گا؟''

اتنی حقارت تھی اس کے انداز میں کہ مقابل ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وہ سکون سے مسکرائے۔ ان کے چہرے پر، ان کی آنکھوں میں کیا تھا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ وہ اب ہنسے جا رہے تھے، وہ جو کبھی تھی، نہیں سمجھنا چاہتی تھی۔ اس لیے ان کی دماغی حالت پہ شبہ کرنے لگی۔

وہ بڑی فتح مندی سے اس کی طرف بڑھے اور اسے شانوں سے پکڑ لیا۔ وہ تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹی۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ آپ میرے لیے نامحرم ہیں۔''

وہ قطعی انداز میں نفرت سے بولی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ لگ ہی نہیں رہے تھے کہ حسن جاہ ہیں۔ احساسات ، چہروں کو اتنا بدل دیتے ہیں، اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''میں تمہارے لیے نامحرم کیسے ہوگیا۔ ہمارا نکاح ہوا ہے۔ جان من! چار گھنٹے پہلے۔''

''بکواس بند کریں۔ مجھے لگتا ہے آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' وہ نفرت سے چلائی۔

''دماغ خراب۔ میرا۔ ہاہاہاہا۔ پاگل تو تم ہو ماہم جاہ تم۔''

اس نے غیر یقینی کیفیت میں انہیں دیکھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ اس کی سوچ جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

''مجھے بلیک میل کر رہے ہیں؟'' وہ لہجے کی کپکپاہٹ دباتے ہوئے بولی۔

''یہی سمجھ لو۔'' وہ سکون سے مسکرائے۔

''آپ جیسا کمینہ شخص میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا۔'' وہ نفرت سے پھنکاری اور باہر جانے لگی۔

''تو اب دیکھ لو۔ تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ ماسوائے اس حسن کے۔'' انہوں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

''یا وحشت'' وہ چکرا کر رہ گئی۔

''شرم کیجیے۔ گھن آ رہی ہے مجھے آپ سے۔ مرد اتنا گر سکتا ہے۔ مت دکھایئے یہ روپ مجھے۔'' وہ پیچھے ہٹی۔

''گری ہوئی عورتوں کے ساتھ گرے ہوئے مرد ہی ہوا کرتے ہیں۔'' وہ سکون سے آگے بڑھے۔

''میں کہتی ہوں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔ میں کہتی ہوں مجھے ہاتھ مت لگانا میں شور مچا دوں گی۔'' اس کے انداز میں تحکم تھا مگر آواز میں واضح لرزش موجود تھی۔ آنکھیں چوکنا تھیں مگر وحشت سے۔

''مچاؤ شور۔ سب جانتے ہیں تم ابنارمل ہو۔ امید ہے سب کو کہ اس قسم کی آوازیں کمرے سے باہر آئیں گی۔ اس لیے کوئی تمہاری مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ کیونکہ پاگل چیختے ہیں، چلاتے ہیں، ہنگامے کرتے ہیں۔''

''میں پاگل نہیں ہوں۔'' بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو آ گئے۔

''آپ نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' آواز خوف سے پھٹی جا رہی تھی، سارا وجود پسینے سے شرابور ہو گیا۔

''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس، کہ میں نے تمہیں طلاق دی؟''

''اس نے چونک کر جگ کی طرف دیکھا۔ کاغذ کے ذرّے پانی پر تیر رہے تھے۔ طلاق نامہ جلانے کی وجہ اس کی سمجھ میں اب آئی تھی، اس نے انگلی سے بدقت تمام جگ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ...... یہ ثبوت ہے۔'' وہ لاپروائی سے ہنسے، پھر اسے بازو سے پکڑا، دوسرے ہاتھ سے جگ اٹھایا اور کھینچتے ہوئے باتھ روم میں لے گئے۔ اور سارا پانی فلش میں انڈیل دیا، پھر تیزی سے باہر نکلے۔

''ہے کوئی ثبوت تمہارے پاس؟'' انہوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''خدا کے خوف سے ڈریے وہاج حسن۔ خدا کے قہر سے ڈریے۔ آپ خود تو جانتے ہیں کہ آپ نے کیا کیا ہے۔''

بے بسی سے آنسو رواں تھے۔ ایسا خوف، ایسی کپکپی۔ ایسی گھبراہٹ اس سے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

''میں اپنی جان دے دوں گی، شور مچا دوں گی۔ مجھے لاوارث اور بے بس مت سمجھنا۔ یہ جو فعل آپ نے کیا ہے اس کا گواہ میرا خدا ہے، میرا دل ہے۔ میں سب کو بتا دوں گی۔ اپنے پاپا کو بتا دوں گی۔ ایک عورت اس معاملے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ میں اپنے پاپا کو سب سچ سچ بتا دوں گی۔ ہاں میں نے ڈھونگ رچایا تھا۔ لیکن آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے وہ سچ ہے، وہ حقیقت ہے۔ میں عدالت میں لے جاؤں گی آپ کو۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے آپ خود اقرار کریں گے کہ آپ خود میرے حق سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ میں معمولی لڑکی نہیں ہوں۔ بے بس و مجبور نہیں ہوں۔''

وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ اس کے قریب آئے، سختی سے اس کا چہرہ اوپر کیا۔

''تمہاری باتوں کا کون یقین کرے گا۔ جب تم اتنا بڑا ڈھونگ رچا سکتی ہو تو یہاں بھی جھوٹ بول سکتی ہو۔ خدا جانتا ہے، مگر خدا شہادت دینے کے لیے ولی تو نہیں بھیجے گا۔ لوگوں کو تم بتاؤ گی تو تم پر افسوس کریں گے، پیچھے بیٹھ کر ہنسیں گے۔ انہیں یقین ہے کہ تم پاگل ہو۔ اور یہ یقین تم نے خود دلایا ہے اور جب تک تم عدالت میں جاؤ گی، کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ پھر عدالت ثبوت مانگے گی۔ ثبوت ہے نہیں۔ میں اگر جھوٹ پر قائم رہوں تو بھی فتح میری ہے۔ کہ تمہاری دیوانگی کے سرٹیفکیٹ میرے پاس موجود ہیں۔ عدالت تو...... کیا خاندان والے بھی اس بات کا یقین نہیں کریں گے۔ کیونکہ میرا سابقہ کردار فرشتوں جیسا تھا اور ہے۔ ہاں البتہ۔ تم سے سب کو ایسی احمقانہ گفتگو کی توقع یقیناً ہو گی۔ وہ یہ کہہ کر مسکرائے۔

''اور اگر میں سچ عیاں کر دوں؟''

''پھر تو ماہم جاہ۔ تم کہیں کی بھی نہیں رہو گی۔ حتیٰ کہ خود اپنی بھی نہیں۔''

''کیوں۔ کر رہے ہیں آپ ایسا؟'' اس نے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھ لیے۔ وہ مزید کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔ بے تحاشا رو رہی تھی۔

''اس لیے کہ تم جیسی عورتیں اس قابل نہیں ہوتی کہ انہیں عزت دی جائے۔'' وہ بے رحمی سے بولے۔

''نہیں۔ حسن جاہ۔ نہیں۔ میں زندگی میں اس سے قبل کبھی بے بس نہیں ہوئی۔ میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں جوڑے۔ کبھی کسی کے پاؤں نہیں پکڑے۔ میں تم سے رحم کی بھیک مانگتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔ خدا کے واسطے۔ میں بہت بری تھی، آپ تو فرشتوں جیسے ہیں۔''

لیکن اس کی تمام التجائیں۔ آہ و بکا۔ آنسو۔ سسکیاں، سب بے سود تھیں۔ کیونکہ اس وقت وہاں کوئی فرشتہ نہیں بلکہ شیطان تھا۔

☆ ☆ ☆

رات بھر اتنا روئی تھی کہ اب آنسو بھی سوکھ چکے تھے۔ کیسی رات تھی یہ۔ اتنی ہولناک، اتنی قیامت خیز، اس کا سب کچھ چھین کرلے گئی اور وہ بے بس مجبور کچھ بھی نہ کرسکی۔ کاش...... یہ بھیانک سپنا ہوتا...... لیکن نہیں وہ تو زندہ حقیقت تھی۔ ایساڈاکا پڑا تھا اس کی عزت پر کہ لٹ جانے کا ماتم بھی نہیں کرسکتی تھی۔ کوئی مقام نہیں رہا تھا اس کا خود اپنی ہی نظر میں، اپنے رب سے رو رو کر اتنی معافیاں مانگی تھیں کہ اب تو لب بھی دعا کے لیے ہلنا بھول گئے تھے۔ دست دعا میں اثر تھا نہ التجاؤں سے فائدہ۔ کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ کچھ بھی۔

اس کا دل ذہن بالکل خالی تھا۔ آنکھیں ویران ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سکتہ کی حالت میں ہو۔ وہاج حسن، کب کمرے سے گئے، کون کون کمرے میں آیا۔ کیا کچھ ہوا۔ اسے کھلی آنکھوں نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا اور نہ سنائی۔ وہ ایک ایک کو دیکھ رہ تھی، سن رہی تھی۔ مگر سمجھنا جیسے اس کے بس میں نہ تھا۔ سب اس کے ساتھ اس طرح پیش آ رہے تھے، جیسی وہ کوئی کانچ کا نازک قیمتی انمول کھلونا ہو۔

سب جانتے تھے کہ وہ ابنارمل ہے اور پھر اس کا انداز بالکل ہونق چہرا۔ خالی خالی نگاہیں۔ اس بات کی تصدیق کر رہے تھے وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہی ہے۔

ورنہ ہر لڑکی کی زندگی کی یہ صبح تو بڑی یادگار بڑی انمول ہوتی ہے۔ شرماتی لجاتی۔ جھینپی جھینپی، بات بات پر سمٹ جانے والی۔ نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی کہ آنکھوں سے دل کا حال عیاں نہ ہو جائے۔ ایسی کھلی ہوئی جیسے بہار کا تازہ پھول۔ کوئی قوس قزح کا رنگ۔ لیکن وہ تو کوئی اجڑا ہوا چمن لگ رہی تھی۔ کسی کو کیا معلوم تھا وہ کیسی قیامت سے گزری ہے۔

وہ پاگل نہیں تھی، مگر پاگل معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بن نہیں رہی تھی، بلکہ لگ رہی تھی۔

خواتین اور لڑکیاں کمرے میں بھری ہوئی تھیں۔ بچے اس شوق واشتیاق سے اب بھی اسی طرح دیکھ رہے تھے، جیسے کل دیکھ رہے تھے۔

لڑکیاں کچھ چھیڑ چھاڑ کرتیں تو بڑی خواتین آنکھوں سے منع کر دیتیں۔ گویا منع کر رہی ہوں کہ وہ اپنے حواس میں کب ہے۔

کسی کو اس بات کی پرواہی نہیں تھی کہ اس سے پوچھیں کہ تم اس طرح کیوں بیٹھی ہو۔ ہمیں بتاؤ۔ بھلا کوئی کیوں پوچھتا، سب کے سامنے اس کا انداز چار ماہ سے یہی چل رہا تھا۔ کوئی خاص تبدیلی آتی تو کوئی اس کی بات پر غور کرتا۔

''ارے بھئی یہ کیا، دلہن اتنی اداس بیٹھی ہے؟''

اعظم چچا کی دلہن مہتاب جو خاندان کی چھوٹی بہو تھیں نے پوچھا۔ بڑی ہی شوخ وچنچل طبیعت کی مالک تھیں۔

انہوں نے کمرے میں آتے ہی ہلچل مچا ڈالی۔ ان کے آنے سے لڑکیوں کو بھی شہہ مل گئی۔ کمرے کا سکوت یکلخت ایسے ٹوٹا جیسے کسی نے جھیل میں کنکر مار دیا ہو۔ ادھر ادھر سے چٹکلے برسنے شروع ہو گئے اور وہ بس دیکھے جا رہی تھی۔

''دیکھو تو کیسی معصوم گڑیا لگ رہی ہے ہماری ماہم۔ روپ بھی تو کتنا آیا ہے۔''

کیا ان سب کو اس کی پیشانی پر گناہ کے داغ نظر نہیں آ رہے۔

''ماہم جاہ۔ آنکھیں دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے۔'' حسن جاہ کے لفظ سماعتوں میں بازگشت کرنے لگے۔ اس نے فوراً ہی آنکھیں

جھکالیں۔ کسی نے آنکھیں پڑھ لیں، تو وہ منہ چھپانے کے بھی قابل نہیں رہے گی۔۔

''ارے بھئی، ہم تو تمہاری چچی ہی ہیں۔ شرمانے کی بات کیا ہے ہم سے۔ ذرا یہ تو بتاؤ تمہیں دولہا میاں کیسے لگے۔ پسند بھی آئے یا بس گزارہ ہی کیا۔'' چچی خوب اپنے موڈ میں تھیں۔

''تائی جان اور بوا جی۔ پہلو بدل کر ان کی محفل سے اٹھ گئیں۔ البتہ منجھلی دونوں چچیاں خوب محظوظ ہو رہی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد مہتاب چچی کو تو اور بھی موقع مل گیا۔

''بھئی۔ وہاج کو تو بلاؤ۔ ہے کہاں وہ، دلہن تو ہم سے بول ہی نہیں رہی۔''

ماہم ہنوز خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''وہاج بھی اتنا ہی شرمیلا ہے اور تم بھی اتنا شرما رہی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے ساری رات ایک دوسرے سے شرماتے ہوئے گزر گئی ہوگی۔'' ساجدہ چچی کی بات پر بڑا بے باک قہقہہ پڑا۔

''واللہ...... پناہ...... پناہ...... یہ عالم ہے لڑکیوں کے ہنسنے کا اور شادی کے بعد ہنساؤ بھی تو نہیں ہنستیں۔'' فراج، اسد، زبیر۔ وغیرہ بھی اسی کمرے میں آ گئے۔ پہلے لڑکیوں کو ہنسنے پر ٹوکا۔

پھر ماہم کو خاموش بیٹھا دیکھ کر مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''تم لوگ دلہن کے کمرے میں کیوں آئے ہو؟'' سمیعہ اور رابعہ کو ناگوار گزرا۔

''دن میں ہی آئے ہیں رات میں تو نہیں۔'' اسد کا جواب تیار تھا۔ وہ دونوں ہی جھینپ گئیں۔ لڑکے دل کھول کر ہنسے۔

''ارے بھئی وہاج کو تو بلاؤ۔ کہاں رہ گیا وہ۔'' مہتاب چچی کو پھر یاد آیا۔

''ایسے چھپتا پھرتا ہے، جیسے کوئی جرم کیا ہو۔''

''بڑی چچی دلار سے بولیں۔ کہنے کا مقصد لڑکوں کو ذرا سی حیا دلانا تھا۔ لیکن وہ کہاں جھجکنے والے تھے۔

''اب یہ تو وہاج بھائی کو ہی علم ہوگا کہ انہوں نے جرم کیا ہے یا ثواب۔''

فراج گردن گھماتے ہوئے بولا۔ تو ایک بے ہنگم قہقہہ پھر پڑا۔ ساجدہ چچی نے مارنے کے لیے جوتی اٹھائی۔ ان کا یہی انداز تھا۔ ہنس بھی لیتی تھیں، پھر ٹوکنے کے لیے کبھی آنکھیں نکالنے لگتیں کبھی جوتی کی طرف ہاتھ بڑھا لیتیں۔

''پھر پوچھتی ہوں تجھے ابھی۔''

فراج کے جملے اس کے دماغ پر ہتھوڑے بن کر برسنے لگے۔ جیسے سب اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ جیسے سب کو علم ہے، سب ہی جانتے ہیں۔

وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔ سب ہنسنے کھیلنے میں مگن تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت اکیلی ہے، اتنا بڑا دکھ، اتنا بڑا حادثہ۔ وہ تنہا

کیسے سہہ پائے گی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے وہ برہنہ سر بازار کھڑی ہے، کیسے چھپائے خود کو کہاں جائے۔

''چل جا، جا کر وہاج کو بلا کر لا'' ساجدہ چچی نے فراج کو گھور کر کہا۔

''اعظم چچا کو مہم پر بھیجا ہوا ہے۔ دولہا کی دریافت کے لیے اور ان کے بعد سے تیسرا وفد جا چکا ہے۔ مگر آخری اطلاع آنے تک خبر یہ ہے کہ دولہا صاحب ابھی دریافت نہیں ہوئے ہیں۔''

وہ سکون سے کہہ کر بیٹھ گیا۔

اور دوسرے ہی لمحے اعظم چچا وہاج کو بہ زور بازو کھینچتے ہوئے لا رہے تھے۔

''بھئی۔ ان موصوف کو کوئی دولہا نہیں کہہ سکتا۔ وہ کمرے میں داخل ہو کر بولے۔

''السلام علیکم!'' خواتین کو دیکھ کر وہاج ٹھٹکے پھر مودب ہو کر سلام کیا۔

سلام کا جواب شاید ہی کسی نے دیا ہو۔ سب ان کی حالت پہ ہنس دیے۔ شکن آلود لباس۔ بکھرے بکھرے بال، خمار سے لبریز آنکھیں، بہکی بہکی چال۔

''بڑے قابل رحم لگ رہے ہو۔'' اعظم چچا نے انہیں صوفے پر پٹخا۔ پھر سانسیں ہموار کرتے ہوئے بولے۔

''سارے گھر میں جناب کو تلاش کیا۔ اور ملے کہاں سے۔ پوچھو۔''

''کہاں سے؟'' کورس میں پوچھا گیا۔

''اسٹور سے۔'' اعظم چچا نے بتایا۔

''اسٹور میں چٹائی پر لحاف میں لپٹے پڑے تھے۔ اور بچے ان پر کھیل رہے تھے۔''

''جیسے شیر پر چوہا کھیلتا تھا۔'' اسد نے اعظم چچا کے مبالغہ آرائی کو بڑھایا۔

وہاج ان کی بات پر جھینپ گئے۔ اور چہرہ جھکا کر آنکھیں مسلنے لگے۔

''اتنی نیند تو میاں ہمیں بھی نہیں چڑھتی تھی۔ اور لگتا ہے تم پر کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔'' اعظم چچا نے کان میں سرگوشی کی۔ انہوں نے سٹپٹا کر پہلو بدل لیا۔

''دائیں بائیں بیٹھے لڑکوں نے بغور سنا اور جی بھر کر محظوظ ہوئے۔

''ایسا بندہ جو بڑا محتاط رہتا ہو۔ کبھی بے تکلف نہ ہوتا ہو، جب لوگوں کے چنگل میں پھنستا ہے، تو بس پہلو ہی بدلتا ہے اور کچھ نہیں۔'' زبیر نے مسکرا کر کہا۔

جواباً وہ بھی بس مسکرا کر رہ گئے۔

''آپ موصوف جو سوتے پھر رہے ہیں کیا دلہن نے ناشتہ نہیں کرنا۔ وہ بے چاری کب سے بیٹھی ہے۔ منہ ہاتھ دھو آؤ۔ سمیعہ ناشتا لے کر آ رہی ہے۔''

مہتاب چچی کی بات پر انہوں نے چونک کر دیکھا۔

''انہیں آپ نے ابھی تک ناشتا نہیں کرایا۔ ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں۔'' ان کی بات پہ بے اختیار قہقہہ پڑا۔

لوگوں کے ہنسنے پر انہیں اپنی حماقت کا احساس بری طرح ہوا تھا۔

''دولہا، دلہن اکٹھے ناشتا کرتے ہیں۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو۔ جیسے کسی مریض کے کھانے میں دیر ہو جائے تو فکر مند ہو جاتے ہیں۔''

چچی نے ازراہ مذاق کہا تھا، لیکن ماہم کو لگا جیسے واقعی اسے مریض سمجھا جا رہا ہے۔ وہاج حسن کا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ تیزی سے اٹھے اور باتھ روم میں چلے گئے۔

''اچھا بھئی لڑکو! تم ایسا کرو، باہر جاؤ ہم ذرا دلہن کو تیار کر لیں۔'' مہتاب چچی نے سب کو باہر نکالا۔

''ہم بھی باہر جائیں۔'' اعظم چچا تساہل سے بیٹھے تھے۔ کان کھجاتے ہوئے بولے۔

''کیا آپ مردوں میں شامل نہیں ہیں؟'' زبیر نے دروازے میں گردن ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''لاحول ولا!'' وہ بری طرح سٹپٹا گئے۔ اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہی لڑکیاں اس جملے پر محظوظ ہو سکی تھیں۔

رابعہ اور عظمیٰ نے ماہم کے بالوں کا ہلکا سا جوڑا بنایا۔ پھر ہلکا ہلکا مناسب میک اپ کیا اور دوپٹے کو بڑی نفاست سے اس کے سراپے پر اوڑھا دیا۔

''زیور وغیرہ بعد میں پہنا لیں گے۔'' چچی نے منع کر دیا۔

''وہاج بھائی۔ جلدی آ جائیے۔ ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' سمیعہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی آواز لگائی۔

''مردانے سے پیغام آیا کہ اگر دلہن تیار ہو گئی ہوں تو اجازت دے دیجیے، کمرے میں آنے کی۔ کیونکہ دانش اور منصور تصاویر بنانے کے لیے بہت بے چین ہیں۔ بے چینی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ رات بھی امی حضور نے انہیں ڈپٹ کر بھگا دیا تھا۔'' جویریہ نے آ کر بات مکمل کی۔

''ٹھیک ہے۔ انہیں اندر بھیج دو۔'' چچی ساجدہ اور مہتاب نے کہا۔ وہ سب بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گئے۔ وہاج باتھ روم سے آستینوں کے بٹن بند کرتے ہوئے نکلے۔

''لیجیے۔ دولہا آ گئے۔ ویسے تو بہت ہی میلے کچیلے لگ رہے ہیں۔ لیکن دلہن کے پہلو میں بٹھا دیجیے ہو سکتا ہے کچھ رونق آ جائے۔''

''وہ جو وہاج کے سامنے سے کترا کر گزر جاتے تھے، اب انہیں بھی زبان لگ گئی تھی۔ بلکہ انہیں بھی چھیڑنا آ گیا تھا۔ ایسے ہی ہلکے پھلکے انداز میں جملہ بازی ہو رہی تھی۔

ساجدہ اور مہتاب نے پہلے ماہم کو صوفے پہ بٹھایا، سمیعہ جلدی جلدی ناشتا سینٹرل ٹیبل پر سجانے لگی منصور نے فلش آن کر دیا۔

''تصویر اس طرح لینا کہ ناشتا اور برتن بھی آئیں۔'' وہ اترا کر بولی۔ ''ماشاءاللہ خواتین کا بھی جواب نہیں۔ اپنی سلیقہ شعاری کا علم کہیں بھی گرنے نہیں دیتیں۔''

کمرے کا ماحول بہت خوشگوار اور ہلکا پھلکا تھا۔ پھر انہوں نے وہاج کو ماہم کے قریب بٹھا دیا۔

ان کے قریب بیٹھتے ہی وہ جیسے حواس میں آ گئی۔ رات کا ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتا چلا گیا۔ ایسا لگا جیسے وہ اب جاگی ہے۔

اپنی پامالی کا احساس پوری طرح سے رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا، وہ کیوں چپ رہے۔ سب کو بتا دے گی۔ یہ انسان نہیں بھیڑیا ہے، درندہ ہے، شیطان ہے، وہ ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ پردہ چاک کر دے گی۔

''ارے بھئی ذرا قریب ہو کر بیٹھو، تمہارے انداز نشست سے تو یوں لگ رہا ہے، جیسے تم دونوں علیحدہ علیحدہ سمتوں میں پرواز کرنے والے ہو۔''

چچی نے ماہم کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریب کرنا چاہا۔ لیکن اس نے سختی سے ہاتھ چھڑا لیا اور کھڑی ہو گئی۔

''کچھ نہیں یہ میرے۔'' وہ وحشت سے چلائی۔

سب ہکا بکا رہ گئے۔ جیسے اسٹاپ کر دیے گئے ہوں۔

''بھول ہے یہ آپ لوگوں کی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پاگل نہیں ہوں میں، اور یہ آدمی...... انسان نہیں ہے۔''

جانے وہ آگے کیا کہنا چاہتی تھی کہ چچی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ساتھ ہی اشارتاً لڑکوں کو باہر جانے کا بھی کہہ دیا۔

وہاج سر جھکائے بیٹھے رہے۔

سمیعہ بھاگ کر جلدی سے امی کو بلا لائی۔

ان کے ہمراہ دوسری خواتین بھی آ گئیں۔

''آپ میری بات کا یقین کریں۔ یہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔''

وہ بے بسی سے روتے روتے چچی کی باہوں میں مچل گئی۔

سب کو ماہم کی ذہنی حالت پہ بے پناہ ترس آ رہا تھا اور وہاج حسن بیٹھے ہوئے الگ قابل رحم لگ رہے تھے۔

''اے میری بچی کو کیا ہوا۔'' تائی جان نے اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔

''آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟'' اس نے ملتجی نگاہوں سے سب کو دیکھا۔ پھر سر جھکائے درندے نما انسان کو دیکھ کر زخمی شیرنی بن گئی۔

''یہ انسان نہیں ہے۔

''ماہم بیٹا! سنبھالو خود کو۔'' تائی جان رو بھی رہی تھیں اور اسے سنبھال بھی رہی تھیں۔ وہ اتنی بے بس ہوگئی کہ کسی بھی چیز پر بس نہیں چلا تو میز ہی الٹ ڈالی۔

''ماہم بیٹا! میری بات تو سنو۔'' تائی اماں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا اور تین چار خواتین کی مدد کے ساتھ وہ بیڈ تک آ گئی۔

''تائی جان میں پاگل نہیں ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوں، آپ یقین کریں۔ یہ شخص مجھے طلاق دے چکا ہے۔ میں اس کی کچھ نہیں لگتی۔''

اس کے جملوں پر سب ششدر رہ گئے۔ وہ کیا انٹ شنٹ بک رہی تھی۔ بھلا وہ ایک رات کی دُلہن جو ہوش وحواس میں ہو۔ یہ سب کیسے کہہ سکتی تھی۔ بڑی ناممکن اور غیر یقینی بات تھی۔ وہ جتنا بول رہی تھی۔ اتنا ہی ثابت کر رہی تھی کہ وہ پاگل ہے۔ اس کی گفتگو سے خجل ہو کر لڑکیاں بھی کمرے سے نکل گئیں۔

باہر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ سب ماہا کی حالت سے زیادہ وہاج پر ترس کھا رہے تھے۔ ان کی ہمت وضبط کو داد دے رہے تھے۔

وہ سمجھا سمجھا کر ہلکان ہوگئی۔ کسی نے اس کی بات کا یقین ہی نہیں کیا۔ وہ بے دم ہو کر تائی اماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بڑا سکون ملا تھا ان کی آغوش میں اسے۔ جیسے وہ پناہ میں آ گئی ہو۔

''یا اللہ میرے بچے کو ہمت واستقامت عطا فرما۔ اور اس بچی کو شفا دے۔ اس پر رحم کر۔ اسے عقل وخرد عطا فرما دے۔'' بلقیس بیگم دل ہی دل میں اپنے رب جلیل کے سامنے دعا گو تھیں۔

آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ اسے پانی پلا کر انہوں نے سکون سے لٹا دیا۔ کمرے سے آگے پیچھے خواتین اشک صاف کرتے ہوئے نکل گئیں۔

سمیعہ نے ہارون کو فون کر کے ماہم کی دوا کا کہہ دیا تھا جو اسے ایسی حالت میں دی جاتی تھی۔ سب لوگ کمرے سے نکل گئے۔ وہ بے دم سی پڑی رہی۔

خالی آنکھوں، خالی ذہن، وہ چھت کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہاج اپنی جگہ سے اٹھے، پھر قریب آ کر اس پر جھک گئے۔

''میرا خیال ہے اب تمہیں اچھی طرح سے یقین آ گیا ہوگا کہ تم واقعی پاگل ہو؟''

اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ دو اشک بند آنکھوں سے نکلے اور بہتے چلے گئے۔ جیسے بے بسی کی تحریر رقم کر رہے ہوں۔

''میں نے کہا تھا ناں ماہم جا کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔ باوجود چاہت کے مجھ سے چھٹکارا بھی نہیں پا سکتیں۔

وہ مسکراتے ہوئے سیدھے ہو گئے۔'' اس بات کا ثبوت تو تمہیں مل گیا ہوگا۔ اور اگر چاہو تو مزید کوشش کر دیکھو۔ کامیاب ہو گئیں تو بڑی خوش قسمتی ہوگی۔'' انہوں نے بڑی لاپرواہی سے کاندھے اچکا کر کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔

اتنی تذلیل۔ کون ہوتے ہو تم مجھے سزا دینے والے۔

بھلا کون......؟ وہ کروٹ لے کر سسک پڑی۔

اور جانے دوا کا اثر تھا۔ یا رتجگے کا۔ شام ساڑھے سات بجے آ کر سمیعہ نے اسے جگایا۔ بھوک کا احساس اس پر پوری طرح غالب تھا۔

سمیعہ اس کے لیے ہلکا سا ناشتا لے کھڑی تھی۔

''کل رات سے تم نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ اور اب بھی یونہی سو رہی ہو۔ کچھ کھا لو۔ پھر سو جانا۔''

وہ دوستانہ ماحول میں کہہ کر ناشتا میز پر رکھنے لگی۔ اس وقت صرف کھانے کی طلب تھی اور کچھ بھی نہیں۔ اس لیے وہ خاموشی سے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ پھر آہستہ روی سے چلتے ہوئے میز کے قریب آ گئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

''ہلکی غذا اس لیے لائی ہوں کہ کافی دیر فاقے کے بعد بھاری غذا نقصان دہ ہوتی ہے۔ بقول امی کے۔ اسکے بعد جو تم کہو گی لے آؤں گی۔'' سمیعہ نے مسکرا کر کہا اور چائے بنانے لگی۔

جواباً وہ مسکرا دی۔ پہلی بار وہ اس طرح مسکرائی تھی کہ اس کی شگفتہ مسکراہٹ سے سمیعہ کو کچھ سکون سا ہوا۔

''نہیں شکریہ۔ مجھے چائے کی ہی طلب ہو رہی تھی۔''

''چائے کے ساتھ ناشتا بھی ہے۔'' سمیعہ جھٹ بولی۔ وہ مسکرا کر ناشتا کرنے لگی۔

دوسرا کپ سمیعہ نے اپنے لیے بنا لیا۔ اور وہیں اسکے پاس بیٹھ گئی۔ دونوں خاموش تھیں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو سمیعہ اس سے اس وقت ہزاروں باتیں کر لیتی۔ لیکن اب بات کرنے سے پہلے ہر وقت یہی احساس رہتا کہ اس سے کیا بات کی جائے۔

''سمیعہ!''

''ہاں''

''ایک بات پوچھوں۔''

''ہاں، پوچھو۔'' سمیعہ ہمہ تن گوش تھی۔

''کیا تم مجھے پاگل سمجھتی ہو''

''نہیں تو۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''کیوں؟'' وہ تلخ ہونے لگی۔

آخر کیوں بہلا رہے تھے اسے سب۔

سمیعہ خاموش ہو گئی۔ بھلا کیا جواب دیتی، اس سے کسی بھی بے ہنگم حرکت کی توقع ہو سکتی تھی۔

ماہم کو اپنی تلخی اور سخت لہجے کا احساس ہوا۔

''جتنا ہنگامہ کروگی۔اتنا ہی ثابت ہوگا کہ تم ابنارمل ہو۔'' وہاج حسن کے لفظ بازگشت کرنے لگے۔
اس نے سکون سے گہرا سانس خارج کیا۔اسے یہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔اس وقت یہ سوال تو بڑا بے معنی ہے۔کوئی یقین نہیں کرے گا، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے۔اسے سمجھداری سے کوئی راہ نکالنی ہے۔
تھوڑے توقف کے بعد پھر بولی۔''سمیعہ'' لہجے کی حلاوت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔''
''ہاں بولو۔''
''تم اپنے بھائی کے بارے میں کتنا اور کس حد تک جانتی ہو؟''
''اس سوال پر سمیعہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
''اگر تم ہوش وحواس میں ہوتیں تو پہلی ہی ملاقات میں جان لیتیں کہ میرا بھائی کتنی محبت کرنے والا ہے۔نرم، ٹھنڈے مزاج کا مرد ہے۔ ایسا منفرد شیریں گفتار اور دھیمے لہجے والا کہ پورے خاندان میں ان جیسا ایک بھی مرد نہیں، کاش ماہم تم سمجھ سکتیں۔''
''سمیعہ نے اس کی طرف دیکھ کر چائے کی پیالی رکھی اور پھر کہنے لگی۔
''میں اپنے بھائی کے بارے میں صرف اتنا کہوں گی کہ دنیا میں فرشتے نہیں ہوتے۔لیکن وہاج بھائی جانے دنیا میں کیسے آگئے۔'' وہ اتنے مستحکم لہجے اور مان سے بولی کہ ماہم کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ عود کر آئی۔
سمیعہ نے اس کی تلخی کو محسوس کیا، پھر پیار سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
''میں اپنے بھائی سے بے حد محبت کرتی ہوں۔لیکن ان کی ذات سے زیادہ ان کی طبیعت سے متاثر ہوں۔یہ غصہ، رعب۔طنطنہ، مغلوب کرنے کی طاقت، ان سب باتوں نے مردوں کی انفرادیت کو ختم کر ڈالا ہے۔ہر مرد ان ہی ہتھیاروں سے لیس نظر آتا ہے لیکن میرا بھائی ان سب چیزوں سے ماورا ہے۔اسی لیے منفرد اور پرکشش ہے اور بے حد سلجھے ہوئے ذہن کا مالک ہے۔''
''تمہارا بھائی ہے ناں۔اس لیے ایسا کہہ رہی ہو۔'' وہ تلخی سے بولی۔
''ہرگز نہیں۔تم فراج کے بارے میں پوچھ لو۔وہ بھی تو میرا ہی بھائی ہے۔میں ذرا بھی مبالغہ آرائی نہیں کروں گی، اور صاف بتادوں گی، ایک نمبر کا بدمعاش ہے، کاہل وجود اور لفنگا ہے۔''سمیعہ نے مسکرا کر کہا۔''جبکہ وہاج بھائی۔سب سے یکسر مختلف اور شریف النفس انسان ہیں۔ اور میں ہی نہیں تم کسی سے بھی پوچھ لو، انہیں پرکھ کر دیکھ لو۔اور ان کا سابقہ کردار تمہارے سامنے ہی تو تھا۔'' وہ بس سوچ کر رہ گئی۔
''اگر کوئی تم سے آکر یہ کہے کہ تمہارے بھائی نے کسی کا قتل کیا ہے، تو کیا یقین کرلوگی؟'' اس نے تھکے ماندے سے انداز میں پوچھا۔
''کبھی بھی نہیں۔سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چاہے بتانے والا میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔میں یقین کر ہی نہیں سکتی۔'' وہ قطعی سے انداز میں بولی۔
''بھائی نے تو آج تک کوئی مکھی بھی نہیں ماری۔قتل تو خواب کی بات ہے، وہ قتل تو کیا جبر بھی نہیں کرسکتے۔اس قدر حساس دل کے مالک

ہیں وہاج بھائی۔“

”سمیعہ کے وثوق اور انداز پر ماہم جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ جیسے صرف سمیعہ ہی نہیں پورا خاندان پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہو۔

”اور تم میری بات کا کتنا یقین کرو گی؟“

”اس نے سمیعہ کی طرف دیکھا۔ سمیعہ ٹپٹا گئی، اس کا پہلو بدلنا ہی ماہم پر ثابت کر گیا کہ کسی بات کا بھی نہیں، کیونکہ تم حواس میں ہو ہی نہیں۔ لیکن دل رکھنے کو سمیعہ نے کہا۔

”تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ تلخی سے بولی۔ اور چائے کی پیالی لبوں سے لگائی۔ یکلخت ہی وہ آگ بن جاتی اور لمحے میں برف۔ بھلا ایسی لڑکی نارمل کیسے ہو سکتی تھی۔ جو سب کچھ جانتی بھی تھی، پھر بھی عجیب و غریب سوال کر رہی تھی۔

سمیعہ نے چوری نگاہ اس پر ڈالی۔ اس نے پر سکون انداز میں چائے کی پیالی میز پر رکھی۔ دفعتاً نگاہیں سامنے گئیں۔

وہاج دروازے میں کھڑے تھے۔ فتح مندی کی مسکراہٹ کے ساتھ۔ انہیں دیکھ کر وہ ہق دق رہ گئی وہاج فوراً دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

سمیعہ نے برتن سمیٹے اور جانے لگی، اس نے سمیعہ کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ بڑی معصوم تھی۔ جیسے دوسرے کمرے میں کوئی موت کا فرشتہ اسے نگلنے کے لیے تیار بیٹھا ہو۔ وہ کیوں رہ گئی تھی یہاں وہ کیوں بھول گئی تھی کہ سورج پھر ڈوبے گا۔

اور اس کی ذہنیت کا ایک ورق پھر سے سیاہ ہو جائے گا۔ وہ کیوں نہیں چلی گئی یہاں سے۔ کیوں رہ گئی سمیعہ رسان سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”سمیعہ! مجھے لینے کوئی بھی نہیں آیا۔“ اس کی آواز خوف و سراسیمگی سے رندھ گئی۔

”چچا اور ہارون لینے آئے تھے تمہیں۔ بہت ساری مٹھائی اور پھل کے ہمراہ لیکن اس وقت تم سو رہی تھیں (دانستہ نہیں کہا دوا لے کر) چچا تمہیں پیار کر کے چلے گئے۔ کل صبح ہارون تمہیں لینے آئے گا۔ اب تو رات ہو چکی تھی۔ اس لیے امی نے منع کر دیا۔ ویسے منصور اور شعیب وغیرہ تمہاری تصاویر بنانے کی خواہش میں اب بھی نیچے ڈرائنگ روم میں ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ اگر تم خود کو فریش محسوس کر رہی ہو تو تیار ہو جاؤ۔ نیچے چلتے ہیں، اور اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو آرام کر لو۔“

پھر رسان سے قمیص کا دامن چھڑاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تمہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بھائی آ گئے ہیں۔ امی نے انہیں جلدی اس لیے بھیجا ہے کہ تم خود کو اکیلا محسوس نہ کرو۔“

”نہیں۔ سمیعہ! مجھے۔ مجھے تمہارے بھائی سے ہی تو ڈر لگ رہا ہے۔“

اس کی آواز خوف سے پھٹ گئی۔ آنسو زار و زار بہنے لگے۔ اور پھر وہ بے چینی سے کھڑی ہو گئی۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے یہاں

سے لے چلو۔ خدا کے واسطے۔ مجھے بچالو۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔"

سمیعہ اس کی چیخ وپکار سے ہکابکا رہ گئی۔ وہ ایسی صورت حال میں کیا کرتی۔ نیچے جاتی تو اتنے سارے لوگوں میں پھر تماشا بنتا۔ بے شک سب جانتے تھے کہ وہ ابنارمل ہے۔ لیکن اپنا بھرم بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

پھر امی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی اسے دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتیں۔ اس نے ماہم کو پیار سے وہیں بٹھالیا۔

"ماہم! تمہیں بھائی سے کیوں ڈر لگ رہا تھا، اتنے اچھے ہیں بھائی۔"

سمیعہ کی آواز گلوگیری ہوگئی۔ کتنا دکھ ہو رہا تھا اسے ماہم کی حالت پر۔ کاش وہ بالکل صحیح ہوتی تو آج اپنے جیون ساتھی پر فخر کرتی۔ اس نے ترحم آمیز نظروں سے ماہم کی جانب دیکھا۔

"میرا خیال ہے سمیعہ! ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم جاؤ۔ اگر یہ گئیں تو ناحق تماشا ہوگا۔"

وہاج بڑے پرسکون انداز میں دوسرے کمرے سے نکلے۔ انہیں دیکھ کر سمیعہ کو...... کچھ سکون کا احساس ہوا کہ ماہم اس سے سنبھل نہیں رہی تھی۔ باہر بھاگنے کے لیے تیار تھی۔ وہاج کمرے میں آگئے تو ماہم ساکت وصامت ہوگئی۔ جیسے اگر ذرا بھی جنبش کی تو چھت اس کے سر پر آن پڑے گی۔ یا زمین پاؤں کے نیچے سے نکل جائے گی۔

"بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں ماہم۔ تم آرام کرو۔" سمیعہ نے ملائمت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

وہاج حسن اس کے پیچھے دروازے تک گئے اور کمرے کا دروازہ بند کر کے اس کی طرف پلٹے۔

اور اسے لگا جیسے وقت پلٹ کر پھر کل پر چلا گیا ہو۔

☆ ☆ ☆

ایک صبح اوراسی قیامت سے بیدار ہوئی۔ ناشتے کے بعد ہارون اسے لینے آ گئے۔

''ہیلو مائی سویٹ سسٹر مانو۔'' وہ مسکراتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوا اوراس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگاتے ہو بولا۔ ہارون کو دیکھ کراسے جانے کیسا احساس ہوا۔ایسا لگا جیسے اس کا سگا بھائی آ گیا ہو۔

اس کا محافظ، اس کا مان، اسے دیکھ کراس کی آنکھوں میں پانی اُمڈ آیا۔

''ارے۔ارے۔ارے تم رو رہی ہو۔ کتنی غلط بات ہے۔سب سمجھیں گے کہ میں نے تمہیں رلایا ہے۔شاباش جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آنسو صاف کرواور گھر چلو۔سارے گھر میاؤں۔میاؤں کی آوازوں کے بغیر ہاؤ۔ہاؤ کرر ہا ہے۔''

''تو تم نے بھوں۔بھوں کرنا چھوڑ دیا؟''

فراج نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہارون کی صفت بیان کی۔

''جی ہاں۔جب سے آپ لوگ ہماری مانو کو لے کر آئے ہیں۔''وہ مسکرا کر بولا۔

''اتنے میں وہاج بھی آ گئے۔''السلام علیکم دولہا بھائی۔'' ہارون نے شرارت سے سلام کیا۔

جواباً وہ بھی سادگی سے مسکرائے۔

سلام کا جواب دے کراسے بیٹھنے کی پیشکش کی۔

''وہاج بھائی! یہ تو ہمیں پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ ماہم بھابی کو گھر میں پیار سے مانو کہا جاتا رہا ہے۔

فراج نے جان بوجھ کر موضوع بڑھایا کہ ماہم بھی ان کے اس لطیف سے مذاق میں حصہ لے۔خواہ تھوڑی دیر کو مسکرا ہی دے۔

''تو اور کیا۔'' ہارون نے ہنس کر بتایا۔''اور وہاج بھائی۔جب یہ آپ کو تنگ کرے نا۔تو آپ۔شش۔کر دینا۔فوراً بھاگ جائے گی۔''

فراج، سمیعہ، جویریہ کے ہمراہ ہارون کی بات پر وہاج بھی بڑا دل کھول کر ہنسے تھے۔

اور وہ بالکل خاموش لب بھینچے بیٹھی تھی جیسے کچھ سن ہی نہ رہی ہو۔

کیسے ہنستی۔ کیوں ہنستی۔ کچھ بچا تھا ہنسنے کے لیے سوائے اپنے حال پر۔ سب ہنستے ہوئے اسے زہر لگ رہے تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر ہنس رہے ہوں۔اس کا دل چاہا سب کے منہ نوچ ڈالے۔

''کیوں ہنس رہے ہو تم لوگ؟'' اس نے بڑے تلخ انداز میں چڑ کر پوچھا۔

سب یک بیک خاموش ہو گئے۔

پھر اسے احساس ہوا کہ وہ سب اپنی بات پر ہنس رہے تھے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

وہ اس پر تو نہیں ہنس رہے تھے۔اس طرح کرنے سے وہ پاگل ثابت ہو رہی ہے۔ وہ سچ مچ پاگل ہو جائے گی۔

''میرے خدا۔'' وہ تیزی سے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ سب کو حیران و پریشان چھوڑ کر۔

☆ ☆ ☆

پاپا کے گلے سے لگ وہ کتنی دیر تک آنسو بہاتی رہی تھی۔

بے آواز ان سے معافی مانگتی رہی۔

مجھے معاف کر دیجئے پاپا۔ میں نے آپ کو بہت تنگ کیا ہے، بہت پریشان کیا ہے۔ والدین کا دل دکھانے والی اولاد کبھی بھی سکون سے نہیں رہ سکتی۔ بے شک آپ نے مجھے کبھی بد دعا نہیں دی ہوگی۔ لیکن مکافات عمل تو...... ضرور ہوتا ہے چاہے اس دنیا میں چاہے اس دنیا میں، اور شاید یہی میری سزا ہے کہ میں دن رات کانٹوں پر آبلہ پائی کا سفر طے کرتی رہوں۔

میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔ کہ میں پاگل نہیں ہوں، اگر آپ کو یقین آ گیا تو آپ کو کتنا دکھ ہوگا کہ آپ کی اولاد نے آپ کو دھوکا دیا۔ اتنا بڑا جھوٹ کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ سہنا تو دور کی بات ہے۔ اور پھر جیسے جیسے سب پر راز منکشف ہوں گے آپ دکھوں کی دلدل میں پھنستے چلے جائیں گے، آپکی بیٹی نے آپ کو اذیت دی۔ پہلا دکھ، پھر وہ طلاق یافتہ ہوگئی۔ دوسرا دکھ اور پھر وہ کہیں کی بھی نہیں رہی۔ تیسرا دکھ، آپ تو جیتے جی مر جائیں گے پاپا۔ پھر میرا کون ہوگا دنیا میں۔ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا میرا تو۔ اس دنیا میں۔ تو پھر میں ہی کیوں نہ مر جاؤں۔ خودکشی حرام ہے۔ مگر ہر روز حرام موت مرنے سے تو بہتر ہے کہ ایک بار ہی خود کو ختم کر لوں۔''

پاپا کے پاس وہ کتنی ہی دیر بیٹھی رہی، کس طرح والہانہ پیار کر رہے تھے وہ۔ جیسے وہ اور بھی انمول اور قیمتی ہوگئی ہو۔

بار بار ملازم کو آواز دے کر اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں منگوا رہے تھے۔ گھر کا گھر اس کے آگے پیچھے تھا اور وہ خاموش تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں مصمم ارادے کے ہمراہ آئی۔ دروازہ بند کیا۔ کچھ بھی کر لے گی مگر زندہ ہرگز نہیں رہے گی۔

سامنے دیکھا تو چونک گئی۔ صاحبان۔ زمین پر بستر لگائے بیٹھی تھی۔

''تم۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے انتہائی تلخ لہجے میں پوچھا۔ جیسے بلاوجہ ہی کوئی اسکے منصوبے میں مخل ہو گیا ہو۔

''بی بی جی۔ صاحب کا آرڈر ہے کہ میں اڑتالیس گھنٹے آپ کے پاس رہوں اور ایک لمحہ بھی آپ کو تنہا نہ چھوڑا جائے۔''

اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو ہوگئیں۔

''لیکن کیوں؟'' وہ چلائی۔

''اس لیے جی۔ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔''

صاحباں نے نظریں جھکا کر سادگی سے کہا۔ اور وہ چکرا کر رہ گئی۔ ایک دم ہی۔

ڈاکٹر ہاشمی کے الفاظ سماعتوں میں بازگشت کرنے لگے۔

''ہو سکتا ہے، شادی کے بعد یہ خودکشی پر آمادہ ہو جائیں، کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے مریض میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کو گناہ

سمجھتے ہیں۔اس لیے شادی کے بعد ان کا خاص رکھنا ہوگا۔رفتہ رفتہ پھر اس بات کو قبول کر لیں گی۔"

"مائی گاڈ!" وہ چکرا کر بیڈ پر گر گئی۔جیسے چاروں طرف سے اس پر جال تنگ ہو رہا ہو۔تمام راہیں مسدود ہو گئی ہوں۔اور وہ بے بس پنچھی کی طرح پنجرے میں پھڑ پھڑا رہی ہو۔نہ آزادی کا راستہ تھا اور نہ موت آسان تھی۔ماضی کے دریچے اس پر کھلتے چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

عشق کرو گے تو کماؤ گے نام!
تہمتیں بٹتی نہیں خیرات میں
عشق بری شے سہی پر دوستو
دخل نہ دو تم میری ہر بات میں

"سنا......" قمر نے مسکرا کر عاجز آ کر شعر پڑھا۔"اوہ تو گویا رنگ چڑھ ہی گیا۔ذرا ہمیں تو دکھاؤ آج تمہارے...... پاکھنڈی منگیتر نے تمہیں کیا لکھ بھیجا ہے، جو تم اتنا خوش ہو رہی ہو۔اور ہم پر پابندیاں لگا رہی ہو، کہ ہم دخل در معقولات کی جسارت نہ کریں۔" اس نے قمر کے ہاتھ سے گلابی خوبصورت کاغذ چھینتے ہوئے کہا۔

"آ......ہم......"

میری آرزو ہے کہ غیروں کو بھی!
میرا نام لے کر پکارا کرو!

"اب اتنا بھی اچھا نام نہیں کہ پوری کائنات میں بانٹ دیا جائے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"چھوڑو میرا خط۔" قمر نے کاغذ چھین لیا۔

لیکن اس نے دوسرا خط اٹھا لیا۔

پھر باآواز بلند پڑھنے لگی۔

یہ ستم اور عین اس رُت میں
آپ برسات میں نہیں آتے
کیا کروں اے عدم مزاج اُن کا
وہ میری بات میں نہیں آتے

بہت بے تاب

ظفریاب

''واہ......واہ کیا قافیہ ملایا ہے۔جیسے دعاؤں کا طالب۔ چچا غالب۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔

''شٹ اپ۔اسٹوپڈ گرل۔'' قمر نے خط پھر چھین لیا۔اس نے کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لیا۔دہکتے رخساروں پر حیا کی چلمن گرائے وہ خفا خفا سی لگ رہی تھی۔

اسے لطف آ رہا تھا۔نظر اٹھا کر ایک خط پھر اٹھا لیا۔

تیری باتوں میں زندگی کا رس

تیری آواز میں ہے رعنائی

اک طرف عاشقی سے ہم مجبور

اک طرف ہم کو خوف رسوائی

صبر کا حوصلہ نہیں باقی

حسن، بیکار، جان زیبائی

ہم نے مانا، تو خوبصورت ہے

دیکھ ہم کو تیری ضرورت ہے

''یہ ظفر صاحب سارے خط نظم میں ہی کیوں لکھتے ہیں، کیا نثر نہیں آتی انہیں۔اب بے چارے شاعر عاشقوں کے لیے تو نہیں چھوڑ گئے اپنے دیوان۔یا پھر نثر کی کتابیں نہیں ہیں ان کے پاس۔''

وہ شرارت سے بولی تو قمر آگ بگولا ہو گئی۔

''زیادہ بکواس نہیں چلے گی۔سنا تم نے۔اور یہ خطوط تم نے اس لیے کھلوائے ہیں کہ مجھ پر جی بھر کر تنقید کر سکو۔''

''نہیں اس لیے کہ سچے عاشق اور جھوٹے عاشق کی تحریروں میں فرق محسوس کرنا چاہتی تھی۔'' وہ سکون سے بولی۔

قمر تپ گئی۔''تو پھر کیا فرق محسوس کیا۔''

''کچھ بھی نہیں۔ایسا ہی تو سب کچھ دریز عظمت کہتا رہتا ہے۔بقول تمہارے وہ میرے لیے بہت سیریس ہے۔تم ظفریاب کے ان لفظوں پر۔ان چرائے ہوئے جملوں پر بلش ہو جاتی ہو۔یقین جانو دریز عظمت مجھے کیا کچھ کہتا رہتا ہے مگر ایک دن بھی جو من میں گھنٹیاں بجی ہوں، اور تم اپنے محبوب کا خط ہاتھ میں لیتے ہی سراپا گھنٹی بن جاتی ہو۔کیسے؟'' اس نے حیرانگی و بے چارگی سے پوچھا۔

''محبت کے معاملے میں لفظوں کے ہیر پھیر میں کبھی بھی نہ پڑنا۔محبت لفظوں سے نہیں جذبوں کی صداقت سے اثر انداز ہوتی ہے۔لفظ کبھی بھی نئے نہیں ہوتے۔بس احساسات انہیں نیا اور انوکھا بنا دیتے ہیں۔'' قمر سرشاری کے عالم میں خط سمیٹتے ہوئے بولی۔

''تو یہ ثابت ہوا کہ دریز عظمت بکواس کرتا تھا اس کے جذبے سچے نہیں تھے۔''

''واٹ......تھا۔ تھے، سے کیا مراد تمہاری؟'' قمر نے ہاتھ روک کر چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا اب وہ نہیں ہے، تمہارا مطلب کہیں تم نے۔''

''ہاں کل میں نے اس کی چھٹی کر دی۔''

''کیا؟'' قمر کو کرنٹ لگا۔ سخت غصہ بھی آیا۔

''آخر کیا کمی تھی اس میں؟''

''بس وہ، وہ نہیں تھا جو میں چاہتی تھی۔''

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' بڑا افسوس ہو رہا تھا۔ دریز عظمت کے ہاتھ سے نکل جانے پر۔

''اتنا ڈیشنگ بندہ تھا۔ لبرل تھنکنگ رکھتا تھا۔ فیوچر بھی برائٹ تھا۔ اور کیا چاہیے تھا تمہیں؟'' اسے سخت ملال ہو رہا تھا۔

''یہی بات اس نے بھی پوچھی تھی مجھ سے۔''

''پھر تم نے کیا کہا اور کب ملی تھیں تم اس سے؟''

''کل۔ وہ بھی اسی کے اصرار پر۔'' کہہ رہا تھا ممی کا لندن سے فون آیا ہے۔ مجھے بلا رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں۔ کامیاب ہو جاؤں۔ اس لیے میں تمہارے واضح جواب کا منتظر ہوں۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ میرا جواب مثبت ہوگا۔'' میں نے اس کے یقین کو دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔

''وہ کیوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''کیونکہ انکار کا کوئی جواز نہیں ہے۔''

''اچھا۔'' مجھے ہنسی آگئی۔

''دریز۔ کیا تم مجھے واقعی پسند کرتے ہو؟''

''نہ صرف پسند، بلکہ محبت بھی کرتا ہوں۔''

''کیوں؟''

''کیوں سے کیا مراد؟''

''میرا مطلب ہے کیا تمہیں میری شکل پسند ہے۔''

''ایسا ہے، مگر سو فیصد ایسا ہے نہیں۔ اگر سو فیصد ایسا ہوتا تو لندن میں ہی شادی کر لیتا۔''

''پھر کیا......؟'' میرا اسٹیٹس اور دولت؟''

''میرا خیال ہے میرے پاس یہ دونوں چیزیں پہلے ہی موجود ہیں۔'' اسے میرا سوال بہت برا لگا تھا۔

''ماہم! تم ایسے سوال کیوں کر رہی ہو؟ محبت کرنے کے لیے یہ چیزیں نہیں دیکھی جاتیں۔ یہ مادی اشیاء پسند کے پیمانے نہیں ہوتے، بلکہ محبت تو ان سب کو فراموش کر کے کی جاتی ہے، اتنی بڑی دنیا میں اتنے لوگ بستے ہیں۔ مختلف حوالوں سے ہم انہیں جانتے ہیں اور ان سے محبت بھی کرتے ہیں اور تعلق بھی رکھتے ہیں۔

لیکن وہ سب وہ خاص نہیں ہوتے۔ صرف ایک فرد خاص ہوتا ہے، جسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ شخص صرف میرے لیے ہے۔ میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تو مجھے لگا جیسے جیسے میری تلاش ختم ہوگئی ہے۔ اور''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مگر دریز عظمت! تم نے اپنے ہی لیے ایسا کیوں سوچا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونک گیا۔

''مطلب یہ کہ میری تلاش تو ختم نہیں ہوئی؟''

''لیکن کیا نہیں ہے میرے پاس؟'' وہ تڑپ کر بولا۔

''سب کچھ ہے تمہارے پاس۔ مگر وہ نہیں ہے جو میں چاہتی ہوں۔ جس طرح تم نے مجھے دیکھا اور محسوس کیا کہ میں تمہارے لیے ہوں۔ اسی طرح مجھے نہیں لگتا کہ تم میرے لیے ہو، جس دن کسی کے لیے میں ایسا محسوس کروں گی۔ میں سمجھوں گی کہ میری تلاش ختم ہوگئی۔ دریز۔ تم ایک روشن خیال مرد ہو۔ اس لیے میں تم سے اس طرح کی بات کر رہی ہوں۔

تم میں کوئی کمی نہیں، تم ایک مکمل شخص ہو۔ لیکن شاید تم میرے لیے نہیں کسی اور کے لیے۔ اس دنیا میں خاص فرد بنا کر بھیجے گئے ہو۔''

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

''ہمارے معاشرے میں عورت کو یہ اختیار نہیں ہوتا، ایسی تلاش تو مغربی ممالک کی لڑکیوں میں ہوتی ہے اور جو نہیں کبھی بھی مل نہیں پاتی۔ ساری زندگی وہ اس تلاش میں ایک کے بعد ایک مرد بدلتی رہتی ہیں۔''

مجھے اس کی بات پر شدید غصہ آ گیا۔

''دریز عظمت! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو شادی اور طلاق کے پہیے پر سفر کرتی ہیں۔ میں صرف ایک مرد کی محبت اور اسی سے شادی کی قائل ہوں۔''

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ جس مرد سے تم متاثر ہوئیں اور اسے دیکھ کر تم نے سوچا کہ تمہاری تلاش ختم ہوگئی تو کیا تمہاری زندگی مکمل ہو جائے گی، کیا اس مرد کی کوئی سوچ اور آئیڈیل نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے پھر یہ یکطرفہ صورت حال ہو۔ جیسے اب ہے۔ تو پھر تم کیا کرو گی؟'' وہ بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔

''اور پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری شادی زبردستی کسی ایسے فرد سے کر دی جائے جو نہ تمہاری سوچ کے موافق ہو، اور نہ ہی اس کی سوچ پر تم

پورا اترتی ہو۔تو پھر،ایسی صورت حال میں تم کیا کرو گی؟''

''مفاہمت۔مصالحت۔جو کہ مشرقی عورت کا آخری راستہ ہے۔''

''تو تم اب بھی کر سکتی ہو،مجھ سے۔مجھے بتاؤ تمہاری کیا سوچ ہے،میں اس پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

مجھے ہنسی آگئی۔''نہیں دریز عظمت!بتایا تو پھر کیا پایا۔''مجھے تھوڑا دکھ بھی ہوا۔

''یہ تو بالکل ایسے ہی ہو گیا جیسے عام سی صورت کو میک اپ سے بدل دیا جائے،اس طرح حقیقت تو نہیں بدلتی۔اگر بدلنا ہی ہوتا تو میں خود کو ہی نہ بدل لیتی،کتنی عجیب بات ہے دریز تم مردوں کی اتنی بڑی دنیا میں مجھے ایک بھی مرد متاثر نہیں کر سکا۔تم بہت اچھے ہو۔اور ہم بس دوست۔اور کچھ نہیں۔''

''میں انتظار کر سکتا ہوں۔''

''بے کار ہے۔میں نے بہت کوشش کی ہے۔دریز عظمت!میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی۔میں نے گہرائی سے تنہائی میں۔کئی بار تمہارے بارے میں سوچا ہے۔مگر مجھے ہر بار ایسا لگا جیسے میں تمہیں دھوکا دے رہی ہوں۔تم میرے لیے بے حد مخلص ہو،مگر میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکی۔بہتر ہے دریز عظمت ہم دوستی کی راہ پر چلتے رہیں۔اور بس۔''

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

''یہ تمہارے وہ گفٹس ہیں،جو تم نے مجھے محبت کے تعلق سے دیے تھے،اور یہ وہ گفٹس ہیں جب ہمارے مابین دوستی کا آغاز ہوا تھا۔یہ گفٹس میں رکھ رہی ہوں۔دوستی کے رشتے سے۔اور یہ کارڈز اور تحائف تم لے جانا۔یہ اس لڑکی کی امانت ہیں جو تمہیں چاہتی ہوگی۔''

''مائی گاڈ!''قمر نے ہاتھوں پر سر رکھ لیا۔''یہ تم نے کیا کیا۔اور۔کیا بنے گا تمہارا؟''

''کم از کم پیزا یا سینڈوچ۔ہرگز نہیں بنے گا۔''وہ سکون سے مسکرائی۔

''تمہیں ملال نہیں ہو رہا کہ تم نے کتنا احمقانہ فیصلہ کیا ہے شاید پہلی بار،لوگ دعائیں مانگتے ہیں،ایسے رشتوں کے لیے،اور تم ہو کہ۔''

''میں کیا کروں۔مجھے لگتا تھا کہ میں وقت ضائع کر رہی ہوں۔''

''لیکن وہ تو تم سے محبت کرتا تھا۔''

''مگر مجھے تو اس سے محبت نہیں تھی۔''

''یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔محبت شادی کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔''

''مگر تمہیں تو ظفریاب سے قبل از وقت محبت ہو گئی ہے۔''

''اس لیے کہ میں مردوں کو اپنے پیمانوں پر نہیں پرکھتی۔''

''کیا جتنی بھی لڑکیاں ہیں۔وہ سب تمہاری جیسی سوچ رکھتی ہیں۔''

''پتا نہیں۔ میں تمام لڑکیوں کی سوچ پر سردے نہیں کر رہی ہوں۔'' قمر نے انتہائی جل کر کہا۔

''اور جو تم کر رہی ہو ناں۔ اچھا نہیں کر رہی رہو۔ روؤ گی، پچھتاؤ گی۔ وقت ہمیشہ آگے چلتا ہے، پیچھے نہیں لوٹتا۔'' قمر نے تاسف سے کہا۔

''اتنے اچھے اچھے لوگ تمہاری زندگی میں آئے ہیں اور تم نے کسی کو بھی منتخب نہیں کیا۔ آخر تمہاری سوچ کیا ہے۔ مجھ پر صرف ایک جملے میں واضح کر دو۔ شاید میں تمہاری کچھ رہنمائی کر سکوں، مرد کی کس خصوصیت سے تم متاثر ہو سکتی ہو۔

اگر خوبصورت۔ تو فیصل ہمدانی بے حد خوبصورت تھا، پھر وہ تمہارا انتخاب کیوں نہیں بنا؟''

''خوبصورتی صنفِ نازک کی صفت ہے، مردوں میں یہ خوبی نہیں دیکھی جاتی۔ کمر پتلی ہے۔ رنگ گورا ہے کٹاری سی آنکھیں ہیں۔ یہ وصف لڑکیوں پر جچتے ہیں۔''

''تو پھر کیا۔ شجاعت۔''

''وہ تو ہر مرد میں اسی طرح ہوتی ہے جس طرح لڑکیوں میں حیا۔ یہ اور بات ہے کچھ میں کم، کچھ میں زیادہ۔ بہر حال فطرتاً یہ عنصر موجود ہوتا ہی ہے۔''

''اور پھر ذوار شاہ۔ بھول گئیں۔ سی بی آئی سب انسپکٹر اونچا لمبا چوڑا۔ چہرے پر کتنی سختی۔ اور آنکھیں کتنی روشن تھیں اسکی دلیری سے ایک عالم ڈرتا تھا۔ اور جب وہ لڑکیوں کے پاس سے گزرتا تو یوں لگتا جیسے اس کا ایک ایک قدم لڑکیوں کے دل پر پڑ رہا ہو۔ کیا ایک بھی قدم تمہارے دل پر پڑا؟''

''اگر ایسا ہوتا تو یہ دل آج اسی کے نام ہو چکا ہوتا۔ پتا نہیں کیوں۔ باوجود جاہ و حشمت کے وہ مجھے متاثر نہیں کر سکا۔''

''وجہ۔ کیا اس نے اظہارِ محبت میں عجلت پسندی سے کام لیا؟'' قمر نے انتہائی جل کر پوچھا۔

''نہیں۔ اس میں وہ بات ہی نہیں تھی جو میں چاہتی تھی۔'' سکون سے جواب دیا گیا۔

''مثلاً۔''

''مثلاً جس طرح تم اسے دیکھ کر پیشانی پر سے پسینے کے قطرے پونچھنے کے لیے پلو سے الجھنے لگتیں، اسی طرح نہ مجھے پسینہ آیا اور نہ ہی پلو میں الجھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اگر میرے ساتھ ایسا ہوتا تو میں سمجھ لیتی یہ بندہ سیدھا آنکھوں میں من میں اُتر گیا ہے۔ مگر میرے تو من میں نہیں اترا تھا وہ۔ یہ اور بات تھی کہ میں اس سے گھبراتی ضرور تھی۔''

''یہی تو میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں۔ یہی تو اصل بات ہے۔ آج تک دنیا میں مجھے کوئی ایسا مرد نہیں ملا جس سے میں گھبرا گئی ہوں۔ آنکھوں میں پانی، چہرے پر سرخی۔ کبھی کسی شوخ سے جملے پر من میں گھنٹیاں نہیں بجیں۔ کیا ہے یہ۔ اور کیوں ہو جاتی ہیں لڑکیاں ایسے میں، میں بھی تو لڑکی ہوں، تمہارے جیسی، ایک عام سی لڑکی، باوجود چاہت کے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیوں پیش نہیں آتا؟''

''اسے تم محبت کہتی ہو؟'' قمر نے بے حد حیرانگی سے پوچھا۔

''محبت نہیں، مقابل کی شخصیت کا ایسا اثر چاہتی ہوں، جو مجھ پر پوری طرح سے غالب آجائے۔ جو میری نظر سے لے کر میرے حواس تک اڑا لے۔''

''مائی گاڈ۔ یہ زندگی ہے زندگی۔ کوئی فلم، ڈراما تھیٹر نہیں کہ پردہ اسکرین پر کوئی دیوتا نمودار ہوگا اور تم اسے دیکھ کر اس کے قدموں میں جھکتی چلی جاؤ گی، اور کھو گی۔ ہاں تم ہی ہو، وہ دیوتا جس کی مجھے تلاش تھی۔''

''تم میری بات نہیں سمجھ رہی ہو۔ مجھے کسی دیوتا کی تلاش نہیں۔''

''تو پھر کس چیز کی تمنا ہے تمہیں؟''

''طیب فردوس سے لے کر دریز عظمت تک تمہیں کوئی بھی متاثر نہیں کر سکا اور اب بھی تم کہتی ہو کہ دریز عظمت دنیا کا آخری مرد تو نہیں تھا جو ملال کیا جائے۔ بہت اچھا طریقہ ہے زندگی کو انجوائے کرنے کا۔ میں تو حیران ہوں کہ اتنے آزادانہ راہ ورسم رکھنے کے باوجود تم ابھی تک بچی ہوئی کیسے ہو۔ جانتی ہو تمہارا یہ فعل بھیڑیوں کے بیچ میں سے شکار تلاش کرنے کے مترادف ہے، اور تم ہرن ہو، شکار بھی ہو سکتی ہو۔'' قمر نے اسے جھنجھوڑا۔ ڈرایا۔

وہ اطمینان سے مسکرادی۔ اور گلے کی زنجیر سے کھیلتے ہوئے بولی۔

''مجھے تو لگتا ہے۔ مجھے شکار کرنے والا پیدا ہی نہیں ہوا۔''

''یہ سب انکل کی بے جا آزادی کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔''

سارے خط دراز میں ڈال کر قمر نے زور سے دراز بند کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔

''انکل کی اکلوتی اولاد ہونے کا فائدہ مت اٹھاؤ۔ آگ سے کھیلنے سے ہاتھ ہی جلتے ہیں۔ حاصل کچھ نہیں ہوتا۔''

اب وقت گزر جانے کے بعد۔ شاید وہ فراموش کر چکی تھی۔ اس نے صرف اتنا سنا تھا۔

کہ ''تمام لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ پیار کی بھوکی، چاہت پر مرمٹنے والی۔ ذرا پیار سے بول لو تو گلے کا ہار بن جاتی ہیں، میٹھی نگاہوں سے دیکھ لو تو قربان ہو جاتی ہیں۔ ان سے کھیلنے کا لطف ہی کچھ اور ہے اور تم بھی صرف اسی کھیل کا حصہ تھیں۔''

اس مردانہ آواز پر اس نے ایڑیوں کے بل گھوم کر پیچھے دیکھا۔ کہنے والے کے چہرے پر بڑی لاپروائی اور سکون کا راج تھا۔ جبکہ مقابل کھڑی لڑکی خود سے بھی آنکھیں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

یہ جملے گرم سلاخ کی طرح اس کے دل میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً پندرہ یا سولہ برس ہوگی اور کالج میں شاید تیسرا یا چوتھا دن۔ اس وقت اس میں نہ تو اتنا شعور تھا کہ سوچ سکے کہ کہنے والا اتنے اعتماد سے ایسا کیوں کہہ رہا ہے اور نہ ہی اس بات کا ادراک کر سکی کہ یہ سب سن کر اسے شدید غصہ کیوں آیا۔ اور ایک دم ہی ان جملوں کو جھٹلانے کی خواہش نے جنم کیوں لیا۔

حالانکہ یہ سب اسے تو نہیں کہا گیا تھا لیکن وہ بھی لڑکی تھی۔ اور وہ سب لڑکیوں کے لفظ میں شامل تھی۔ کیسی کیفیت سے دوچار تھی، اس وقت

وہ۔اس نے آنکھیں جھپکا کر لڑکی کو دیکھا، جو تحیر سے آنکھیں پھیلائے ہراساں سی کیفیت میں کھڑی جاتے ہوئے لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔جانے والے کی چال میں کتنی سرشاری تھی۔جیسے پیاسا سیر ہو کر جا رہا ہو۔اور اس کے قدموں کی دھول یہی لکھ رہی ہو۔

''تمام لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔پیار کی بھوکی، چاہت پر مر مٹ جانے والی۔''

وہ لڑکا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔بے ارادہ اس کی نظر لڑکی پر پڑی۔اسے لڑکی سے ہمدردی یا نفرت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

بس خالی الذہن وہ آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی رہی۔مقررہ وقت پر اسے بھی ڈرائیور لینے آ گیا۔

اس کی کیفیت ایسی تھی، جیسے......اس کی......قابلیت سے بڑھ کر اسے سوالنامہ تھما دیا گیا ہو، حل کرنا تو کجا، وہ تو اس شش و پنج میں تھی کہ یہ سوال کس طرح تخلیق ہوئے۔

اس کا ذہن مسلسل محو پرواز تھا۔کیا سب مردوں کا سب لڑکیوں کے بارے میں یہی نظریہ ہے، اس نے نظریں اٹھا کر خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے الٰہی جان کو دیکھا۔وہ بھی تو ایک مرد تھا۔اس کی بھی کوئی سوچ ہو گی۔لڑکیوں کے بارے میں، مگر سارے راستے اس نے اپنے آپ کو ہر قسم کے سوال سے باز رکھا۔اسی کشمکش میں سارا راستہ طے ہوا خاموشی سے گھر میں داخل ہوئی۔

ہارون لان میں مالی سے الجھ رہا تھا۔

تکرار کی وجہ یہ تھی کہ وہ سفید گلاب کی بند کلی لینا چاہتا تھا۔جبکہ مبارک چاچا اسے ادھ کھلی کلی دینے سے انکاری تھا۔

چونکہ اس گھر کے ملازمین بہت پرانے تھے، اس لیے بچوں کے ساتھ ان کا رویہ بزرگانہ ہوتا۔

ہارون بھی اپنے نام کا ڈھیٹ ہی تھا۔بالآخر کلی توڑ ڈالی اور تیزی سے باڑھ پھلانگ گیا۔

اس نے رک کر ہارون کو دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔اس کے خلاف معمول رویہ پر ہارون چونکا۔حالانکہ جب بھی وہ آنے سامنے ہوتے جھڑپیں ضرور ہوا کرتیں۔

جو سوال اس کے ذہن میں سارے راستے پرورش کرتا رہا تھا۔اس کا جواب اسے گھر آتے ہی مل گیا۔

کہیں دور جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ہارون سیماب طبیعت کا مالک تھا۔اتنی رنگینی تھی اس کے مزاج میں، آئے دن......نت نئے عشق میں گرفتار نظر آتا۔اور اپنے عشقیہ قصے اسے بھی لطف اندوز ہو کر سنایا کرتا۔اور وہ بس ہنسا کرتی۔اب بھی وہ پھول کسی محبوبہ کے خط کے ساتھ پیش کرنے والا تھا، اسے خاموشی سے جاتا دیکھ کر اس کے سامنے آ گیا۔وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

ہارون نے بڑے ہی دلربا انداز میں پھول اس کے سامنے کر دیا۔اس کا انداز صلح کن تھا کہ صبح ناشتے کی میز پر ان کے درمیان کھٹ پٹ ہوئی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہے۔

لیکن اس کا پھول دینے کا انداز۔اسے لگا جیسے ہارون بھی اسے انہی لڑکیوں جیسا سمجھتا ہے۔

حالانکہ اس سے قبل اس نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔لیکن یہ تو اس کی سوچ تھی، جانے وہ کیا سوچ رکھتا تھا اور یوں اس کا تمام مردوں پر

سے اعتبار اٹھ گیا۔اس نے پھول نہیں لیا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

بہت تجزیہ کیا اس نے اپنے اردگرد کے ماحول کا لوگوں کا۔ مبتلائے عشق اسے بہت سارے لوگ نظر آئے۔لیکن یہ محبت نہیں تھی۔وقت گزاری کے چکر تھے۔محبت کسی سے،عہدو پیمان کسی سے،شادی کسی سے،ہرجائی مرد،سمجھوتوں پر آمادہ ہو جانے والی لڑکیاں۔

کیوں تھا ایسا۔اس کے اندر سوال ابھرا۔وہ عمر ایسی تھی جہاں ریت سے گھروندے بنانے کی خواہش ہوتی ہے،آسمان پر کہکشاؤں کے ساتھ سفر کرنے کی خواہش،تارے گننے کی عمر۔

لیکن یہ سب وارد ہونے سے پہلے ہی اس کے وجدان پر منکشف ہو گیا کہ محبت کچھ نہیں ہے۔دھوکا ہے،فراڈ ہے۔وہ نرم جذبے جو خود بخود جنم لے لیتے ہیں،اس کی انا نے انہیں کچل ڈالا،ضد نے بے رحمی سے دل کی زمینوں کو ویران کر دیا اور اس نے اپنے عمل سے یہ جواب لوٹایا کہ لڑکیاں پیار کی بھوکی نہیں ہوتیں۔

وہ تو سراپا محبت ہوتی ہیں۔دان کرنے پر آئیں تو سب کچھ لٹا دیں۔اور پھر بھی اس کے عوض کچھ نہیں مانگتیں۔تمام لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔

محبت کی بھوکی نہیں ہوتیں۔

یہ جواب لوٹانے کے لیے اس نے سب سے پہلے اسی لڑکے سے محبت کی بلکہ اسے محبت کرنے پر مجبور کیا۔جس نے سب سے پہلے محبت کا گھناؤنا روپ اسے دکھایا تھا۔وہ ذہین تھی،خوبصورت تھی بھی اور بہت ساری نمایاں خصوصیات کی حامل تھی۔جلد مرکز نگاہ بن گئی۔

اویس عالم۔بڑا کھلاڑی قسم کا لڑکا تھا۔اگر وہ خود اس کے راستے میں بچھ جاتی تو وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر کبھی بھی نہ دیکھتا۔اس کے غرور اور لاپروا انداز نے اویس کو غیر ارادی طور پر اس کی طرف متوجہ کیا۔ڈیڑھ سال تک اس نے اپنے پیچھے اویس کو دوڑایا۔جو چیز حاصل نہ ہو۔وہ انتہائی پرکشش ہوتی ہے۔اسے حاصل کرنے کی شدت،جنون کی صورت اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔اویس کو ہر بار اپنی پسپائی کا احساس ہوتا رہا۔لیکن وہ اپنی شکست ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔اور یہی دل لگی،دل کی لگی بن گئی اور جب اویس نے اپنے جذبوں کی پاکیزگی کا یقین کرتے ہوئے اس سے اظہار محبت کیا تھا تو کتنی بلند ہو گئی تھی۔وہ اس لمحے شاید اسی وقت کے انتظار میں تھی۔بڑے اعتماد سے اس نے کہا تھا۔

"سنو اویس عالم!لڑکیوں کے بارے میں تمہارا نظریہ غلط تھا۔اسے بدل دو،وہ پیار کی اور چاہت کی بھوکی نہیں ہوتیں۔ہاں وہ دھوکا کھا جاتی ہیں اور دھوکا دینے والے تم جیسے ہی ہوتے ہیں۔یاد رکھنا ساری لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔

اور جانے اس نے کیا کچھ کہا تھا۔کہ اویس کھڑا دیکھتا ہی رہا۔بہت یقین دلانا چاہتا تھا اپنی محبت کا،لیکن وہ نہ رکی اور چلی گئی۔

اس نے اپنی ذات کا دفاع کیا۔یہ بری بات نہیں تھی،لڑکیوں کو یہ سوچ دی تھی کہ انہیں محتاط رہنا چاہیے۔یہ بھی کوئی برائی نہ تھی۔یہاں تک تو بات ٹھیک تھی،لیکن جب اسے اپنی فتح مندی کا احساس پوری طرح سے ہو گیا کہ وہ صنفِ مقابل کو آسانی سے پسپا کر سکتی ہے تو اس میں غرور سا سما گیا۔بالکل ایسا ہی غرور۔جیسا ابلیس میں حد سے زیادہ عبادت کر کے سما گیا تھا اور پھر وہ فرشتے سے شیطان بنا دیا گیا تھا۔

اسے اس کھیل میں بڑا لطف آتا۔نت نئی دوستیاں کر کے،لڑکوں کی انسلٹ کر کے۔

زندگی اس سرشاری کے عالم میں گزرتی رہی اس کے اردگرد سب کچھ ویسا کا ویسا ہی تھا۔

وہ مرد جو اس کی طرف بڑھے تھے اب کہیں دوسری طرف مصروف ہو گئے تھے۔اور وہ لڑکیاں جو اسے سراہتی تھیں،اس کی تعریف کرتی تھیں۔وہ بھی اپنے اپنے بوائے فرینڈ زیا منگیترز میں اچھی طرح اٹیچڈ تھیں۔اگر وہ میانہ روی سے چلتی تو آئیڈیل لڑکی کہلاتی اس نے تو انتقاماً ایسا کیا تھا۔انتقام فتح مندی کے اعزاز سے سرشار ہو کر غرور میں تبدیل ہو گیا تھا۔اب وہ بہت بلندی پر جا بیٹھی تھی۔

اس کی بہت قریبی دوست قمر جب اپنے منگیتر کی باتیں کرتی تو وہ حیرانگی سے سنتی اس کا منگیتر اسے جب خط بھیجتا تو وہ اس طرح خوش ہو جاتی جیسے ہفت اقلیم کی دولت اسکے ہاتھ لگ گئی ہو۔

شروع شروع میں تو وہ اس کا بہت مذاق اڑایا کرتی۔تمام باتوں کو جھوٹا تصور کرتی لیکن اسے یقین آ گیا کہ محبت کوئی ماورائی چیز نہیں۔سچی طاقت ہے۔

یہاں اس کی ذات نے نیا رخ لیا۔ظفریاب کے خط پھر ان دونوں کی باہم ملاقاتیں،پھر ملاقات کے بعد قمر کی باتیں،اسے یہ سب اچھا لگنے لگا۔اس کا دل چاہنے لگا کہ اسے بھی کوئی چاہنے والا ملے۔لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

جب اس کی تلاش شروع ہوئی تو ذہن اس حد تک پختہ ہو گیا کہ ہر بات اسے لطیفہ لگتی۔یہی سب کچھ کہنے والوں کو تو وہ ٹھکراتی آئی تھی۔کیا فرق تھا سچی اور جھوٹی محبت میں۔کچھ بھی نیا نہیں تھا۔حقیقتاً وہ اپنی ذات کے تمام قفل بند کر کے،غرور کے قلعے میں مقید ہو گئی تھی۔تمنائی تھی اس بات کی کہ اس کے در پہ بھی دستک دے۔

دستک دینے والے ہاتھ اب بھی بہت تھے۔لیکن جو سامنے تھے اس کی خواہش کے مطابق نہیں تھے۔جو پس عکس تھے وہ ان کی کھوج میں رہتی۔لیکن اسے اپنا گوہر مقصود نہ مل سکا۔لیکن اسے یقین کامل تھا۔کہ جس کی اسے تلاش ہے وہ اسے ضرور ملے گا۔چاہے وہ کوئی بھی ہو،اور کیسا بھی ہو،یہ دل اس کی شناخت کی گواہی ضرور دے گا۔لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا،اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی منزل۔راستے کے ساتھ سفر کر رہی ہے۔

اسے تعجب ہوتا کہ دنیا اتنی بڑی ہے،اور اسے جیتنے والا کوئی ایک بھی نہیں۔

مگر آس پھر بھی باقی تھی،لیکن یہ دنیا یک بیک چھوٹی پڑ گئی۔اس لمحے جب پاپا نے فائنل ایگزام کے بعد اس کی شادی کا تذکرہ کیا۔

ابھی تو رزلٹ بھی نہیں آیا تھا۔ابھی تو......وہ ہواؤں پہ سفر کر رہی تھی۔ابھی تو اس کی تلاش شروع ہوئی تھی کہ پاپا نے ذکریا اچکزئی کا رشتہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔یا وحشت۔وہ چکرا کر رہ گئی۔

جیسے وہ پھولوں کی خوبصورت کیاریاں لگا رہی ہو اور کوئی آ کر کہہ دے۔نہیں صرف ایک ہی کیاری لگاؤ۔جیسے شیلف میں کتابوں کی ترتیب بنا رہی ہو،اور کوئی صرف ایک کتاب تھما دے،کہ صرف یہی پڑھو۔

پاپا کے حتمی انداز پر وہ بری طرح مشتعل ہو گئی۔انہوں نے کہا تھا رشتہ بہت اچھا ہے،سمجھداری سے فیصلہ کرنا۔وہ مسلسل خاموش تھی۔دن

گزرتے رہے، بالآخر اس نے انکار کر ہی دیا۔

پاپا نے پوچھا تھا کہ کوئی اور پسند ہے تو بلا جھجک بتا دے۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی اور عاجزی سے بولی۔

''پاپا! بات یہ نہیں ہے۔''

''بات یہ نہیں ہے، بات وہ نہیں، تو پھر بات کیا ہے۔'' وہ اس کے انکار کو جذباتی سوچ سے منسوب کر رہے تھے۔

''بس میرا موڈ نہیں ہے۔'' آخر ٹالنا بھی تو تھا۔

وہ اس کی بات پر مسکرا دیے۔ ''شادی کوئی تفریح نہیں، جو موڈ پر ڈیپنڈ کرے۔ وہ مشفق انداز میں سمجھانے لگے تھے۔ ان کے بھرپور دلائل کے آگے وہ تھک ہار کر وقتی طور پر خاموش ہوگئی۔ کہ آخر کیا راہ نکالے اور کیا جواب دے۔

''آخر یہ والدین اولاد کو اتنی آزادی اتنے اختیارات دیتے ہی کیوں ہیں۔ جب انہیں کرنی ہی اپنی ہوتی ہے۔''

''تم تو ایسے چراغ پا ہو رہی ہو، جیسے بھاگتے بھاگتے تمہاری لگام کھینچ لی گئی ہیں۔'' قمر اس کے اشتعال پر محظوظ ہو رہی تھی۔ پھر کہنے لگی۔

''والدین کی دی گئی آزادی، اولاد کے پاس امانت ہوتی ہے۔ اچھی اولاد وہی ہوتی ہے، جو اس امانت میں خیانت نہ کرے۔''

اور پھر انہوں نے یہ بھی تو کہا ہے کہ اپنی پسند انہیں بتا دو۔''

یہی تو مصیبت ہے کہ انہیں کیا بتاؤں۔''

''تو پھر ہتھیار ڈال دو۔''

''یہ ناممکن ہے۔''

''آخر ذکریا میں برائی ہی کیا ہے۔''

''مائی گاڈ! وہ اتنا سوکھا، لمبا بانس کا بانس، اور شکل دیکھی ہے اس کی۔''

''زندگی میں پہلی بار شاید وہ کسی مرد کو شکلاً برا کہہ کر ریجیکٹ کر رہی تھی۔ اور وہ بھی قمر کے سامنے۔

''خوبصورتی تو صنف نازک کے وصف ہیں۔ مردوں میں یہ خوبی تو نہیں دیکھی جاتی۔'' قمر کی بات پر وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔

''اچھا زیادہ بکواس نہیں کرو۔''

''اس سے لاکھ درجہ بہتر تو دریز عظمت تھا۔''

''قمر نے اس کے لفظوں پر تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''رفتہ رفتہ تمہیں ماضی کے تمام کردار یاد آئیں گے اور اپنی غلطیوں کا احساس بھی ہوگا۔ جنہیں تم نے اپنی پرچھائیں سمجھ کر پس پشت ڈال دیا تھا۔ اب مڑ کر دیکھو گی تو تمہیں اپنا سایہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ کیونکہ جو لوگ روشنیوں سے آگے نکل جاتے ہیں ان کے سائے نہیں بنتے۔''

''میں تمہارے پاس اس لیے نہیں آئی تھی کہ تم خوامخواہ کی نصیحتیں لے کر بیٹھ جاؤ...... بندہ مشورہ نہ دے سکے تو نصیحت بھی نہ کرے۔'' وہ

جل کر بولی۔

''یہ ناصح تو دو چار دن کا مہمان ہے چلا جائے گا، پھر تمہاری بیوقوفی کی گاڑی کے آگے کوئی اسپیڈ بریکر نہیں ہوگا، جی بھر کر دندناتی پھرنا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ خوشی سے چلائی۔

''شادی کے بعد ظاہر ہے، بحرین ہی جانا ہے۔'' قمر سکون سے بولی۔

''اتنی جلدی۔'' وہ بے حد ایکسائٹڈ ہو رہی تھی۔

''ہاں ظفری آئے ہوئے ہیں مختصر چھٹیوں پر۔''

''ظفری۔ اِی۔'' وہ مسکرائی۔ انداز ستانے والا تھا۔

''یہ پیار کے انداز ہیں مائی ڈیئر!'' قمر نے چڑایا۔

''پھر تو وہ تمہیں ضرور قمری کہتے ہوں گے۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ قمر نے مارنے کے لیے کشن اٹھالیا۔

اچانک ہی ظفریاب آن ٹپکے۔ وہ قمر کو شاپنگ کیلئے لے جانے کیلئے آئے تھے۔

قمر خفت سے سرخ ہوگئی۔ اور وہ چہرا جھکائے کھی کھی کر رہی تھی۔

''بیٹھیے ناں۔'' بدقت تمام قمر نے ہی پیش کش کی۔ اسے ہنسی ضبط کرنا بے حد مشکل ہو رہا تھا۔

وہ بیٹھ گئے۔ ''بہت مصروف ہیں آپ ماہم؟'' انہوں نے اسے چہرہ جھکائے کچھ کرتے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں زائچہ نکال رہی ہوں۔'' وہ باز نہیں آئی۔

''کس کا؟'' انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''قمری اور ظفری مہینوں کے ملاپ کا۔''

''وہ کہہ کر تیزی سے بھاگ گئی تھی۔ اور اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ظفریاب دل کھول کر ہنسے تھے۔ جبکہ قمر گلنار ہوگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے سوچا جتنا فارغ رہے گی۔ پاپا کی توجہ ہنوز اس پر برقرار رہے گی۔ اس لیے اس نے آفس جانا شروع کر دیا۔ کام وام تو کچھ کرنا آتا نہیں تھا۔ بس یونہی سوچ تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنے کے موقع فراہم ہوں گے۔ بس یونہی مونگ پھلیاں، چلغوزے کھاتی پھرتی رہتی۔

ہارون نے آفس کا ڈسپلن تباہ ہوتے دیکھ کر اسے ڈانٹا۔

''یہ جو تم کوڑا پھیلاتی پھر رہی ہو، کون سمیٹے گا اسے؟''

''تمہیں کس لیے رکھا ہوا ہے۔'' وہ لاپروائی سے کہہ کر چلتی بنتی۔ ہارون جز بز ہو کر رہ جاتا۔

وہ بھلا کب اس کے رعب میں آتی تھی۔

ایک روز قمر نے کہا تھا۔ ''اکثر لڑکیاں مردوں کے رعب سے ہی متاثر ہو جاتی ہیں۔ کیا تمہیں ہارون نے بھی متاثر نہیں کیا؟'' تو وہ ہنس دی تھی۔

''یہ جو رعب جتانے والے مرد ہوتے ہیں ناں۔ بڑی دوغلی طبیعت کے مالک ہوتے ہیں، اپنے لیے ان کا نقطہ نظر کچھ ہوتا ہے، اور گھر والوں کے لیے کچھ۔ اس لیے ہر بات میں ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے ہیں۔ اور مجھے آزاد خیال مرد پسند ہیں۔ ہارون جیسا نہیں۔'' ہارون اس کا کزن تھا۔

کلیم اللہ جاہ چھ بہن بھائی تھے۔ اور ایک بہن اور پانچ بھائی۔ سب سے بڑے سیف اللہ جاہ۔ پھر حسیب اللہ جاہ۔ پھر کلیم اللہ اور اس کے بعد سدرہ آپا۔ پھر عظیم اللہ اور اعظم تھے۔ سب بہن بھائیوں کے پانچ پانچ، چھ چھ بچوں سے کم بچے نہیں تھے۔ ماسوائے کلیم اللہ جاہ کے انہیں خدا نے صرف ایک بیٹی ہی عطا کی تھی۔ ماہم چھ سات سال کی تھی کہ ان کی شریک سفر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی تھی۔

ماہم کی خاطر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اندازہ ہوا کہ وہ تنہا زندگی گزار سکتے ہیں، مگر تنہا بزنس نہیں سنبھال سکتے۔ باپ بڑھاپے کی طرف جاتا ہے تو بیٹا جوان ہو کر باپ کا سہارا بنتا ہے، لیکن اس سہارے کا نام ونشان ہی نہ تھا۔ سو انہوں نے بڑے بھائی۔ حسیب اللہ کے بڑے بیٹے ہارون کو مانگ لیا۔ حسیب اللہ نے بخوشی ہارون کلیم اللہ کو دے دیا۔

اس وقت ہارون ایف ایف سی کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا کہ مستقل چچا کے ہاں آ گیا۔

اس وقت ہارون ہی ان کا انتخاب کیوں بنا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ صرف حسیب اللہ کے ہاں ہی چار فرزند تھے۔ دوسرے یہ کہ ہارون کا رجحان شروع سے ہی چچا کی طرف بہت زیادہ تھا۔

پہلی بار جب سہیلیوں نے ہارون کو ان کے گھر میں دیکھا تو بڑے اشتیاق وانبساط سے ہارون کے متعلق پوچھا۔

تو اس نے مسکرا کر تعارف کرایا تھا کہ ہم نے انہیں گود لیا ہوا ہے۔ ہارون اس کے یوں متعارف کرانے والے انداز پر چڑ جاتا وہ اکثر ہی لوگوں کو یونہی بتاتی تھی۔

''تم نے لیا تھا مجھے گود؟'' اس نے جل کر پوچھا۔

''پاپا نے تو لیا تھا ناں؟'' اسے چڑانے میں مزا آتا۔

''جی نہیں میں پیروں سے آیا تھا۔'' اس نے جتلایا۔ (اس کے نزدیک گود کا مطلب گود میں ہی آنا ہوتا تھا)

''دنیا میں......؟'' ناز نے مسکرا کر متعجب انداز میں پوچھا۔

ایک جاندار نسوانی قہقہہ پڑا۔

''جی نہیں چچا کے ہاں۔'' وہ کب باز آجانے والا تھا۔ گھور کر چلتا بنا۔

اب بھی......اسی طرح ان میں......نوک جھونک چلتی رہتی۔ وہ بات کہنے سے باز نہ آتی اور وہ جلنے کلسنے سے نہ رکتا۔ ہر بار اسے دھونس دیتا کہ وہ اپنے گھر چلا جائے گا۔ مگر وہ اس کی دھونس کو خاطر میں کب لاتی تھی۔ پاپا کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ اپنی سوچ سے آگاہ کردے۔ وہ الجھ کر رہ جاتی۔ زندگی کے گرد دائرہ کتنی تیزی سے تنگ ہو رہا تھا۔ آخر وہ کیا فیصلہ کرے اور کیا جواب دے۔ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا سو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ انتہائی سنجیدگی سے آفس میں کام کرے گی تاکہ نہ ہارون کو شکایت لگانے کا موقع ملے اور نہ ہی پاپا کو بار بار اس کی شادی یاد آئے۔ یہ سوچ بڑی بچکانہ تھی، حقیقتاً تو اس نے اپنے مفاد کی خاطر یہ سنجیدہ فیصلہ کیا تھا۔

کہ اس کی تلاش بھی جاری رہے گی اور پاپا کی نظروں میں......سرخرو ہونے کا موقع بھی ملتا رہے گا۔

''ہارون۔ یہ لیٹر ٹائپ کرا کے میرے کمرے میں پہنچا دو۔ شام کو میٹنگ ہے اور مجھے پاپا کی فائل تیار کر کے رکھنی ہے۔''

''اوہ ہو۔ آج کل تو بڑے کام شام ہو رہے ہیں۔'' ہارون نے تمسخر اڑایا۔

''آخر پاپا کا بزنس۔ مجھے ہی سنبھالنا ہے۔'' وہ فرضی کالر جھاڑتے ہوئے تفاخر سے بولی۔

''بڑی جلدی ہوش آ گیا۔'' اس نے پھر طنز کیا۔ وہ چڑ گئی۔

''کیا تم میرے باپ کا سارا بزنس غبن کر چکے ہو؟''

''لڑکی! زبان سنبھال کر بات کیا کرو۔'' ہارون کو سچ مچ بہت برا لگا۔

''اس وقت آفس میں اونلی پرسنل سیکریٹری ہو، اور کچھ نہیں۔''

''تو تم کون سا پارٹنر ہو۔ ایک پیون والی حیثیت ہے تمہاری۔''

وہ جواب دینے کے لیے مقابل کو کوڑی کا کر دیتی یہ تک نہ سوچتی کہ یہ لفظ اس کے لیے کتنے خسارے کا باعث بن سکتے ہیں۔ بس برابر کا جواب دینا مقصود ہوتا تھا۔

ہارون سے برداشت کرنا بے حد مشکل ہو گیا تھا۔ وہ غصے میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے شام تک آجائے گا مگر وہ نہیں آیا۔ وہ اپنے کہے گئے لفظوں پر از خود پشیمان تھی۔ ہارون کے بغیر اس کا بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ ہارون نے پچھلے چھ سات سالوں میں گھر کے فرد کی سی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ پاپا بھی مسلسل خاموش تھے۔ ہارون کو اس نے کئی فون کھڑکا ڈالے تھے مگر اس نے بات کرنا

گوارا نہ کیا تھا۔

کلیم اللہ کو بیٹی کی بے چینی اور ندامت کا اچھی طرح سے اندازہ ہو رہا تھا۔مگر خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔

''پاپا، آپ ہارون کو لے آئیے ناں۔'' اس نے بالآخر تھک ہار کر عاجزی سے درخواست پیش کی۔

''میں نے تو نہیں بھیجا اسے جو لے کر آؤں۔'' وہ انجان بنتے ہوئے بولے۔

وہ روہانسی ہوگئی۔''بھیجا تو کسی نے بھی نہیں تھا۔''

''تو پھر خود ہی آجائے گا۔'' وہ لاپروائی سے کہہ کر فائلیں دیکھنے لگے۔

''وہ بے بسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔سوتے سوتے بھی فون ملایا۔شومئی قسمت ہارون نے اٹھالیا۔

''ہارون کے بچے! سیدھی طرح گھر آجاؤ۔'' اس نے رعب سے گزارش کی۔

''ہارون کے بچے نہیں ہیں۔وہ غیر شادی شدہ ہے۔''

اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہہ کر فون رکھ دیا۔وہ تلملا گئی۔

''سمجھتا کیا ہے خود کو۔دیکھ لوں گی۔''

رات بمشکل کٹی صبح معمول سے پہلے ہی وہ بیدار ہوگئی۔

اکیلے کام نہیں چلے گا۔فراج کو ساتھ لینا ہوگا۔'' کیونکہ فراج کی اور ہارون کی گاڑھی چھنتی تھی۔یک جان دو قالب کا فقرہ ان کی دوستی پر صادق آتا تھا۔

یہی سوچ کر اس نے گاڑی کا رخ سیف اللہ منزل کی طرف کرلیا۔

گھر میں مکمل خاموشی تھی۔لگتا تھا سب گھر والے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

فراج۔سمیعہ۔بھئی کوئی جاگ بھی رہا ہے یا سب ہی سو رہے ہیں؟'' اس نے باری باری ادھر ادھر جھانکتے ہوئے آوازیں لگائیں۔

کچن میں کھٹر پٹر کی آوازوں پر وہ اس خیال کے تحت چل دی کہ سمیعہ یا جویریہ ہوں گی لیکن دروازے میں ہی ٹھٹک گئی۔اس کی آواز پر تائی جان قرآن پاک بند کر کے پیچھے صحن سے اٹھی تھیں۔

وہاج حسن کچن میں بڑی چابکدستی سے ناشتا بنا رہے تھے۔ان کی تیاری اور انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے آفس جانے کی سخت جلدی میں ہوں۔کوٹ اور ٹائی ڈائننگ ٹیبل پر پڑے تھے۔اور جوسر بلینڈر میں پھل ڈال کر دودھ ڈال رہے تھے۔

اس کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔پھر بھی جانے نئے سرے سے کیوں حیرت ہوئی، اور بے ساختہ منہ سے نکلا۔

''ارے آپ!''

انہوں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہ دروازے کے دونوں طرف ہاتھ رکھے اس طرح عجلت میں کھڑی تھی جیسے بھاگتے بھاگتے ذرا دیر کو بس یونہی رکی ہو، ان کے دل کی دھڑکنیں اچانک ہی رکیں اور پھر ایک دم منتشر ہو گئیں۔

''میں سمجھی۔ شاید سمیعہ وغیرہ ہوں۔ اس لیے میں ادھر چلی آئی۔'' اس نے تنقیدی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ انداز بے حد تضحیک آمیز تھا۔

اس کا خیال تھا شاید وہاج حسن اسے کام کرتا دیکھ کر کنفیوژن کا شکار ہو گئے ہیں۔

دوسرے ہی پل انہوں نے نگاہیں جھکا لیں، اور سوچ لگاتے ہوئے بڑی سادگی اور نرمی سے بولے۔

''سمیعہ اور فراج اپنے اپنے کمرے میں سو رہے ہیں۔''

اور ساتھ ہی بلینڈر کا بٹن آن کر دیا۔ یکلخت ہی بے ہنگم سا شور ابھرا وہ کاندھے اچکا کر وہاں سے ہٹ گئی۔

تائی جان راہداری میں مل گئیں۔

''السلام علیکم تائی جان؟''

''والسلام جیتی رہو۔''

''کیسے آنا ہوا صبح صبح؟'' وہ اسے اپنی ہمراہی میں ڈرائنگ روم میں لے آئیں۔

ان کی بات پر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہاں آ کر اندازہ ہوا ہے کہ میں واقعی صبح صبح آ گئی ہوں۔''

''ارے تمہارا ہی گھر ہے جم جم آؤ۔'' تائی جان نے اسے اپنے سے لگا لیا۔ پھر اسے پہلو میں بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''اس گھر میں تو صبح گیارہ بجے اور رات دو بجے ہوتی ہے۔''

تائی جان حسب عادت شروع ہو گئیں اور وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ اس کا تو خود یہی حال تھا آج جانے کیسے اتنی جلدی اٹھ گئی تھی۔

لگتا ہے تایا جان گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ گویا موضوع بدلا ہو۔

''ہاں وہ گئے ہوئے ہیں۔ صدیق کے بیٹے کے قل میں، رات کہا تھا فراج سے کہ تم چلے جانا۔ پڑا اینٹھ رہا ہے۔ جگاتی رہی اٹھا نہیں۔ جانے کو تو وہاج چلا جاتا مگر اسے خود کام تھا۔ کسی پارٹی نے آنا تھا۔ اس وجہ سے نہیں گیا۔ اللہ میرے بچے کو خوش رکھے، خوشیاں نصیب کرے تمام اولاد میں ایسا سعادت مند بچہ نہیں۔''

تائی جان کے چہرے پر یک بیک خوشیوں کے رنگ دمک اٹھے اور وہ وہاج کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئیں۔

''اب دیکھ لو۔ آفس جانے کی جلدی تھی۔ خود ہی ناشتا بنا لیا۔ کہتی رہی۔ ارے سمیعہ کو اٹھا لو۔ جویریہ کو اٹھا لو۔ سارا دن فراج کے آگے پیچھے بھی تو دوڑتی پھرتی ہیں۔ اور کیا دوڑتی پھرتی ہیں خود دوڑائے رکھتا ہے۔ یہ لا دو۔ وہ لا دو، مگر اس نے تو کسی کو تنگ کرنا سیکھا ہی نہیں۔ جیسا بھی وقت پڑا خود ہی کر لیا۔ حالانکہ بہنیں اس کا خود اتنا خیال رکھتی ہیں۔ بغیر کہے آگے سے آگے کر دیتی ہیں۔ اور جو میں کرنے کے لیے اٹھوں تو پکڑ پکڑ کر

بھاتا ہے۔ کہتا ہے ہمارے پیغمبر بھی تو اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کیا کرتے تھے، اپنے ہاتھوں سے کام کرنا سنت نبویؑ ہے اور پھر گھر میں بدنظمی اور بے سکونی بھی نہیں ہوتی اور پھر جب ملک سے باہر جاتے ہیں جب بھی تو خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھار بہنوں کو تنگ نہیں کریں گے۔ تو ہاتھ نہیں ٹوٹ جائیں گے، اتنی دلیلیں ہوتی ہیں اس کے پاس۔ اور یہی اگر فراج کو جانا ہوتا ناں۔ تو گھر بھر کو ایک پاؤں پر نچائے رکھتا اور جاتا ایسے جیسے احسان کرنے جا رہا ہو۔''

تائی اماں نے نخوت سے کہا تو ان کے انداز پر وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

''کہتے ہیں صبح صبح غیبت کرنا گناہ ہوتا ہے۔' فراج آنکھیں ملتا ہوا ادھر ہی آگیا۔

''اور جیسے ماں باپ کا دل دکھانا تو عین ثواب کا کام ہے۔''

تائی جان نے جل کڑھ کر کہا۔ اور کوئی کام یاد آجانے کی وجہ سے جوتیاں گھسیٹتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔

''ارے۔ یہ تم صبح صبح یہاں کیسے؟'' سمیعہ نے اچنبھے سے پوچھا۔

اس نے اکتا کر اس سوال پر گہرا طویل سانس کھینچا پھر تھکاوٹ سے بولی۔

''فراج صاحب کو لینے آئی ہوں۔ کیونکہ ہارون گھر چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں اس معاملے میں فراج میری کتنی مدد کرتا ہے۔''

سمیعہ کو ہنسی آگئی۔

''اس کی تو خود لڑائی ہوئی پڑی ہے ہارون سے۔ تین چار روز سے دونوں نے ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھنے کا روزہ رکھا ہوا ہے۔''

سمیعہ کی اطلاع پر اسے شدید جھٹکا لگا۔

''کیا۔ تمہیں بھی اسی وقت جھگڑا کر کے بیٹھنا تھا؟'' اس نے فراج کو گھورا۔

''چلو خیر اٹھو۔ یہ روزہ اکٹھے ہی افطار کرنے چلتے ہیں۔'' اسے فراج کے علاوہ کوئی معقول بندہ نہیں مل رہا تھا۔ اور نہ ہی مل سکتا تھا۔

''میں نہیں جا رہا۔'' فراج کی ناراضگی شدید معلوم ہوتی تھی۔ انداز بے حد حتمی تھا۔

''اسے گولی مارو۔ وہاج بھائی کے ساتھ چلی جاؤ۔''

سمیعہ نے مشورہ دیا۔ بلکہ اسے فراج کی منت سے بچایا۔

اسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

''یہ تم کیوں ہنس رہی ہو؟'' سمیعہ نے حیرت سے اس کا منہ دیکھا۔

''کچھ نہیں۔ بس یونہی ہنسی آگئی تھی۔''

''اتنا کمزور وکیل۔ میں مقدمہ جیتنا چاہتی ہوں۔ ہارنا نہیں۔ ان سے تو بہتر میں اکیلی ہی کافی ہوں۔ وہ بدستور کھلکھلاتی ہوئی مڑی۔

عقب میں ہی وہاج حسن کھڑے تھے، وہ مسکراتی ہوئی ان کے آگے سے گزر کر چلی گئی۔ وہاج حسن بظاہر گھڑی کی سوئیاں سیٹ کر رہے تھے مگر ذہن بری طرح اس کے انداز پر الجھا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہارون کے گھر گئی تو چھوٹی تائی نے بتایا کہ وہ خود ان کی طرف چلا گیا ہے۔ اسے خوشی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ وہ الٹے قدموں وہاں سے لوٹی، گھر آئی تو ہارون کو اور پاپا کو لان میں ناشتا کرتے پایا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی۔ ایسی الٹی سیدھی حرتیں کرتے ہوئے۔ وہ اس کے سر پر دھاڑی۔

پہلے آتی تھی ہر بات پر شرم

اب کسی بات پر بھی نہیں آتی

اس نے سکون سے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے موقع کی مناسبت سے شعر گھڑا۔

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ''گئے کیوں تھے، اور آئے کیوں؟'' بے حد ناراضگی سے پوچھا۔

''گیا تھا تمہیں احساس دلانے کے لیے پھر خود ہی اس لیے آگیا کہ کہیں تم مجھے لینے نہ آجاؤ۔ باقی زندگی لوگوں کو یوں بتاؤ کہ اب کی بار تم مجھے گود دلائی ہو۔''

پاپا ہارون کی اس بات پر بے ساختہ ہنسے تھے۔ جبکہ وہ بس گھور کر رہ گئی۔

جواباً ہارون نے منہ چڑا دیا۔

☆ ☆ ☆

وہ پاپا کے آفس میں بیٹھی تھی کہ ذکریا اچکزئی اندر چلا آیا۔

''ہیلو!'' ذکریا نے بڑی محبت سے کہا۔

''ہائے۔'' تکلف کے بجائے تکلیف سے جواب دیا گیا۔ ذکریا بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ یا شاید رویوں سے اظہار کے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ مسکرا کر خود ہی بیٹھ گیا۔

وہ خوامخواہ فائلوں میں سر گھسانے لگی، مبادا موصوف کی شان میں گستاخی نہ کر جائے۔ کیونکہ وہ پاپا کے خاص دوست اور سب سے بڑی شراکت دار کا بیٹا تھا۔ اکثر ہی تانک جھانک میں رہتا۔ اور جونہی اسے اکیلے دیکھتا آن ٹپکتا۔ آج بھی حسب عادت بلکہ حسب معمول شروع ہو گیا۔ اسے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو؟''

''اس نے بس اتنا ہی کہا اور وہ شروع ہو گئی۔

''یہ......آسمانی رنگ تم پر غضب کا لگ رہا ہے۔کسی موسم کا حصہ معلوم ہو رہی ہو۔''

''ماہم!میں تمہارے گریز کو شرم سے عبارت کروں یا فرار سے۔''

''تو سینے فرار سے۔''اس نے دوٹوک انداز میں جل کر کہا۔تو وہ شرمندہ نہیں ہوا۔قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''اتنی زور سے نہ ہنسا کرو۔پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔''اس کے دبلے پن پر چوٹ کی۔

ذکریا کو برا لگا۔مگر اتنا بھی نہیں کہ اٹھ کر چلا جاتا۔

''چلو باہر چلتے ہیں۔''وہ بشاشت سے بولا۔

''اور موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔اور آئس کریم بھی کھائیں گے اور یونہی لانگ ڈرائیو پر نکل جائیں گے ہیں ناں۔''اس نے جلدی جلدی بات مکمل کر دی۔

''بہت سمجھدار ہو۔قبل از وقت بات جان لیتی ہو۔''وہ اس کی سمجھداری کو داد دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تم جیسی شریک سفر زندگی کی شاہراہ پر بڑی صحیح رہتی ہیں۔......اور''

''او۔یہ کہ مجھے تم جیسی لڑکی کی ہی تلاش تھی۔''اس نے بات مکمل کر دی۔

وہ زور سے ہنسا۔''بہت زیادہ ذہین ہو۔گویا میرے۔''

''میرے دل کی بات تم نے کہہ دی۔''اس نے جھٹ کہا۔

اب وہ اس فیلڈ میں اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ ہر ڈائیلاگ کو مکمل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکا تھا۔

''زبردست!''وہ فقرہ مکمل ہو جانے پر ایک بار پھر خوش ہوا۔

وہ بری طرح سے چڑ گئی۔

''اس موقع پر ایک آدھ شعر کی سخت گنجائش نکلتی ہے،اور مجھے اشعار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''اس نے عاجز آ کر قبل از وقت ہی کہہ دیا۔

وہ خفا نہیں ہو رہا تھا،ہر بات پر مسکرائے جا رہا تھا اور وہ ایسے مردوں کی فطرت سے خوف واقف تھی۔جو اس مقولے پر زندگی گزارتے تھے۔

''کہ ایک بار حاصل ہو جائے پھر جواب دیں گے۔''گویا اس زندگی کا صبر،اگلی زندگی پر جبر ہوتا تھا۔وہ اس کی مسکراہٹ پر چڑ کر کمرے سے نکلنے والی تھی کہ بروقت پاپا کمرے میں داخل ہوئے۔

پاپا کو دیکھ کر ذکریا نے بڑے مودب انداز میں سلام کیا اور پھر گاڑی کی چابی اٹھا کر جانے لگا۔

''ارے بھئی ابھی سے چل دیے۔چائے تو پیتے جاؤ۔''

اردگرد کا جائزہ لے کر انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ محترم کی ذرا سی بھی خاطر تواضع نہیں کی گئی ہے۔

''نہیں انکل! میرا قطعی موڈ نہیں۔ ماہم نے بھی پوچھا تھا۔ میں نے انہیں بھی انکار کر دیا۔'' کتنی صفائی سے اس نے منہ پر جھوٹ بولا تھا۔ وہ انگشت بدنداں رہ گئی۔

اس کی پھیلی آنکھیں دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ ''اچھا ماہم! پھر ملیں گے۔ اوکے انکل حافظ'' وہ تیزی سے نکل گیا۔

وہ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ پاپا بھی بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی ''ذکریا نامہ'' شروع کر دیا۔

''ذکریا بہت اچھا لڑکا ہے۔''

''مائی گاڈ!'' اس نے سر تھام لیا۔

''میں یہی چاہتا ہوں کہ تم دونوں کے مابین کچھ انڈر اسٹینڈنگ ہو جائے۔ اس لیے ملتے جلتے رہا کرو۔ کہیں گھومنے پھرنے چلے جایا کرو۔''

''پلیز پاپا!'' اس نے اکتا کر کہا۔

''ان لوگوں نے صرف پروپوزل پیش کیا اور آپ نے باقاعدہ مجھے ان سے اٹیچڈ کر دیا۔ میری مرضی کے بغیر جیسے آپ نے حتمی فیصلہ کر لیا ہو۔ مجھ سے پوچھے بنا۔ مجھے بتائے بغیر۔ یہ سراسر زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔'' وہ افسردہ ہو گئی۔

کلیم اللہ جاہ نے بیٹی کو بغور دیکھا پھر مسکرا دیے۔ ''یہاں تم تھوڑی سی مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہو۔ تم سے میں نے پوچھا تھا، ہر بار۔ مگر تم ٹھوس جواب نہیں دے سکیں۔ حتیٰ کہ اپنی رائے بھی پیش نہ کر سکیں۔ اب تم خود ہی بتاؤ۔ تمہارے ان بے سروپا انکار...... پر اگر میں بیٹھا رہا...... تو زندگی کا فیصلہ کس طرح اور کب ہو گا۔''

''جس طرح اور جہاں ہو گا مگر ذکریا کے ساتھ ہرگز ہرگز نہیں ہو گا۔'' وہ تلخی سے بڑبڑائی۔

''مگر ذکریا میں برائی ہی کیا ہے؟''

بڑا معقول سوال کیا تھا انہوں نے۔ انداز زچ کر دینے والا تھا۔ وہ بدستور خاموش تھی۔ انداز میں بے پناہ خفگی تھی۔

''ہر لحاظ سے ذکریا پرفیکٹ ہے اور میرے خیال سے مجھے اپنے معیار کا داماد ذکریا سے بڑھ کر نہیں مل سکتا۔'' ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بے حد مطمئن ہیں۔

''اور پھر نا صرف انہوں نے پروپوزل دیا ہے بلکہ میں انہیں زبان بھی دے چکا ہوں۔'' اتنا حتمی اور اٹل انداز جیسے پتھر پر لکیر ہو۔

اس کے سر پر تو جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ جس کی تلاش زندگی کا مقصد بن گئی تھی۔ خواہش سے ضد بن گئی تھی۔ اب معمولی سی چیز پر اکتفا کر لیتی۔ قناعت کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ پھر کیوں ہار مان لیتی۔ اور پھر پاپا نے فیصلہ کیسے کر دیا۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہو گا۔

وہ سنجیدگی سے سمجھا کر گئے تھے۔

''سکون سے سوچو کیونکہ والدین ہمیشہ اولاد کے حق میں بہتر ہی فیصلے کرتے ہیں۔ اور اس فیصلے پر ذہن اور دل کو تیار کرو۔''

''مائی فٹ!'' وہ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہارون! گاڑی کی چابی دو۔''

''کیوں؟'' اس کی لاپروائی قابل دید تھی۔

''میں کیوں کا جواب دینے کی مجاز نہیں ہوں سمجھے۔''

وہ بے انتہا تپ کر بولی۔

ہر کوئی خوامخواہ اس پر پہرے بٹھانے کے چکر میں تھا۔ اور یہ ہارون تو کچھ زیادہ ہی پابندیاں لگانے لگا تھا۔ ہر وقت کیوں گھومتی پھرتی رہتی ہو۔ گھر میں ٹک کر بیٹھو۔ وہ اکثر ہی ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا تھا۔

''دیکھو ہارون! میں کہہ رہی ہوں۔ یہ آنکھیں گھر والوں کو دیکھایا کرو، مجھے بھی آنکھیں دکھانی آتی ہیں۔ گاڑی کی چابی دو۔ نہ میں تمہارے رعب میں آؤں گی۔ اور نہ کسی سے ڈرتی ہوں۔'' وہ جل کلس کر بولی۔

''تم ڈر بھی کیسے سکتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوق ڈرانے اور کچھ ڈرنے کے لیے پیدا کی ہے۔ تمہارا شمار اول الذکر میں ہوتا ہے۔''

وہ بڑے سکون سے مسکرا کر بولا۔ اس کی جان تک جل گئی۔ ''یہ جگت بازیاں اپنی بیگم کو سنانا مجھے کوئی شوق نہیں سننے کا۔''

''ہاہاہا'' ہارون نے قہقہہ لگایا۔

''آنکھیں گھر والوں کو دیکھاؤں۔ جگتیں گھر والوں کو سناؤں تو تمہارے لیے کیا کروں؟'' وہ دلیری سے بولا۔

''تم میرے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتے۔''

اس نے چابی چھینی اور آناً فاناً کمرے سے نکل گئی۔ اکثر وہ بہت ڈپریسڈ ہوا کرتی تو یونہی بے سمت راہوں پر نکل جاتی۔ ماحول سے فرار کا اس کے پاس یہی معمول اور عارضی راستہ ہوا کرتا۔ اب بھی اس نے ایسا ہی فرار حاصل کیا تھا۔ ذہن بے انتہا سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ وہ گاڑی مارنے کے ارادے سے نہیں نکلی تھی۔ ہاں اس نے ایک لمحہ کو سوچا تھا کہ ''وہ خود کو ختم کر لے گی؟'' لیکن وہ ایک سوچ تھی۔ جو ہوا کی طرح شعور سے ٹکرا کر گزر گئی تھی۔ لیکن تقدیر نے تو اس وقت اس کی قسمت میں حادثہ لکھا تھا۔

گاڑی اچانک بجلی کے کھمبے سے ٹکرائی تھی۔ آگے پیچھے بہت سی گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے اور اس کا سر اسٹیئرنگ پر ڈھلک گیا۔

آگے کیا ہوا سے کچھ علم نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

دو روز کے بعد ہاسپٹل کے کمرے میں جب اس نے آنکھ کھولی تو سب سے پہلی نظر پاپا پر پڑی۔ وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھے۔

''ماہم بیٹا۔ ماہم بیٹا!'' ان کی آنکھوں میں اشک رواں تھے۔ اور بے چینی سے اسے پکار رہے تھے۔

پاپا کی حالت دیکھ کر وہ تڑپ ہی تو گئی۔ اس کے سوا پاپا کا اور تھا ہی کون۔ وہ ان سے اپنے رویے کی معافی مانگنا چاہتی تھی۔ اسے ایسا نہیں

کرنا چاہیے تھا۔

پاپا سمجھ رہے تھے کہ اس نے جان بوجھ کر گاڑی ٹکرائی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ یہ محض حادثہ ہے اور کچھ نہیں۔ وہ باوجود تکلیف کے بولنا چاہ رہی تھی۔ لیکن ان کے پیچھے کھڑے ذکریا اور ان کے والد کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ لب سل گئے۔ وجود کے ہر زخم میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اور وہ بے حس و حرکت پڑی کی پڑی رہ گئی۔ اس کے حرکت نہ کرنے پر سب لوگ بے چین ہو گئے۔ تایا، چچا، کزنز، سبھی تو اس کے پاس موجود تھے لیکن اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کسی سے بولنے کو۔ کسی سے بات کرنے کو۔

حتیٰ کہ ابھی دو لمحے قبل جو شدت سے پاپا سے ہمدردی ہوئی تھی۔ وہ بھی اچانک ختم ہو گئی تھی۔ اسے ہوش آیا ہی کیوں۔ اب اس کے دل میں نہ اپنے لیے کوئی احساس تھی نہ کسی اور کے لیے، وہ خالی آنکھوں سے چھت کو تکے جا رہی تھی۔ ہارون ڈاکٹر کو بلا لایا تھا۔

''مانو بیٹا! مانو بیٹا!'' پاپا اس کا گال تھپتھپا رہے تھے۔ ''ڈاکٹر، ڈاکٹر میری بیٹی بول کیوں نہیں رہی۔ یہ ہماری طرف دیکھ کیوں نہیں رہی۔ ہمیں پہچان کیوں نہیں رہی؟''

وہ انجانے خدشوں سے دو چار بے قراری سے پوچھ رہے تھے۔

اور پاپا کے لفظ اس کے لیے راہ نجات بن گئے۔ بے شک اس نے باقاعدہ پلاننگ نہیں کی تھی کہ وہ یہ کھیل کھیلے گی۔ لیکن کھلی آنکھوں چھپ جانے کا اس سے قیمتی موقع اسے شاید ہی کبھی ملتا۔

ڈاکٹرز کو جہاں اس کے ہوش میں آ جانے پر اطمینان کا احساس ہوا تھا۔

وہاں اس خدشے نے یکلخت جگہ لے لی تھی۔ کہ کہیں اس نے یادداشت ہی نہ کھو دی ہو۔ کیونکہ سر کی چوٹیں زیادہ آئی تھیں۔

ڈاکٹر اعتبار زیدی اس کے قریب آئے۔ وقفے وقفے سے اسے پکارا۔ وہ بدستور بے سمت دیکھتی رہی۔ پھر انہوں نے اس کی آنکھیں چیک کیں۔ ہاتھ ہلا کر دیکھے۔ سر کو دائیں بائیں کیا۔ وہ جوں کی توں پڑی رہی، نرس کے ہاتھ انہوں نے باہر پیغام پہنچوایا۔ شاید کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلانے بھیجا تھا۔ ساتھ ہی کمرے میں متعدد افراد سے گزارش کی وہ لوگ باہر چلے جائیں۔

ڈاکٹر اعتبار زیدی کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں، کلیم اللہ جاہ کے ساتھ ساتھ باقی افراد کو بھی آزمائش میں ڈال رہی تھی۔

کمرے سے تمام افراد چلے گئے۔ ماسوائے کلیم اللہ اور سیف اللہ کے۔

ہارون ڈاکٹر ساجد کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوا۔ پھر ڈاکٹر ساجد اور ڈاکٹر زیدی کچھ ناقابلِ فہم قسم کی سرگوشی کرنے لگی۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ بتاتے کیوں نہیں کہ میری بیٹی کو کیا ہوا ہے؟'' پاپا کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

''ہمارا خیال ہے کہ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ان کا ذہنی توازن بری طرح متاثر ہوا ہے۔''

ڈاکٹر ساجد نے ٹھہر ٹھہر کر رسان سے کہا۔ تو تینوں افراد ہق دق ڈاکٹرز کا منہ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ پاپا کا ضبط جواب دے گیا۔ سیف اللہ جاں نے انہیں سنبھالا۔

''کلیم صاحب! خود کو سنبھالیے'' ڈاکٹر اعتبار نے ان کے کاندھے پر دلاسے بھرا ہاتھ رکھا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہر مرض کا علاج اس دنیا میں موجود ہے ایسا عموماً ہو جاتا ہے اور ابھی یہ ہمارا خیال ہی ہے۔ شاید ایسا نہ ہو۔ ہمارے ہاسپٹل کے بڑے اچھے ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر عرفان ہاشمی بہت اچھے سائیکاٹسٹ ہیں۔ ہم ان سے ان کا باقاعدہ چیک اپ کرائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان کے زیر علاج یہ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گی، آپ لوگ گھبرائیے نہیں فی الوقت جوان کی ظاہری چوٹیں ہیں۔ وہ صحیح ہو جائیں پھر ہم اس کی طرف بھی توجہ دیتے ہیں۔ آپ انہیں تنہائی اور ریسٹ دیجیے۔ ان کے ذہن پر زیادہ دباؤ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔، ورنہ ان کی بیرونی چوٹوں کی انجری میں ہمیں وقت کا سامنا ہو سکتا ہے۔''

ڈاکٹر ز دلاسہ اور دکھ ایک ساتھ دے کر کمرے سے نکلے تھے۔ پاپا بے دم سے ہو کر کرسی پر گر گئے۔ اس کی چوٹیں شدید تھیں۔ اسی لیے دواؤں کے زیر اثر اور تکلیف کے باعث آٹھ دس دن نیم بے ہوشی میں گزر گئے۔ کچھ روز کے بعد اسے چھٹی مل گئی اور وہ گھر آ گئی۔

ابھی وہ نقاہت اور کمزوری کے زیر اثر تھی اس لیے ہر وقت چپ چاپ پڑی رہتی۔

اس کے انداز میں...... پچھلی زندگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہر وقت بالکل اجنبی اجنبی معلوم ہوتی۔ کلیم اللہ بیٹی کو دیکھ دیکھ کر ہولتے رہتے۔ وہ چاہتے کہ ان کی بیٹی لمحے کی چوتھائی میں بالکل پہلے کی طرح سے ہو جائے۔ لیکن زخم بھر گئے مگر وہ ویسی نہ ہو سکی۔

پھر ڈاکٹر عرفان ہاشمی کا علاج شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر عرفان ہاشمی کے علاج پر اس کا سکتہ ٹوٹا وہ ایک دم ایسے چوکنا ہو گئی جیسی سانپ، سپیرے کی بین پر ہو جاتا ہے۔

وہ کسی بھی طرح سے قابو میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے چیک اپ لکھے۔ اس کے ٹیسٹ ہوئے دو روز بعد رپورٹس آ گئیں۔ وہ کمرے میں تھی، جس وقت ہارون ٹیسٹ رپورٹس لے کر آیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ اس نے چور نگاہوں سے رپورٹس کی جانب دیکھا جیسے شام تک اس کا پول کھل جائے گا۔ ہارون رپورٹس رکھ کر چلا گیا۔

ہارون کے جانے کے بعد اس نے سوچا کہ رپورٹس پھاڑ ڈالے یا پھر جلا دے۔ نہیں۔ اس کے ذہن میں بڑی مناسب ترکیب آئی۔ اور اس نے رپورٹس کے لقمے بنا کر چبا ڈالے۔ اور بڑی ترتیب سے ان چوسے ہوئے لقموں کو پلیٹ میں سجا دیا۔

یہ باقاعدہ پاگل پن کی پہلی مہر تھی جو اس نے خود اپنے اوپر لگائی تھی۔

دو گھنٹے بعد ہی ہارون ڈاکٹر کو لے آیا۔ ان کے آنے سے قبل پاپا رپورٹس ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئے تھے۔

انہوں نے ہارون سے رپورٹس کے بارے میں پوچھا کہ کہاں رکھ کر گیا تھا۔ پاپا سخت مضطرب تھے۔ ہارون کو بھی فکر لاحق ہو گئی، وہ بھی تلاش کرنے لگا۔ پاپا نے بری طرح ہارون کو جھڑک دیا۔

ہارون خود جھنجلا رہا تھا کہ رپورٹس گئیں تو کہاں کمرے میں عجیب بدمزگی پھیل گئی۔

بالآخر ڈاکٹر ہاشمی نے خود پیشرفت کی اور سب سے پہلے ماہم سے پوچھا۔ جو عالم بے نیازی میں بیٹھی کچھ گنگنا رہی تھی کچھ جواب نہیں دیا۔

ڈاکٹر کی نگاہ پلیٹ میں پڑے کاغذ کے لقموں پر پڑی۔

''یہ رہیں رپورٹس!'' انہوں نے پاپا اور ہارون کو دکھائیں۔

ہارون نے بے بسی سے رپورٹس کا حشر دیکھا جبکہ پاپا کا دل بری طرح سے تڑپ کر رہ گیا کہ ان کی بیٹی کس حد تک پہنچ گئی۔

''بیٹا! یہ کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے بڑے رسان سے ماہم سے پوچھا۔

اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس بات کا کیا جواب دینا ہوگا۔ یکلخت ہی وہ پریشان ہوگئی۔ چہرہ جھکا ہوا تھا۔ اس لیے کوئی بھی تاثر وہ نہ دیکھ سکے۔

''بیٹا! یہ کیا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

اس نے چہرہ اٹھایا۔ ہراساں ہو کر ڈاکٹر کو دیکھنے لگی۔ سہ بارہ پوچھا۔ ''بیٹا! یہ کیا ہے؟''

''بیٹا! یہ کیا ہے؟'' اس نے وہی لفظ دہرا دیے۔ بجائے جواب دینے کے۔

ڈاکٹر نے پرسوچ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ پھر بولے۔

''یہ روٹی کے لقمے ہیں۔''

''یہ روٹی کے لقمے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

پھر ڈاکٹر جو جو بات کہتے رہے۔ وہ وہی دہراتی رہی۔ ڈاکٹر ہاشمی اٹھ کھڑے ہوئے۔

پورے خاندان میں اور خاندان سے باہر مشہور ہو گیا تھا کہ ماہم پاگل ہو گئی ہے۔ اسے پرواہ ہی نہیں تھی۔ اس بات کی کہ لوگ اسے پاگل کہہ رہے ہیں۔ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ ایک اچھا خاصا تماشہ بن گئی ہے۔ کئی کئی گھنٹے وہ اپنے کمرے میں بند رہتی۔ خاص طور پر جب ڈاکٹر ہاشمی آتے تو وہ کمرے سے ہی نہ نکلتی۔

اور جب لوگوں سے ملنے سے اسے منع کیا جاتا تو وہ بڑھ چڑھ کر لوگوں میں موجود ہوتی اور یہ ہارون کا ہی لائحہ عمل تھا کہ جو بھی ماہم کو دیکھنے آتا۔ وہ لوگ بغیر ماہم سے ملوائے ہی اسے رخصت کر دیتے۔ یہ کہہ کر کہ اس نے دوائی لی ہے یا آرام کر رہی ہے وہ تماشا نہ بنے۔

لیکن آج اچانک ذکریا ماہم سے ملنے آ گیا۔

وہ سب لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ابھی انہی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کلیم اللہ نہیں چاہتے تھے کہ ذکریا ماہم کو اس حالت میں دیکھے۔ لیکن ایسا ہونا تھا۔

ذکریا نے سلام کیا۔ اس کے علاوہ سب نے جواب دیا۔ وہ آسمان کی طرف بلاوجہ ہی دیکھے چلی جا رہی تھی۔

ہارون نے شانہ ہلا کر اسے متوجہ کیا۔

ذکریا نے ایک بار پھر سلام کیا۔ وہ بجائے جواب دینے کے زور زور سے ہنسنے لگی۔

ہارون اور پاپا بہت بری کیفیت سے دوچار تھے۔ ذکریا نے ٹپٹا کر پہلو بدلا تھا۔

''ماہم! یہ ذکریا ہیں۔'' ہارون نے بدقت تمام تعارف کرایا۔ کلیم اللہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''ذکریا۔ ذکریا ایکسپریس!'' اس نے تعجب سے سوال کیا۔ ''مگر یہ اسٹیشن سے ہمارے گھر کیوں آ گئی، ہم نے کہیں نہیں جانا؟''

اس نے معصومیت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔ ذکریا اس کے ذہنی توازن کا اتنا بگاڑ دیکھ کر چکرا کر رہ گیا۔

اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں پر ذکریا کے تاثرات ناقابل اعتبار حد تک تغیر و تبدل کا شکار ہو رہے تھے۔ کلیم اللہ سر جھکائے مجرموں کی طرح بیٹھے تھے۔ یہ ہارون ہی کی ذہانت اور ضبط تھا کہ وہ ماحول اور لوگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ لیکن کب تک۔

''انکل! یہ تو بالکل پاگل ہو چکی ہے۔ آئی کانٹ بلیواٹ۔ میں تو ہرگز یقین نہ کرتا اگر ڈیڈی سے بھی سنتا تو تو۔ تھینکس گاڈ کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔''

وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا انکل جی! میں چلتا ہوں۔ ڈیڈی آپ سے خود بات کریں گے۔''

کلیم اللہ جاں وصدمے سے دوچار تھے جبکہ ہارون سے ذکریا کا تمسخرانہ انداز ہرگز برداشت نہ ہو رہا تھا۔ ذکریا کے جانے کے بعد اس نے درزدیدہ نگاہوں سے ماہم کی جانب دیکھا۔ جو پھر بے خیال نگاہوں سے آسمان کی طرف بلاوجہ ہی دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''ڈاکٹر صاحب! ماہم اگر چیک اپ کرانے پر آمادہ نہ ہوئی تو علاج کس طرح ممکن ہوگا؟ ہماری تو پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔''

''میں نے ان کی رپورٹس کے ڈپلی کیٹ نکلوائے ہیں صد شکر کہ یہ فزیکلی بالکل ٹھیک ہیں۔ صرف حادثے کے وقت خوف کی کیفیت نے ان کی یادداشت کو متاثر کیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر اعتبار زیدی سے ان کا کیس ڈسکس کیا ہے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ کچھ ادویات میں نے لکھ دی ہیں۔ آپ یہ دوائیں استعمال کرائیے، ہر ہفتے ان کا چیک اپ کرائیں اور ان ہدایات پر عمل کریں۔''

☆ ☆ ☆

جس مقصد کے لیے اس نے ایسا کیا تھا اس سے تو اسے نجات مل گئی تھی اب کیسے ظاہر کرے کہ وہ بالکل نارمل ہے۔

ایک دم سے خود کو نارمل ظاہر کر دینا، بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس نے تو سوچا ہی نہ تھا کہ اس ڈرامے کا کلائمکس کس وقت اور کس مقام پر کرنا ہے۔

وہ تو خود اپنے ہی ڈرامے میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ اب ہر وقت اسی الجھن میں رہتی کہ خود کو کس طرح اس جال سے نکالے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بات کس طرح سمٹے گی، پاپا کو علم ہوگا تو انہیں بہت تکلیف ہوگی۔

ہارون جو اتنی ہمدردی اور محبت سے پیش آ رہا ہے، اس کا تو گلا ہی دبا ڈالے گا۔ حقیقت جان جانے پر، پھر سب کی نظروں میں وہ کس قدر

گر جائے گی۔ آخر ایسی کیا صورت حال نکالی جائے کہ اس کی عزت بھی بنی رہے اور اس مصیبت سے بھی جان چھوٹے۔

اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ اپنے گرد بنائے گئے جال میں از خود گرفتار ہوتی جا رہی تھی۔

سب کو پاگل بنانے میں آسانی سے کامیاب تو ہو گئی تھی مگر خود کو نارمل بنانے میں بڑی دشواریاں نظر آ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

شام کے ملگجے سائے پھیل رہے تھے۔ ہوا بہت ٹھنڈی اور پیاری چل رہی تھی۔ وہ لان کی سیڑھیوں میں گھٹنوں پر کہنیاں جمائے دونوں ہاتھوں کے پیالوں میں چہرہ رکھے انہی سوچوں میں الجھ رہی تھی کہ آگے کیا کرنا ہے۔

وہاج حسن گھر میں داخل ہوئے۔ سب ہی روزانہ تقریباً اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ لیکن وہاج حسن آج پہلی بار آئے تھے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی کاروباری مصروفیات بہت زیادہ تھیں جس سے ہر ایک فرد باخبر تھا۔ ان کی غیر موجودگی پر ہر فرد اپنے تئیں یہی سوچ لیتا کہ وہ یقیناً شہر یا ملک سے باہر گئے ہوئے ہوں گے۔

سیف اللہ جاہ لکڑی کا کاروبار بہت بڑے پیمانے پر کرتے تھے۔ کشمیر سے لے کر سیالکوٹ تک ان کا کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ لیکن جب سے وہاج حسن اس کاروبار میں والد کے ساتھ شریک ہوئے تھے مزید وسعت اور ترقی کرتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اب سیالکوٹ اور چنیوٹ کے کارخانوں سے کھیلوں کا سامان نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ ایشیا کے تمام ممالک میں ایکسپورٹ ہوتا تھا۔ پھر فرنیچر اور تعمیری اشیاء کے علاوہ خاص طور پر منقش دروازے اور کھڑکیاں مسلم ممالک تک میں آرڈر پر جاتے تھے، جس کی وجہ سے وہاج ٹورز پر رہتے۔

اس بار جب وہ سری لنکا سے بہت بڑا پراجیکٹ لے کر آئے تو سمیعہ کے منہ سے یہ خبر سن کر گنگ رہ گئے کہ ماہم پاگل ہو گئی ہے۔

مگر کیسے۔ کب اور کس طرح۔ انہیں بالکل بھی یقین نہیں آیا تھا لیکن جب ساری تفصیل سنی تو ایک رات کاٹنا ان کے لیے آزمائش بن گیا کہ کس طرح پل بھر میں اس کے پاس پہنچ جائیں۔ اس سے ملیں، اسے جا کر دیکھیں، ایسا کیوں ہو گیا تھا۔

ماہم پہلی اور آخری لڑکی تھی، جس سے انہوں نے محبت کی تھی اور پھر اسے اپنانے کی چاہت ہوئی تھی۔

لیکن اس بات کا کبھی بھی انہوں نے اظہار نہیں کیا تھا۔ ایک خاص وقت کے انتظار میں تھے کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو تو بابا جان کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر کے اسے زندگی بھر کے لیے مانگ لیں گے پھر انکار کی کوئی صورت بھی انہیں نظر ہی نہ آتی تھی۔ اسی لیے ہر وقت مطمئن بھی رہتے کہ جب مانگیں گے، وہ انہیں مل جائے گی۔ لیکن یہ اطمینان ایک پل میں ہی ہوا ہو گیا جب انہوں نے سنا کہ اس کا رشتہ شہر کے بہت بڑے رئیس زادے سے طے ہو گیا ہے۔ ان کے دل کا کاسہ خالی رہ گیا۔

زندگی میں بے اطمینانی نے جگہ لے لی تھی۔ مگر دل کی دھڑکنوں میں اب بھی وہی بستی تھی۔ حالانکہ وہ لاحاصل تھی۔ لیکن انہیں اچھی لگتی تھی۔ جب بھی وہ ان کا مذاق اڑایا کرتی، بدھو، احمق کے نام سے پکارتی۔ انہیں برا ہی نہ لگتا۔ خاموشی سے سن لیتے۔

اعظم چچا کی شادی میں جب شور ہنگاموں میں ان کے سر میں درد ہو گیا تھا اور امی سے سر دبوا رہے تھے۔ تب وہ گلا پھاڑتی ہوئی کمرے

میں آئی تھی۔ جانے کسے ڈھونڈ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر ہنسنے لگی۔ تائی جان نے اسے خاموش ہونے کے لیے کہا تھا کہ ان کے سر میں آوازیں اور شور سے درد ہو رہا تھا تو وہ مزید ہنسنے لگی تھی۔

تائی جان! آپ کے ان صاحبزادے کو تو کوئی چھوٹی موٹی سی صاحبزادی ہونا چاہیے تھا۔''

بظاہر وہ سو رہے تھے مگر سن رہے تھے۔

انہیں جب بھی برا نہیں لگا۔ وہ اکثر ایسے ہی جملے کہہ دیتی۔ تائی چچی جب تک اسے جھڑک نہ دیتیں، وہ خاموش نہ ہوتی۔

اور ایک بار تو اس نے منہ پر کہا تھا۔ جب اعظم چچا کو گھوڑی پر بٹھا رہے تھے، باہر سے انہیں کسی نے سرخ دوپٹہ لینے کے لیے اندر بھیجا تھا۔ جانے کونسی رسم ادا کرنا تھی۔ وہ سمعیہ سے دوپٹہ لینے اس کے کمرے میں آئے تھے، بہت ساری لڑکیوں کو کمرے میں اکٹھا دیکھ کر گھبرا گئے۔ وہ عموماً لڑکیوں سے کتراتے تھے۔ نگاہیں نیچی آواز بھی دھیمی، پھر بھاگ بھاگ کر سب کے کام کرنا۔ وہ خوب ان پر ہنستی۔

جب وہ الٹے قدموں باہر نکلے تو سمیعہ نے پوچھا تھا۔

''بھائی! کچھ چاہیے تھا آپ کو!''

ان کی نظریں سامنے کھڑی ماہم پر پڑیں تو مزید حواس باختہ ہو گئے۔ کم اعتمادی کم عمری کا حصہ ہوا کرتی ہے، تھوک نگل کر بمشکل کہا تھا۔

''ہاں دوپٹہ چاہیے تھا۔''

ان کی ادھوری بات ہی ماہم کے ہاتھ مشغلہ بن گئی۔ قہقہہ لگا کر ماہم ہنسی تھی۔

''بہت دیر سے ضرورت محسوس ہوئی آپ کو؟'' حالانکہ آپ کو دوپٹہ بہت پہلے لے لینا چاہیے تھا۔''

اس بات پر انہوں نے بے انتہا خفت محسوس کی تھی۔ کانوں کی لوئیں تک سرخ ہو گئی تھیں۔ لڑکیاں ماہم کی بات پر دل کھول کر ہنسی تھیں۔

سمیعہ نے جلدی سے انہیں مطلوبہ دوپٹا تھما دیا تھا۔ وہ شرمندگی سے الٹے قدموں پلٹے تھے۔ برا پھر بھی نہیں لگا تھا۔ اس کی ہر بات ہی اچھی لگتی تھی۔ ہر جملہ ایک تعلق سا وابستہ کر دیتا تھا۔

پھر یہ شوخیاں ختم ہوئیں۔ وہ انہیں نظر انداز کر دیتی۔ توجہ ہی نہ دیتی۔ نظر اٹھا کر ہی نہ دیکھتی۔ جب بھی ان کی سانسوں میں بستی گنگناتی تھی اور آج بھی مکمل سپردگی کا اختیار کھو دینے کے باوجود وہ پاگل لڑکی ان کے دل میں زندگی کی طرح بھی دھڑک رہی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس کی طرف آئے تھے۔

اسے پکارا تھا۔ وہ دنیا جہان سے بیگانہ اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ ان کی نگاہیں اس پر سے پلٹنا بھول گئی تھیں۔ نہ اس نے ان کی نظروں کو تپش محسوس کی تھی اور نہ پکارے جانے پر ان کی طرف دیکھا تھا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ انہیں اب بھی نظر انداز کر رہی ہے۔ لیکن پھر انہیں اچانک ہی خیال آیا کہ وہ کسی بھی احساس کے زیر اثر نہیں ہے۔

اور وہ کس بے اختیاری سے اسے دیکھے جا رہے تھے، انہیں یک بیک احساس ہوا تو خود ہی پشیمان ہو گئے، انہیں یہ سب زیب نہیں دیتا

تھا۔ یہ نہ ان کی فطرت تھی اور نہ عادت، لیکن اسے سامنے دیکھ کر یہ بے اختیاری عمل خود بخود سرزد ہو جاتا تھا۔ وہ اٹھی اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اور انہیں لگا تھا جیسے وہ ابنارمل نہیں ہے۔ کیا انہوں نے اتنی گہرائی سے دیکھا تھا اسے یا اس کی محبت میں اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ اس کی کوئی بھی خامی دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود اپنی سوچ پر الجھ کر آگے بڑھ گئے تھے۔

چچا کی پریشانی پر وہ خود بھی بے چین ہو گئے۔ اس کے علاج کے بارے میں کافی تفصیل سے بات چیت کرتے رہے۔ گاہے بگاہے۔ ہارون بھی اس گفتگو میں حصہ لیتا رہا۔

چچا ڈاکٹر ہاشمی کے علاج سے کافی حد تک مطمئن تھے لیکن وہ آج کل ایک ہی پریشانی میں مبتلا ہوئے جا رہے تھے کہ ماہم نے اب بالکل بولنا چھوڑ دیا تھا۔

پہلے تو وہ کچھ اوٹ پٹانگ باتیں کر بھی لیا کرتی تھی۔ لیکن اب تو جیسے اس کے منہ میں گونند لگ گئی تھی۔

اور اس کے بارے میں وہ بہت فکر مند تھے۔ وہاج انہیں تسلیاں دیتے رہے۔

''انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بس دعا کیجیے۔'' لیکن ان کا دل خود اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا اور جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو ہارون نے کہا تھا۔

''وہاج بھائی! ماہم سے تو ملتے جائیے۔ کیونکہ جس کی عیادت کے لیے جاتے ہیں۔ تکلفاً یا رسماً اس سے مل ہی لیتے ہیں۔'' ہارون نے ہنس کر کہا تو وہ سادگی سے مسکرا دیے۔ حالانکہ ان کے دل میں بہت سی خواہشیں مچل رہی تھیں۔

ہارون کی ہمراہی میں وہ اس کے کمرے میں آ گئے۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ بالکل چپ چاپ۔ پہلی نظر اس پر پڑی اور دل میں شدید خواہش پیدا کہ اس لڑکی کو جھنجھوڑ ڈالیں اور چیخ چیخ کر کہیں کہ تم پاگل نہیں ہو۔ ہاں تم پاگل نہیں ہو۔

مگر پھر اپنی دیوانگی پر قابو پایا۔

جو سچ ہے وہ سامنے ہے مگر دل اس سچائی کو کیوں قبول نہیں کر رہا۔ اس کشمکش میں انہوں نے دوسری نظر ڈالنے میں از خود اجتناب برتا۔ اور وہ ہارون سے ہی گفتگو کرتے رہے۔

ہارون کے لیے ان کا یہ انداز وہی پرانا اور فطری تھا کہ وہ خواتین سے ایسے ہی اچٹتی، اٹھتی گرتی نگاہوں سے ہی مختصر گفتگو کیا کرتے تھے۔

جلد ہی وہ اٹھ کر چلے گئے۔

اور دو دن یونہی خود کو جھٹلاتے گزرے۔ بالآخر تیسرے روز ان سے رہا نہ گیا اور وہ آفس جانے سے پہلے چچا کے ہاں آ گئے۔ ہارون باتھ روم میں تھا۔ چچا آفس جا چکے تھے۔ وہ ٹیرس پر کھڑی تھی۔ انہوں نے لان میں سے اسے دیکھا اور گھر کے کسی بھی فرد سے ملے بغیر بلا جھجک اوپر آ گئے۔

''صبح بخیر'' بڑے ہشاش بشاش انداز میں سلام کیا۔

وہ بدستور خاموش ریلنگ پر ہاتھ رکھے نیچے دیکھ رہی تھی۔انہوں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

''کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟''انداز وہی پہلے والا تھا۔جواب پھر بھی نہیں ملا۔

وہ ایک دم ایسی جھنجھلاہٹ کا شکار ہوئے جیسے دیواروں سے باتیں کر رہے ہوں۔شاید یہ ان کا وہم ہو۔لیکن نہیں۔انہوں نے پُراعتماد نگاہ اس پر ڈالی پھر توقف سے بولے۔

''ماہم!آپ ابنارمل تو نہیں ہیں۔پھر آپ بول کیوں نہیں رہیں؟''

اور ماہم کو لگا جیسے اس کے سامنے سے پردہ کسی نے یکلخت ہٹا کر اسے ڈھونڈ لیا ہو۔

وہ چونکنا نہیں چاہتی تھی۔مگر چونک گئی۔آخر انہوں نے کس طرح محسوس کیا۔جبکہ وہ ڈاکٹر کو پاگل بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اس پاگل نے کیسے اسے کھوج نکالا تھا۔وہ اسی انداز میں کھڑی تھی۔جیسے یہ فقرے اس کے لیے بے معنی ہوں،وہ کہہ رہے تھے۔

''پاگل لوگوں کی آنکھیں ویران اور بے خیال ہوتی ہیں۔جبکہ آپ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں الجھی معلوم ہوتی ہیں۔

شاید آپ کو کسی نے بتایا نہیں۔آنکھیں دنیا کا سب سے بڑا سچ ہیں۔وہ ہمارا باطن عیاں کرتی ہیں اور آپ کی آنکھیں کہتی ہیں کہ وہ کھوئی ہوئی نہیں ہیں،زندہ ہیں۔''

انہوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور اس کے تاثرات لیے بغیر وہاں سے چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

اگلے ہفتے ہی اچانک ڈاکٹر ہاشمی خود اس سے ملنے آ گئے۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی، یوں لگ رہا تھا۔ اس کے زندان کی چابی ڈاکٹر کے پاس ہے اور وہ جلد ہی آزاد ہو جائے گی۔ لیکن اس نے اپنی کسی بھی کیفیت کا اظہار نہ کیا۔ کیونکہ وہ پاپا اور ہارون کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر ہاشمی سے مسئلہ ڈسکس کرنا چاہتی تھی

''ہاں بھئی! اب ہمارا پیشنٹ کیسا ہے؟'' انہوں نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔ لیکن وہ سر جھکائے انگشت شہادت سے میز پر لکیریں کھینچتی رہی۔

وہ پاپا سے بات چیت کرتے رہے۔ پاپا اس کے طور طریقوں کے بارے میں ان سے ڈسکس کر رہے تھے۔ اس میں جو نمایاں تبدیلیاں آئی تھیں وہ بتا رہے تھے۔ کافی دیر تک سلسلہ کلام جاری رہا۔ ڈاکٹر ہاشمی کافی حد تک مطمئن تھے۔

ساری بات سن کر کہنے لگے۔

''کلیم اللہ صاحب۔ آپ ایسا کریں ان کی شادی کر دیں۔ انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر کی بات پر پاپا دم بخود رہ گئے۔ ہارون کمرے میں موجود نہیں تھا۔

ورنہ ڈاکٹر کا یہ مشورہ اسے گالی سے کم نہ لگتا۔ وہ ذرا فاصلے پر بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر کا اور پاپا کا انداز بہت دھیما تھا۔ ان کا خیال تھا اس تک ان کی آواز نہیں جا رہی ہوگی۔ مگر وہ سب کچھ سن رہی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کیسی بات کر رہے ہیں!'' وہ نئے صدمے سے دوچار ہو کر بولے تھے۔

''کلیم اللہ صاحب! میں یہ مشورہ آپ کو انتہائی خلوص اور تجربے سے دے رہا ہوں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیٹی ٹھیک ہو جائے تو اس کی شادی جلد از جلد کر دیجئے۔''

''شادی تو ڈاکٹر صاحب کرنی ہی ہے۔ اور خدانخواستہ میری بیٹی کی عمر تو نہیں نکلی جا رہی۔ میں تو بڑی دھوم دھام سے شادی کروں گا اپنی بیٹی کی۔ مگر ان حالات میں شادی کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔'' وہ تڑپ کر بولے تھے۔

''دیکھیے کلیم صاحب۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں دوا دوں گا یا مشورہ وہ آپ لوگوں کے بھلے کے لیے ہی ہوگا۔ میں آپ کو کسی بھی خوش فہمی میں رکھنا نہیں چاہتا۔ جس طرح ممکن ہو سکا تھا۔ ہم نے کوشش کی اور رزلٹ بھی آپ کے سامنے ہے مگر اس بات پر یقین کر کے بیٹھ جانا کہ ماہم ایک دم سے ٹھیک ہو جائے گی بالکل غلط ہے۔ شادی تو آپ نے کرنی ہی ہے ناں۔ اب کر دیجئے۔ کیونکہ زندگی کے اندر خوشگوار تبدیلیاں لانے سے خوشگوار اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔''

وہ آہستہ آہستہ پاپا کو قائل کر رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر تھے اور ان کی ہر بات ہر دلیل سند کی حیثیت رکھتی تھی۔

''کلیم! ڈاکٹر ہاشمی نے صحیح کہا ہے۔ ماہم کی شادی کر دو۔ میں تو خود اتنے دن سے یہی بات سوچ رہا تھا۔ مگر کہا اس لیے نہیں کہ کہیں تمہیں برا نہ لگے۔''

''کافی دیر سے کلیم اللہ پریشان بیٹھے تھے اور...... حبیب اللہ انہیں اپنی رائے سے نواز رہے تھے۔ بلکہ سو فیصد ڈاکٹر ہاشمی سے متفق نظر آرہے تھے۔

''مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حالت میں اس سے شادی کرے گا کون؟'' بالآخر اعظم چچا نے پہلو بدل کر سوال کیا۔ آخر اس بحث کو کسی انجام تک بھی تو پہنچنا تھا۔

''حد کرتے ہو اعظم تم بھی؟'' حبیب یک بیک اشتعال میں آگئے۔ ''خاندان میں لڑکوں کی کمی ہے۔ کیا؟ جس بھائی یا بہن کے بچے پر کلیم اللہ ہاتھ رکھے گا وہی اس گھر کا داماد ہوگا'' انہوں نے سینہ ٹھونک کر کہا۔ ''اور پھر آزمائش کے وقت اپنے ہی کام آتے ہیں۔ ایسے وقت پر اپنے ہی اپنوں کے لیے قربانیاں دیتے ہیں۔'' وہ اچھی خاصی تقریر کے موڈ میں تھے۔

''میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی کی وجہ سے کوئی قربانی دے۔ اپنی زندگی کو عذاب میں ڈالے۔ اب جذبات میں آکر ہم بچوں کو پابند کر کے اس رشتے کے لیے رضامند کرلیں۔ کل کلاں کو اونچ نیچ ہو تو کون دیکھے گا۔ کون سنبھالے گا میری بچی کو میری طرح۔''

کلیم اللہ رتی برابر بھی مطمئن نہیں ہو رہے تھے کہ وہ اس حالت میں اسے خود سے جدا کریں۔

''دیکھو کلیم! ایسی باتیں غیروں کے لیے سوچی جاتی ہیں اپنوں کے لیے نہیں۔ ماہم تمہاری ہی نہیں ہماری بھی بیٹی ہے۔ تم یہ بات نہ سوچو۔'' سیف اللہ نے محبت سے کہا۔ ''بس فیصلہ کرو۔''

''بالکل!'' حبیب بولے۔ ''اور پھر یہ سوچو آج تمہارے سب بھتیجے، بھانجے کنوارے ہیں۔ رفتہ رفتہ سب رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ بے شک ماہم کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تھی اور نہ ہے۔ مگر جب باہر کا ایک رشتہ کیا ہوا ٹوٹ گیا تو پھر مزید رشتے کی توقع کرنا تو احمقانہ سوچ ہوگی اور میں تو اس حق میں تھا ہی نہیں کہ رشتہ باہر ہو، مگر تمہاری خوشی کے آگے خاموش رہا۔ جب گھروں میں برابر کے بچے ہیں تو آپس میں رشتہ داری سے اچھا اور کیا ہوگا۔''

انہوں نے بات مکمل کر کے حاضرین سے اتفاق چاہا۔

''بالکل۔ بالکل۔'' سب نے اتفاق سے کیا۔

''اور ہم تو یہی سوچتے تھے کہ کلیم بھائی اور حبیب بھائی آپس میں ہی رشتہ داری کریں گے۔ کیونکہ ہارون اور ماہم کے مابین بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ دونوں اکٹھے ہی پلے بڑھے ہیں۔ اس سے کامیاب شادی میرے نزدیک ہو ہی نہیں سکتی۔''

عظیم چچا نے اپنی رائے سے نوازا۔

''بالکل۔'' حبیب پرجوش انداز میں بولے۔ ''اور میں تو اب بھی خواہش مند ہوں کہ ماہم ہارون سے منسوب ہو کر میرے گھر آئے۔''

ہارون ابو کی بات پر بوکھلا کر رہ گیا۔ ابو کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی تھی۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ خالہ کی بیٹی دیبا میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اور بارہا اس خواہش کا اظہار کر چکا ہے۔

اور یہی خیال کلیم اللہ کا بھی تھا کہ اس وقت ہارون سے زیادہ پرفیکٹ لڑکا انہیں نہیں مل سکتا۔ کہ وہ ان کا دکھ اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ پھر ماہم کے لیے بھی الگ بے چین رہتا تھا۔

انہوں نے بے ساختہ ہارون کی جانب دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی۔ اس کے اڑے رنگ کو دیکھ کر کلیم اللہ کی آس ٹوٹ گئی۔ حسیب اللہ کہہ رہے تھے۔

''ہارون یہ ذمہ داری احسن طریقے سے سنبھال سکتا ہے۔''

''مگر ابو! میں نے تو ایسا کبھی نہیں سوچا۔ بخدا میں ماہم کو بہنوں کی طرح سمجھتا ہوں اور کچھ نہیں۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''خاموش رہو۔ وہ تمہاری بہن تو نہیں ہے۔ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے سب کزنز بہن بھائی ہی ہوتے ہیں۔'' انہوں نے ہارون کو جھڑکا۔

''مگر۔ مگر۔'' ہارون بے بسی سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن حسیب اللہ نے اپنی گھن گرج کے آگے اسے دبا دیا۔

''حسیب صاحب انہیں بولنے دیجیے۔ یہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔'' ڈاکٹر ہاشمی نے اس وقت بولنا ضروری سمجھا تھا۔

''کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ ذمہ داری سے پہلو تہی کر رہا ہے نانجار۔'' وہ بیٹے پر غضبناک ہوئے جا رہے تھے۔ انسان بھی کتنا خودغرض ہوتا ہے۔ اپنی غرض کے لیے دوسروں کے زخموں تک سے لہو نچوڑنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ انہوں نے ہارون کو بھائی کے حوالے کیا تھا تو کسی سوچ، کسی مفاد کے تحت ہی ایسا کیا تھا۔ لیکن جو وہ چاہتے تھے ویسا نہ ہو سکا۔ ہارون نے بڑی ایمانداری اور خلوص سے چچا کا بزنس سنبھالے رکھا۔ پھر انہیں یہ آس تھی کہ بیٹی کا رشتہ کرتے وقت ہارون پر خاص توجہ دیں گے۔ اور یقیناً ہارون ان کا انتخاب ہوگا۔ لیکن یہاں بھی ان کا تیر موافق طور پر نہ چلا اور ان کا انتخاب ذکریا چکزئی پر ٹھہرا لیکن جب ماہم کی ذہنی حالت کی وجہ سے یہ رشتہ ختم ہو گیا تو وہ بھائی سے ہمدردی کی آڑ میں پہلی بار اپنی خواہش کا اظہار کر رہے تھے وہ بھی بڑے مان سے، لیکن بیٹے کے انکار نے ان کا منصوبے پھر سے خاک میں ملا ڈالے تھے، ڈاکٹر ہاشمی کے بیچ میں بولنے پر انہوں نے کہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب اس کے انکار پر کیا کان دھر رہے ہیں آپ، ہماری اولاد ہے۔ ہم سے باہر نہیں ہے۔''

''مگر حسیب صاحب! اس معاملے میں جذباتی سوچ نہیں چلے گی اور نہ ہی زبردستی کا سودا ہو سکتا ہے۔ یہ ذمہ داری کسی ایسے فرد کو سونپنا ہوگی، جو بہت ٹھہرے ہوئے مزاج کا بندہ ہو۔ غصے پر کنٹرول رکھ سکتا ہو۔ جبکہ ہارون بے حد جذباتی ہے بہت جلد اشتعال میں آ جاتا ہے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر جھنجلا پڑتا ہے اور جب مستقل طور پر یہ ذمہ داری سونپی جائے گی تو وہ اپنے مزاج سے لڑے گا یا اپنا رمل شریک حیات سے۔ ذرا سوچیے ایسی صورت حال میں شادی کس طرح کامیاب ہوگی۔'' حسیب اللہ جز بز ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر ہاشمی تھوڑا سا مسکرائے پھر کہنے لگے۔

''حسیب صاحب! اپنے اس اینگری مین کے لیے کسی شگفتہ مزاج لڑکی کا انتخاب کیجیے گا۔''

عظیم چچا کو ڈاکٹر کی منطق سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''ہاشمی صاحب! یہ تو روایت ہے کہ مرد کا غصہ اور عورت کی حیا فطری ہوتی ہے۔ غصہ مرد کی مردانگی ہے اور حیا عورت کا روپ، آپ ہارون کو محض اس بنیاد پر ریجیکٹ کر رہے ہیں پھر تو کوئی بھی لڑکا منتخب نہیں ہو سکتا۔ اور ہمارے یہاں تو ماؤں کے لاڈ پیار نے بیٹوں کو اور بھی ضدی اور ہٹیلا بنا رکھا ہے۔ فیصلہ آپ نے بہت مشکل کر ڈالا ہے۔''

بات تو سوچنے والی تھی۔ ڈاکٹر خود تفکر کا شکار نظر آ رہے تھے۔ بے شک یہ ان لوگوں کا ذاتی معاملہ تھا لیکن ڈاکٹر کی رائے اس لیے لی جا رہی تھی کہ یہ فیصلہ علاج کے طور پر بھی ہو رہا تھا۔ اور کلیم اللہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کوئی غلط فیصلہ کریں۔ اس لیے انہوں نے انہیں بلایا تھا۔

''کلیم اللہ! ذرا غور کرو۔ تو تمہیں اپنے ہی خاندان میں وہ گوہر نایاب بھی مل جائے گا۔ جس کی تمہیں اس وقت تلاش ہی نہیں ضرورت بھی ہے۔'' سیف اللہ نے رسان اور خلوص سے کہا تو سب کے ذہن یکلخت وہاج حسن کی طرف گئے۔

''میرا سعادت مند بیٹا وہاج حسن۔'' انہوں نے تفاخر سے وہاج کا نام لیا۔

کلیم اللہ نے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ ہاں وہاج بھی تو تھا۔ مگر ان کا ذہن اس بات پر سدرہ آپا کے بڑے بیٹے عادل پر بھی گیا تھا کہ وہ بھی تو سلجھے ہوئے ذہن کا لڑکا تھا۔ سدرہ آپا نے پیشکش بھی نہ کی تھی۔ وہ کرتیں بھی کیسے کیونکہ عادل نے ابوظہبی میں شادی رچالی تھی اور یہ بات صیغہ راز میں تھی جس سے صرف سدرہ پھپھو ہی واقف تھیں۔ اس لیے وہ خاموش بیٹھی تھیں اور ان کی خاموشی کو کلیم اللہ پہلو تہی سمجھ رہے تھے۔ جب ہی انہوں نے بڑے بھائی کی پیش کش پر دلبرداشتہ ہو کر کہا تھا۔

''ہاں وہاج بہت صابر اور شاکر بچہ ہے۔ لیکن اس سے پہلے مرضی پوچھ لیجیے۔ میں نہیں چاہتا اس قربانی میں کسی کا نقصان ہو۔''

''کیسی بات کر رہے ہو کلیم! میرا بیٹا بہت سعادت مند ہے فوراً سر جھکا دے گا۔''

''لیکن میں سر سے زیادہ دل کے جھکاؤ پر یقین رکھتا ہے سر جبراً جھکائے جا سکتے ہیں مگر دل محبت سے جھکتے ہیں۔''

''کلیم! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔'' سیف اللہ ان کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔

''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں تمہیں وہاج سے پوچھ کر ہی جواب دوں گا۔''

اور اس کے ساتھ ہی محفل برخاست ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

سیف اللہ نے وہاج حسن کے گوش گزار سارا مسئلہ من وعن بیان کیا پھر ان سے ان کی رضامندی پوچھی تو وہ گنگ رہ گئے وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی محبت کا ملاپ خود بخود زندگی کے اس موڑ پر یوں ہو جائے گا۔ ان کی کیفیت ایسی تھی جیسے قیمتی کھوئی ہوئی چیز پھر سے مل جائے۔ مگر وہ اس وقت کسی بھی خوشی کا اظہار نہ کر سکے۔ بس سادگی سے یہی کہا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔ میری طرف سے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

سیف اللہ کو امید تھی بلکہ یقین کامل تھا کہ ان کا بیٹا کبھی بھی انکار نہیں کرے گا۔ بلقیس بیگم نے بڑھ کر بیٹے کی پیشانی چوم لی۔ کبھی بھی کسی چیز کی ضد نہیں کی۔ کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ ہمیشہ ہر بات میں بیٹیوں کی طرح سر جھکا دیا۔ اور اب بھی ماں باپ کی خاطر اتنی بڑی قربانی دے رہا ہے۔ بلقیس کی آنکھوں میں اشک رواں ہو گئے تھے۔

''امی! آپ کو کیا معلوم یہ قربانی میرے لیے کتنا بڑا انعام ہے۔''

وہاج حسن نے ماں کی آنکھوں کے آنسو پوروں میں جذب کر لیے، پھر کہنے لگے۔''

''قربانی تو بہت عظیم لوگ دیتے ہیں۔ یا پھر شاید بحالت مجبوری کا نام ایثار ہو۔ مگر میں صرف اپنی والدین کی خوشنودی کو اپنی زندگی کی خوشی سمجھتا ہوں۔''

ان کی بات پر بلقیس نہال ہی ہو گئیں۔ انہوں نے مسکرا کر ماں کی گود میں سر رکھ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دوسرے ہی روز وہ لوگ انگوٹھی پہنانے کے لیے آ رہے تھے۔ سیف جاہ اور بلقیس بیگم کی یہی خواہش تھی کہ منگنی سے لے کر شادی تک ہر رسم با قاعدہ اور دھوم دھام سے ادا ہو گی اور اسے جب پتا لگا کہ اتنی جلدی یہ بات اس طرح طے ہو گئی ہے تو وہ گنگ رہ گئی۔

''ڈاکٹر کے شادی والے مشورے پر وہ جی جان سے جل کر رہ گئی تھی۔ بس نہیں چلا تھا کہ ڈاکٹر کا سر پھاڑ ڈالے۔ وہ تو اندازہ ہی نہیں کر سکتی تھی کہ ڈاکٹر اس کے لیے اتنے انوکھے علاج کا مشورہ دیں گے۔ طرہ وہاج حسن کا پروپوزل پھر با قاعدہ منگنی کا اہتمام، اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

آخر ایسی بھی کیا آفت آن پڑی تھی جو شادی ہی زندگی کا مقصد رہ گئی تھی۔ آخر اس بات سے ہٹ کر زندگی میں کوئی بات ہی نہیں رہی تھی کیا؟ اس کا سلگ سلگ کر برا حال تھا۔

وہ جو زندگی کے چیپٹر کو اچھی طرح سے انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ من پسند زندگی گزار کر۔ آزادی کے ساتھ۔ اپنی خواہش اور فیصلوں کے ہمراہ اب ناپسندیدہ کھینچے گئے حصار میں جھنجھلا اٹھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز اسے بڑی دھوم دھام سے وہاج کے ساتھ رسمی طور پر منسوب کر دیا گیا۔ محض انگوٹھی کا رشتہ تھا۔ ٹوٹ بھی سکتا تھا لیکن جب تائی جان نے پاپا سے کہا کہ وہ آج ہی شادی کی تاریخ دے دیں، تو وہ حواس باختہ رہ گئی۔

بلاوجہ ہی انگوٹھی کو گھور گھور کر دیکھے جا رہی تھی۔ رات انگاروں پر بسر ہوئی۔ لو بھلا شرافت کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ اب اگر میں وقتی طور پر منگنی پر رضا مند ہو گئی ہوں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس ہونق سے شادی بھی کر لوں گی۔

''آ جائیں ذرا ڈاکٹر ہاشمی۔ پوچھ لوں گی ان سے، پتا نہیں کس نے انہیں ڈاکٹر بنا دیا۔ ایک لڑکی نے چلا دیا اور چل گئے۔ اوپر سے مشورہ

دیکھو کیا عظیم الشان دے گئے ہیں۔

اور وہ موصوف کس خوش فہمی میں ہیں۔ ٹھیک کر دوں گی انہیں بھی۔

وہاج حسن کے پاس جانے کی اسے ضرورت اس لیے محسوس ہوئی تھی کہ سب کی نظروں میں وہ ایک ابنارمل لڑکی تھی۔ انکار کر کر کے تھک جاتی مگر اس کی بات ہرگز نہ سنی جاتی، نہ مانی جاتی۔ جب تک ڈاکٹر ہاشمی نہیں آتے یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ تھا۔ اس بات کا حل یہی تھا کہ وہاج حسن خود انکار کر دیں۔

☆ ☆ ☆

وہاج حسن اچانک اسے اپنے آفس میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بلا ارادہ ہی وہ اپنی نشست سے اٹھے تھے، حیرانگی خوشی۔ عجیب طرح کی کیفیات سے دو چار ہو کر اور اس کے چہرے پر اتنا غصہ، آنکھوں میں رعونت۔ لب سختی سے بھینچے تھے۔ تمام تر احساسات نارمل انسانوں والے تھے۔

آخر انہیں ہی ایسا کیوں لگتا تھا کہ وہ نارمل ہے۔

''تشریف رکھیے۔'' انہوں نے بڑے رسان سے کہا۔ ہر لحاظ سے وہ ان کے لیے قابل احترام اور محبت کے رویے کی حق دار تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کا انداز تخاطب ہر شخص سے اتنا دھیما اور میٹھا ہوا کرتا تھا۔

ماہم نے غصے سے انہیں دیکھا اور کہنے لگی۔ ''میں یہاں آپ کی ہمدردی لینے نہیں آئی ہوں۔ کیونکہ میرے مونس اور غم خواروں کی دنیا میں کوئی کمی نہیں ہے۔''

وہاج حسن اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

''میں یہاں صرف اتنا بتانے آئی ہوں، وہاج حسن کہ میں ابنارمل لڑکی نہیں ہوں۔''

یہ لفظ، یہ جملے ان کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا کر گئے۔ جیسے اس نے اپنے نارمل کا نہیں محبت کا اعتراف کیا ہے۔

''مجھے معلوم ہے۔ آپ ابنارمل نہیں ہیں۔'' وہ خوشی چھپا کر سکون سے بولے۔

''پھر بھی، پھر بھی وہاج آپ نے اس کو نہیں بتایا اور اس فیصلے پر جانتے بوجھتے ہوئے رضامند ہو گئے۔ آخر کیوں؟''

اس نے تلخی سے پوچھا۔ پھر اسی انداز میں بولی۔

''کسی کو نہ بتانے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ حسب عادت آپ اپنے اندازے پر غیر اعتمادی کا شکار ہوں گے۔ جبھی اس بات کی تشہیر نہیں کر سکے لیکن آپ کو ذی ہوش ہونے کی بدولت یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ آخر میں پاگل کیوں اور کس واسطے بنی ہوئی ہوں۔'' وہ یک بیک تلخی کا شکار ہو گئی۔ ''اگر مجھے آپ جیسا ہی قبول ہوتا تو میں ذکریا اچکزئی کے حق میں ہی نہ ووٹ دے دیتی۔ جس سے جان چھڑانے کے لیے میں نے یہ ناٹک رچایا۔ اس سے جان چھوٹی تو آپ آ گئے۔''

وہاج حسن کے پورے وجود میں خون کے بجائے آگ گردش کرنے لگی۔

اسے اچانک اپنی تلخی کا احساس ہوا تو خود کو قدرے نارمل کر کے بولی۔

''دیکھیے حسن جاہ! بات سادہ سی یہ ہے کہ اگر میں بالفرض نارمل ہوتی تو میرے لیے آپ کے بارے میں کوئی سوچتا بھی نہیں۔ پورے خاندان کے لڑکوں میں آپ کو منتخب اس لیے کیا گیا ہے کہ میرے ساتھ زندگی گزارتے وقت آپ کا رویہ حلیم رہے۔''

اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''ڈاکٹر اور بزرگوں کے نزدیک مجھے سنبھالنے کے لیے ایسے مرد کی ضرورت ہے جو میری زیادتیوں کو صبر سے سہہ سکے۔ قصہ مختصر ٹھنڈے مزاج کا ہو۔ سو آپ نظر انتخاب بن گئے۔ لیکن جب میں پاگل ہی نہیں تو پھر آپ کا انتخاب تو بے معنی ہو گیا ناں وہاج حسن۔ بالکل ایسے ہی جیسے اپاہج تندرست ہو جائے تو بیساکھی بے کار ہو جاتی ہے، تو سن لیجیے۔ آپ کو میرے لیے بیساکھی کے طور پر منتخب کیا جا رہا ہے، اور کچھ بھی نہیں''

اس کے یہ لفظ وہاج حسن کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گئے۔

وہ بس خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔

ان کی چاہت کا اتنا بڑا مذاق اتنی تذلیل۔

''اس لیے براہ کرام۔ آپ اپنی طرف سے یہ رشتہ ختم کر دیجیے۔ میں انکار کروں گی تو خوامخواہ بات بڑھے گی، ہنگامہ ہو گا۔''

''ماہم جاہ! آپ یہ کیوں نہیں کہہ رہیں کہ آپ کی بات کوئی نہیں مانے گا۔''

''اس لیے بہتر ہے، انکار آپ کی طرف سے ہو اور سکون سے بات ختم ہو جائے۔ تاکہ میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود سکون اور اطمینان سے کہیں اور کر سکوں۔''

''آخر اس سلسلے میں انکار کیوں کرنا چاہتی ہیں؟''

''انہوں نے پہلی بار بڑے نپے تلے انداز میں سوال کیا۔ بغیر کسی تاثر کے۔ اپنا آپ عیاں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس نے مسکرا کر تنقیدی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔

''اگر یہ فیصلہ اتنا ہی آسان ہوتا تو کب کا ہو چکا ہوتا۔ یہاں تک تو نوبت ہی نہ آتی، بہت مرد آئے میری زندگی میں حسن جاہ! میرے خواہش مند، میرے طلب گار، ایک سے بڑھ کر ایک۔ جنہیں میں نے وقت کی طرح گزار دیا۔ کیونکہ کوئی بھی اس دل کو نہیں جیت سکا تھا۔''

اور پھر وہ ایک ایک بات اتنی ترتیب سے اتنے تفخر سے بیان کرتی گئی کہ حسن جاہ بس سن ہی رہے تھے۔

''اتنے لوگوں میں سے میں نے کسی ایک کو بھی منتخب نہیں کیا۔ آپ کا شمار تو کہیں بھی نہیں آتا حسن جاہ!''

اس کا انداز بڑا تضحیک آمیز تھا۔ جیسے ہمیشہ سے ہوا کرتا تھا۔ وہ اگر زبان سے نہیں کہہ رہی تھی تو نگاہیں بہت کچھ جتا رہی تھیں۔ کتنی حقارت سے اس نے انہیں رد کیا تھا۔

''دیکھیے حسن جاہ! سارا فساد، ساری جنگ اس دل کی ہے، جو بات اس مقام تک آن پہنچی ہے۔''

کافی دیر تک وہ بولتی رہی۔

’’آپ نہیں سمجھیں گے، اور نہ میں آپ کو سمجھانا چاہتی ہوں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ آپ جیسا شریک سفر کم از کم مجھ جیسی لڑکی کا آئیڈیل نہیں ہوسکتا۔‘‘

اس کا انداز بدستور وہی تھا۔ کس قدر خوش فہمی اور غلط فہمی کا شکار تھے وہ۔ اس کی نظروں میں ان کی کوئی وقعت ہی نہیں تھی، بچپن سے وہ ان کا مذاق اڑاتی تھی اور وہ خوش رہتے تھے۔ ہر حال میں خوش۔ وہ کیا سمجھتے تھے اور کیا نکلی تھی، وہ کہہ رہی تھی۔

’’آپ نے انکار نہیں کیا تو میں خود انکار کردوں گی۔ یاد رکھیے گا، یہ شادی ہرگز ہرگز نہیں ہوگی اور یہ بھی یاد رکھیے گا کہ میری ضد کے آگے کسی کی مرضی نہیں چل سکتی۔ اگر کسی نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں ناک میں دم کر کے رکھ دوں گی، اور پاگلوں سے ہر قسم کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ چلتی ہوں اور ہاں اگر آپ نے یہ سب کچھ اب کسی کو بتانے کی زحمت گوارا کی تو کوئی بھی آپ کی بات کا یقین نہیں کرے گا۔ کیونکہ میں ابنارمل لڑکی ہوں۔ مگر بن رہی ہوں۔ یہ بات آپ تو کیا کوئی بھی ڈاکٹر ثابت نہیں کرسکتا۔ جب تک میں خود نہ چاہوں۔‘‘

وہ کہہ کر چلی گئی۔ انہیں لگا جیسے وہ کمرے میں آگ لگا گئی ہو۔ وجود سے لے کر در و دیوار تک سلگ اٹھے تھے۔ ایک بنا بنایا پیکر بھر بھری مٹی کی طرح ان کے قدموں میں ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ وہ پیکر جو انہوں نے بچپن سے تراشا تھا۔ اتنا گھناؤنا تھا اس کا روپ۔ انہیں اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ جو ان کی تذلیل کر گئی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ وہ خود سے نالاں تھے کہ انہوں نے ایسی لڑکی کے بارے میں سوچا ہی کیوں؟ کیا وہ ان کے قابل تھی، اس کا ماضی ذرا بھی قابل اعتبار نہیں تھا۔ تو پھر وہ ان کی محبت کے لائق کس طرح ہوگئی تھی۔

وہ جو کھل کر سامنے آئی تھی۔ ان کے پیروں کی دھول بھی نہیں تھی۔ انہوں نے بڑی نفرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا، اس نفرت میں پچھتاوے ہی پچھتاوے تھے۔

☆ ☆ ☆

رات نیند نہ آنے کے بعد وہ یونہی کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔

اس وقت ان کے ہاتھ میں سعد اللہ شاہ کی کتاب تھی ''اک کمی سی رہ گئی'' ورق الٹے پلٹتے اچانک حسب حال نظم پر ان کی نگاہیں رک گئیں۔

ڈالے لمبی زلف کا گہنا
تیرا سامنے بیٹھتے رہنا
ہاتھ میں بالوں کی لٹ پکڑے
اوپر چھت کو تکتے رہنا
سنتے رہنا کچھ بھی نہ کہنا
تیری سہیلی کا مجھے تکنا
ہنسنا اور کچھ بھی نہ کہنا
ایسے لمحے میں اسے پیار سے!
کتنا اچھا لگتا تھا تو!
کان میں اپنی سہیلی کے جب
مجھ کو بدھو کہتا تھا
کتنا اچھا لگتا تھا تو
میرے دل میں رہتا تھا تو
میرے دل میں رہتا تھا تو
میرے دل میں رہتا تھا تو

زیر لب انہوں نے کئی بار دہرایا اور کتاب بند کر کے سینے پر رکھ لی اور کرب سے آنکھیں موندلیں۔

☆ ☆ ☆

دونوں طرف شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے اور ساتھ ہی اس کے خودساختہ پاگل پن کے دورے۔ وہی بار بار مشتعل ہونا۔

لڑنا جھگڑنا۔ اشیاء اٹھا اٹھا کر پھینکنا، چیخنا چلانا کبھی کبھی ٹھیک باتیں کرنا۔ کبھی یک بیک اشتعال میں آجانا اس نے سب کچھ کر ڈالا۔ مگر وہ شادی نہیں روک سکی۔

نہ ہی ڈاکٹر ہاشمی سے ملاقات ہوسکی۔

نہ ہی وہاج حسن کی طرف سے کوئی رسپانس ملا۔

اس نے مسلسل ایک فساد برپا کر رکھا تھا۔

کلیم اللہ جاہ ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔

آج اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ پاپا کو سارا سچ بتا دے گی، چاہے وہ ناراض ہوں۔ رسوائی حاصل ہو۔ کچھ بھی ہو، اور وہ یہی سب کچھ بتانے ان کے کمرے میں جا رہی تھی کہ دروازے کے باہر ہی رک گئی۔ اندر سے مبہم سی آوازیں آ رہی تھیں۔ پاپا زاروقطار رو رہے تھے تایا انہیں تسلیاں دے رہے تھے، ہارون علیحدہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

پاپا کی کیفیت جو اس نے دیکھی، اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے اپنی ترجیحات کے سامنے یہ رخ دیکھا ہی نہیں تھا کہ اس کے باپ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ کس تکلیف میں ہوں گے۔ کتنی اندھی ہوگئی تھی۔ وہ ایک خواہش کے آگے۔ پاپا کا تو کوئی بھی نہیں تھا اس کے سوا۔

ندامت سے وہ کمرے میں نہ جا سکی، اور واپس پلٹ آئی، کیا یہ سب اسے کرنا چاہیے تھا اور اب بتا کر وہ کیا کرلے گی، نئے دکھ اور عذاب۔ جو دکھ دے چکی تھی۔ ان کا مداوا صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا تھا کہ وہ خاموشی سے شادی پر رضامند ہو جائے۔

یہی ایک نجات تھی یہی ایک راستہ تھا عزت کی زندگی حاصل کرنے کا۔ ڈاکٹر ہاشمی نے کہا تھا وہ اچانک بالکل کبھی ٹھیک نہیں ہوگی، اسے آہستہ آہستہ ثابت کرنا گا کہ وہ ٹھیک ہوگئی ہے۔

ہاں۔ وہ وہاج حسن سے ہی شادی پر رضامند ہو جائے گی۔ خاموشی اختیار کرے گی۔

جب اتنے عرصے بھی باوجود کوشش کے کوئی اس دل کو نہیں جیت سکا، تو پھر آئندہ چند مہینوں یا گئے سالوں پر کیا توقع رکھی جائے۔ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ساری عمر یہ معاملہ پیش نہ آئے۔ اس نے اپنے آپ کو ہرا دیا۔ ایک معمولی خواہش ہی تو تھی۔ مگر۔

مگر۔ نکاح ایک مضبوط بندھن ہے۔ زندگی میں بہت سارے تجربوں سے ایک تجربہ شاید یہی کامیاب ہو جائے۔ ہارتے ہارتے وہ ایک بار پھر نئی توانائیوں سے لبریز ہو کر اٹھی تھی۔

اور یوں وہ خاموشی سے مگر دھوم دھام سے بیاہ کر وہاج حسن کے گھر آ گئی۔

لیکن یہاں آ کر ساری بساط ہی بگڑ گئی تھی۔ کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

حتیٰ کہ اس کی خواہش کو ناپید کر دینے کے بعد۔ سمجھوتے کا، مصلحت کا، زندگی کا عام سا رخ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ جیسے کے لیے، وہ تو جیتے جی مر گئی تھی۔

اس تمنا میں ہو گئے رسوا
ہم بھی جی بھر کر عاشقی کرتے

شاید یہی ایک شعر اس کی پوری زندگی کا ترجمان تھا۔

وہ ابھی بستر میں پڑی اینٹھ رہی تھی کہ چھوٹی چچی نے آ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اپنے اردگرد اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ جویریہ اس کا سامان سمیٹ رہی تھی چچی کہہ رہی تھیں۔

''یہ لوگ تمہیں لینے کے لیے آئے ہیں۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

وہ ابھی سمجھی بھی نہیں تھی کہ کہاں جانا ہے کہ پاپا آ گئے۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا جیسے اسے پھر سے رخصت کرنے کے لیے اس پر دست دعا رکھ رہے ہوں۔ اس کی طبیعت کا پوچھا۔ پھر کہنے لگے۔

''بیٹا! ناشتا کر لو۔ ہارون تمہیں ان لوگوں کے ہمراہ چھوڑ آئے گا۔ تمہاری تائی جان نیچے بیٹھی ہوئی ہیں۔''

پاپا کو دیکھ کر اس کے تمام حوصلے پست ہو گئے۔ خاموشی سے اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔

جو کچھ کرنا ہوگا عقل مندی سے کرنا ہوگا۔ خاموشی سے اور احتیاط سے کفن تو تیار ہو، مگر عزت کا جنازہ نہ نکلے۔ دامن کے داغ کسی کو دکھائی نہ دیں۔

شام کو ولیمہ تھا اس لیے رابعہ اور مہتاب چچی اسے بیوٹی پارلر لے گئیں۔

اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ فی الوقت وہ دوسرے کمرے میں قیام کرے گی۔ پھر وہ تعلیم یافتہ تھی، اسے علم تھا کہ ایسی مشکوک صورت میں میاں بیوی کو فوراً علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے، جب تک واضح طور پر شوہر اقرار نہ کرے۔

ملاپ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر اسے واضح طور پر طلاق دی گئی تھی۔ وہ عدالت سے رجوع کرنے کی حق دار تھی۔ آج کے دور میں عورت اتنی پست اور بے بس نہیں تھی۔ حق خود ارادیت کے لیے سب کچھ کر سکتی تھی۔ وہ یہ ہٹ دھرمی اب مزید چلنے نہیں دے گی۔

ولیمے کا فنکشن ختم ہوا تو سمیعہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ گئی۔ وہاج ابھی مہمانوں کو رخصت ہی کر رہے تھے، اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ تکیے اور لحاف کو سمیٹا اور دوسرے ملحقہ بیڈ روم میں بستر لگا کر اندر سے دروازہ لاک کیا، اور اطمینان سے سو گئی۔ فی الوقت یہی ایک راہ تھی، باقی بعد میں سوچا جا سکتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ دونوں کمروں کے درمیان مشترکہ دروازہ تھا جو دونوں کمروں کو آپس میں ملاتا تھا۔ باہر والا دروازہ بند رہنے سے پتا نہیں لگتا تھا کہ اندر دونوں کمرے استعمال ہو رہے ہیں یا ایک۔ دن بھر مہمانوں کی آمد و رفت، پھر رات کو تھک ہار کر سو جانا۔ اسے کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ دو روز اسی کامیابی میں گزر گئے۔

اسے سکون کے ساتھ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ وہاج حسن نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ حالانکہ صبح ناشتے کے وقت سمیعہ جب دروازہ بجاتی تو وہ اٹھ کر اس کمرے میں جاتی، پھر دروازہ کھول کر ناشتا اندر لے لیتی۔ وہاج سو رہے ہوتے تھے، دروازہ بجنے کی آواز اور برتنوں کی آواز پر ہی اٹھتے تھے۔

ان کی خاموشی اسے بڑی پراسرار لگ رہی تھی، ایسا لگتا تھا۔ شکاری دم سادھے فی الوقت تاک لگائے بیٹھا ہے۔ جہاں وہ چوکی۔ وہیں شکار ہو جائے گی۔ نوشی گیلانی کی نظم ''کشف'' اس کی کیفیت کی غماز تھی۔

جانے شاعرہ نے کس احساس کے زیر اثر، کس حادثے کا وسوسہ ظاہر کیا تھا۔ لیکن اسے یوں اپنی ہی ذات کا دھڑ کا لگا رہتا۔ اور ہر وقت یونہی لگتا۔

مجھے احساس ہوتا ہے۔

جہاں میں آنکھ جھپکوں گی

وہیں پر حادثہ ہوگا۔

تیسری صبح سمیعہ نے ناشتے کے ساتھ اسے پیغام دیا کہ بھائی سے کوئی ملنے آیا ہے۔ انہیں جگا دیجئے۔ اس نے ناشتا میز پر رکھ کر دیکھا۔ وہ بے سدھ سو رہے تھے۔ اس طرح کہ لحاف آدھا ان پر تھا اور آدھا بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ بالکل چت پڑے تھے۔ شاید وہ زندگی میں پہلی بار بغور انہیں دیکھ رہی تھی۔ اور وہ بس دیکھتی ہی رہی۔ کئی لمحے یونہی خاموشی سے سرک گئے، کوئی بھی احساس نہیں تھا اس وقت دل میں، نہ نفرت کا انتقام کا۔

ہاں مگر ملال ضرور تھا، لٹ جانے کا، یا کھو دینے کا۔ کچھ علم نہیں۔

سن لیا ہم نے فیصلہ

اور سن کر اداس ہو بیٹھے

ذہن چپ چاپ آنکھ خالی ہے

جیسے ہم کائنات کھو بیٹھے

کرب سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور پر سکون سو رہے تھے۔ کتنے سکون سے سو رہے ہیں وہاج حسن ایک لڑکی کی زندگی میں آگ لگا کے۔ کیا بگاڑا تھا میں نے آپ کا۔ یکا یک اس میں نفرت کی آگ دہک اٹھی۔ یہ شخص واجب القتل تھا۔ اگر اس کے پاس اس وقت کوئی ہتھیار رہتا تو انہیں ہمیشہ کے لیے سلا دیتی۔ کاش وہ کچھ تو کر سکتی۔ اس نے بے چارگی سے ہاتھ مسلے۔ سمیعہ کچھ کہہ کر گئی تھی، اسے خیال آیا۔ فی الحال تو یہی کرنا تھا۔

''سنیے!'' اس نے بے لچک انداز میں پکارا۔ وہ ایسے ہی پڑے تھے۔ وہ جھنجھلا گئی۔

ہر روز تو دروازہ بجنے پر ہی اٹھ جاتے تھے، آج کیا نشہ کر کے سو رہے ہیں۔ اس نے زہر بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہو سکتا ہے طبیعت خراب ہو۔ مگر میں کیا کروں لحاف ڈال دوں۔ کیوں۔ کیا لگتے ہیں میرے؟''

اس نے نفرت سے ان کی طرف دیکھا اور باتھ روم میں چلی گئی۔ البتہ دروازہ اتنی زور سے بند کیا تھا کہ وہ تو وہ ان کے فرشتے بھی جاگ گئے۔

طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ان کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ انہوں نے گھور کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر ریسٹ واچ اٹھائی۔

''مائی گاڈ۔ سفیر نے آنا تھا'' انہیں یکا یک خیال آیا۔ جلدی سے اٹھے۔ قمیص پہنی۔ بالوں میں برش کیا۔ اس وقت وہ وارڈروب میں گھسے کاغذوں کی کانٹ چھانٹ کر رہے تھے کہ وہ باتھ روم سے برآمد ہوئی۔ انہیں جاگا دیکھ کر تیزی سے اپنے کمرے میں جانے لگی۔ تو وہ فوراً پلٹ کر

بولے۔

''سنو ماہم جاہ!'' اس کے قدم رک گئے۔

''رکھوالی اس چیز کی کی جاتی ہے، جس میں کچھ ہوتا یا اس گھر میں اچھا لگتا ہے۔ جو مال و اسباب سے بھرا ہو۔ خالی مکانوں کے کھلے ہوئے دروازے سے راہگیروں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ گھر ہر ایک کے لئے گزرگاہ تو ہوسکتے ہیں ڈاکے کا سبب نہیں۔''

کتنی حقارت سے انہوں نے کہا تھا۔ جیسے کھلے عام اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔ آنکھوں میں آنسو فوراً امڈ آئے۔

تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

''وہاج حسن! ایک عورت کی بے بسی پر دلیر ہو رہے ہو۔ کھیل رہے ہو اس کی زندگی سے، یہ بہادری نہیں ہے۔'' اس نے گہری چوٹ کی، لہجہ بھیگ رہا تھا، وہ کھل کر ہنسے۔

''بہادری تو واقعی تمہاری ہے۔ پھر سے آگئیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے۔'' انداز بے حد ہتک آمیز تھا، وہ کٹ کر رہ گئی۔ ''اللہ کرے آپ کی بہنوں کے آگے آئے۔ جیسا آپ نے میرے ساتھ کیا ہے۔''

اس نے ہتھیلیوں سے آنسو رگڑتے ہوئے با آواز بلند بددعا دی۔

''بڑا روایتی انداز ہے بددعا کا۔ لگتا ہے اس فیلڈ میں بھی بہت پرانی ہو۔'' انہوں نے مسکرا کر اطمینان سے کہا۔ تو وہ انگاروں پر لوٹتی بے چارگی سے اپنے کمرے میں آکر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

گھر شادی کے ہنگاموں کی وجہ سے کافی حد تک بے ترتیبی کا شکار تھا۔ وہ سمیعہ اور جویریہ کے ساتھ کام کاج میں لگ گئی، اس کا ارادہ تھا کہ سمیعہ جویریہ صفائی کرلیں گی ملازمین کے ساتھ مل کر تو وہ کھانا بنالے گی مگر گھر کے کسی فرد نے بھی اسے کچن میں جانے نہیں دیا۔ یقیناً اس وجہ سے کہ کچن میں سو طرح کی خطرناک اشیاء ہوتی ہیں۔ کہیں وہ کسی چیز سے خود کو نقصان نہ پہنچالے۔

اسے یہ بات محسوس کر کے دلی دکھ ہوا۔ سو اس نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا، اور دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ اپنے ہی بوئے ہوئے بیج جو تھے۔

سمیعہ کچن میں چلی گئی۔ اس کے پاس تھا بھی کیا کرنے کے لیے۔ سوائے سوچوں کے لامتناہی جال کے۔ کام کاج میں لگ کر اس کا ذہن کافی حد تک بٹ گیا۔ سب کے روکنے ٹوکنے کے باوجود وہ باز نہیں آئی اور بدستور کام میں لگی رہی۔

''بعض اوقات تو بالکل ہی نہیں لگتا تھا کہ یہ لڑکی پاگل ہے۔ میرے خدا اگر تو اسے ایسا ہی رکھے تو اسے دیکھ دیکھ کر نظریں اتارتی رہوں۔''

کپڑے ڈال کر جب وہ نیچے آئی۔ تو شام ہو چکی تھی۔ تائی جان نے کہا۔ ''اب جا کر حلیہ تبدیل کرو کوئی ملنے والا بھی آسکتا ہے، اور پھر چار دن کی دلہن ہو، نہ کام کرنا زیب دیتا ہے اور نہ یہ حلیہ۔'' انہوں نے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر پیار سے کہا۔

وہ جانتی تھی کہ اس کا دل رکھنے کے لیے تائی جان صبح سے خاموش تھیں، وگرنہ دوسری صورت حال میں اسے بری طرح جھڑک دیتیں۔

اور اٹھ کر پانی بھی نہ پینے دیتیں۔ وہ بس مسکرا دی۔ اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ آئی تو اسی غرض سے تھی کہ حلیہ ٹھیک کرے گی، لیکن دونوں کمرے توجہ کے طالب نظر آئے، کشن بدلے۔ پردے جھاڑے، بیڈ شیٹس تبدیل کیں، جھاڑ پونچھ میں دوپٹے کا استعمال اچھی طرح سے جاری رہا۔

دونوں کمرے اچھی طرح سے چمک گئے۔ کچھ سیٹنگ کو اپنے مزاج کے مطابق کر دیا تھا۔ باتھ روم دھو کر نکلی تو اس کی نگاہ پھولوں پر پڑی۔ روم اسپرے کرنے کے بعد وہ پھول لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی، اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ وہ بری طرح تھک گئی۔ پھولوں کو گلدانوں میں ترتیب سے سجانے لگی۔ کام کر کے اسے روحانی مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ سب کچھ بھول گئی تھی کہ وہ کہاں ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ وہ بالکل مگن بیٹھی تھی، کہ وہاج حسن کمرے میں داخل ہوئے سامنے ہی پہلی نگاہ اس پر پڑی۔

اسے دیکھ کر وہ چکرا ہی تو گئے۔ کپڑے میلے چیکٹ دوپٹے پر جا بجا گندگی کے دھبے۔ بالوں میں دھول مٹی اٹی تھی، جیسے گھر کی صفائی اس نے ہی کی ہو۔

''یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' انہوں نے تلخی اور ناگواری سے پوچھا۔ یک بیک اس کے ہاتھ رک گئے۔ تیکھے چتون سے انہیں دیکھا۔ صبح والی بات وہ بھول گئی تھی۔ یک بیک یاد آ گئی۔ بے خوف و خطر لہجے میں بولی۔

''آپ کو مطلب؟'' اس کی ڈھٹائی و لا پروائی پر وہ گنگ رہ گئے۔ بھلا دو دن میں ہی اس نے خود کو کیا سمجھ لیا ہے۔

''مجھے مطلب نہیں تو پھر کسے مطلب ہوگا۔'' ان کے انداز پر وہ سلگ گئی۔ رکھائی سے بولی۔

حسن جاہ! میں آپ کی بیوی نہیں ہوں، جو تیار ہو کر آپ کے انتظار میں بیٹھوں۔'' انداز میں بدلے کی آنچ تھی۔

''خوب۔ بہت خوب۔'' انہوں نے خوش ہو کر ہلکی سی داد دینے والی تالی بجائی۔ ایک ایک قدم اٹھاتے اس کی طرف بڑھے۔ ''تو گویا جلد تسلیم کر لیا آپ نے، ویری گڈ۔''

''تو بات سنو ماہم جاہ!۔ بیویاں تو اس روپ میں بھی بہت اپیل کرتی ہیں۔ بے حد معصوم اور حسین لگتی ہیں۔ تیاری اور تکلفات کی ضرورت تم جیسیوں کے لیے ہوتی ہے۔ جو اپنی اداؤں سے ہمارا استقبال کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔''

''میں کہتی ہوں یہ ناپاک لفظ اگر میرے لیے آئندہ استعمال کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ پھنکاری۔

''کیوں، سچ بہت کڑوا لگا۔''

''وہاج حسن'' اس نے گلدان پھینک مارا۔

امید تھی سر پر لگے گا۔ وہ پھرتی سے نیچے ہوئے گلدان سامنے کی کھڑکی پر لگا نتیجتاً شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

آواز پر تمام گھر والے سراسیمہ ہو گئے۔

''میں یہی چاہتا ہوں کہ تمہارے پاگل پن کے مظاہرے چلتے ہی رہیں۔ تا کہ مجھ پر کوئی آنچ نہ آ سکے۔''

وہ خباثت سے مسکرائے۔ تو وہ بے بس ہو گئی وہ ایسا چاہتی نہیں تھی، مگر ہو جاتا تھا۔

وہ خود کو نارمل ثابت کرنا چاہتی تھی، وہ اسے پاگل بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اس نے بے چارگی سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جو اس کے پاگل پن کا عملی ثبوت پیش کر رہا تھا۔

''فوراً اپنا حلیہ تبدیل کر کے آؤ'' انہوں نے بڑے تحکم سے کہتے ہوئے کوٹ اتار کر بیڈ پر ڈالا۔ ان کے حکم پر وہ جل بجھ کر راکھ ہوگئی۔ جیسے اس کی کوئی عزت ہی نہیں۔ وہ بڑے بڑوں کو گھاس نہیں ڈالتی تھی اور انہوں نے اسے اتنا ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے کڑوی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں خود کو۔ جب چاہیں گے استعمال کر لیں گے۔ میں اتنی معمولی نہیں ہوں۔''

وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں جانے لگی۔ تو انہوں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''باتھ روم ادھر ہے۔'' سختی سے ادھر دھکیلا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' وہ اکڑ کر بولی۔

اسے اپنا میلا ہونا بڑا غنیمت نظر آ رہا تھا، اس کمرے کے لاک کی طرح جسے وہ تالا لگا کر سوتی تھی۔

اسے تو آج ہی معلوم ہوا تھا کہ گندگی ان کی نفیس طبیعت پر کتنی گراں گزرتی ہے۔

''تو پھر؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''میں تھکی ہوئی ہوں، اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ ہٹیلے پن سے بولی۔

''چچ چچ۔ پھر بیویوں والے عذر۔ گھر میں ملازمین کی کمی نہیں تھی آپ نے ناحق تکلیف کی ان حرکتوں سے آپ بیوی تو نہیں بن جائیں گی ماہم!''

اتنی بے وقعتی، اتنی تذلیل، اس نے کھا جانے والی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

پھر ڈٹ کر بولی۔ ''نہیں بدلتی میں اپنا حلیہ آپ کو کیا تکلیف ہے۔''

''ٹھیک ہے، یوں تو یونہی سہی۔ مجھے تو یوں بھی اچھی لگ رہی ہیں۔''

ان لفظوں پر جیسے وہ بپھر گئی۔

''کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے خود کو کہ زندگی اس طرح گزرے گی۔ میں خاموش رہوں گی۔ یہ بھول ہے۔ میں پاگل ہوں ناں۔ سب کچھ کر سکتی ہوں۔ خود کو بھی ختم کر لوں گی، اور آپ کو بھی۔

کوئی حساب لینے والا نہیں ہوگا'' اس نے پوری قوت سے ان کے بازوؤں میں دانت گاڑ دیے۔ وہ بلبلا کر رہ گئے۔ جیسے ہی گرفت ڈھیلی پڑی۔ وہ پھرتی سے بھاگی۔ لیکن قدموں میں میز آ جانے کی وجہ سے وہ لڑکھڑا گئی۔ اتنے میں وہ سنبھل چکے تھے۔

لیکن اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کھڑکی کا نوکیلا شیشہ اٹھا لیا۔ کوئی بھی نوکیلا شیشہ اسے اس زندگی سے آزاد کر سکتا تھا۔

شیشہ اتنا تیز اور باریک تھا کہ اس کی ہتھیلی میں کسی جانب سے گھس کر زخمی کر گیا۔ ابھی تو اس نے ہاتھ میں ہی اٹھایا تھا۔ ارادہ کلائی کاٹنے کا تھا یا پیٹ میں گھسانے کا، لیکن انہوں نے لپک کر دونوں ہاتھ سختی سے پکڑ لیے۔

ان کے ہاتھوں کی سختی یا خوف، یا دن بھر کی تکاوٹ، کچھ تو تھا جو اسے اپنی نبضیں بند ہوتی محسوس ہوئیں۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ بے ہوش ہو کر ان کے بازوؤں میں آ گئی۔

اس کو ہوش آیا تو گھر کا گھر اس کے کمرے میں موجود تھا، سوائے اس درندے کے، دوا کے ساتھ ڈاکٹر اس کے زخم کی پٹی کر کے جا چکا تھا۔ فراج امی کو یقین دلا رہا تھا کہ معمولی زخم ہے، جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں بلقیس اس کے سرہانے بیٹھی تھیں بہت فکر مند اور اضمحلال کا شکار نظر آ رہی تھیں، ان کے بیٹے کے لیے لڑکیوں کی کمی تو نہیں تھی۔ پھر بھی انہوں نے پاگل لڑکی کو ہی کیوں گلے کا ہار بنا لیا تھا۔ اور وہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں، لیکن اس محبت پر اپنے بیٹے کو قربان کیوں کیا۔

انہیں پچھتاوا ہونے لگا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔ تو اس پر نگاہ پڑی وہ بے آواز رو رہی تھی۔ ”آخر میں مر کیوں نہیں گئی۔“ انہوں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے آنسو گالوں سے بہتے چلے جا رہے تھے۔

سارے پچھتاوے اور قربانیاں بھول کر بلقیس نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ روتی رہی۔

”تائی جان! میں پاگل نہیں ہوں۔“ اس نے سسک کر بیان دیا۔ اتنی بے چارگی سے وہ یقین دلا رہی تھی کہ کچھ حد نہیں۔

”بالکل میں بھی یہی کہتا ہوں کہ آپ پاگل ہرگز نہیں ہیں۔“ فراج نے اپنائیت سے ڈپٹ کر کہا۔ پھر اسی انداز میں پوچھا۔

”مگر وہاج بھائی بتا رہے تھے کہ شیشہ ٹوٹنے کی آواز پر جب وہ باتھ روم سے نکلے تو آپ شیشہ کھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آخر کیوں؟“

”وہاج حسن کے اس خود ساختہ بیان پر وہ گنگ رہ گئی۔

”امی۔ امی۔ یہ بھائی کی شرٹ پر سے خون کے نشانات ہٹ نہیں رہے کیا کروں۔“ اتنا رگڑا ہے میں نے۔“ جویریہ کمرے میں داخل ہوئی تو بات ادھوری رہ گئی۔

اس نے دیکھا شرٹ کا دامن سرخ ہو رہا تھا۔ اتنا خون بہہ گیا تھا اس کا۔ مگر کیا فائدہ ہوا۔

”تم سے آج تک کچھ ہوا ہے جو آج یہ کام ہوگا۔“ فراج کی توجہ جویریہ پر چلی گئی۔

”تذلیل کے داغ بنا حساب کے صاف نہیں ہوتے۔“ اس کا رواں رواں چلایا مگر بے آواز بولنا اب کب آسان رہا تھا۔

خوف کی شب میں ہونٹ سینے سے
مرنا بہتر ہے ایسے جینے سے!
یوں تماشا تو اس کو ہونا تھا

جو گری آرزو کے زینے سے
یہی زندگی ہے اس کی۔

اتنی بے بس و مجبور زندگی۔ وہ یہ سب کچھ کب تک سہے گی، اور کیوں، کب وہ اس گناہ کی دلدل سے نکلے گی۔ کوئی تو کل ہوگی اس بات کی، کوئی تو راہ ہوگی۔

کاش، کاش میں نے اپنے کھیل میں کسی کو شامل کر لیا ہوتا۔ قمر کو ہی۔ کم از کم۔ آج وہ شہادت تو دے دیتی کہ میں پاگل نہیں ہوں۔

ہارون کو ہی بتا دیتی۔ وہ خفا ہوتا مگر ساتھ تو دیتا۔ اب بتا کر کیا ملے گا۔ سوائے ندامت کے، ندامت کے آنسو صاف ہو جائیں گے۔ گناہ کے داغ کس طرح چلیں گے۔ سوائے موت کے کوئی بھی راستہ نہیں۔

''اب آپ کے ہاتھ کا زخم کیسا ہے۔'' فراج نے اسے خاموش بیٹھا دیکھ کر پوچھا۔

''اچھا ہے'' وہ مختصراً بولی۔

''اچھا ہے۔ واقعی وہاج بھائی بہت اچھا ہے، بلکہ بہت اچھے ہیں۔'' جویریہ نے ایک لفظ اچک کر فوراً جملہ بنا ڈالا۔

''خاک اچھے ہیں، جس دن چوٹ لگی، اسی دن تو کشمیر چلے گئے تھے۔''

فراج نے جل کر کہا۔

''اصل وجہ تو یہ ہے کہ تمہیں جو ساتھ لے گئے تھے۔'' سمیعہ نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''میرا کیا ہے۔ میں تو ہفتے میں ہی آ گیا واپس، انہیں دیکھو ذرا خیال نہیں یہاں کوئی اداس، ملول ان کے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔ بلکہ بیٹھی ہوگی۔'' فراج شرارت سے بولی۔

''ذرا بھی تو خیال نہیں۔'' جویریہ نے زور دے کر کہا۔

''وہ میرے لگتے ہی کیا ہیں۔'' اس نے اکتا کر کہا اور بے زاری سے رخ موڑ لیا۔ تینوں بہن بھائی ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر رہ گئے۔

''اب ایسا بھی نہ کہیے۔ روزانہ تو آپ کی خیریت دریافت کرتے ہیں فون پر۔''

''فراج یک بیک بھائی کی طرف ہو گیا۔

''اسلیے یہ الزام تو مانا نہیں جائے گا کہ انہیں آپکا خیال نہیں۔ البتہ ناراضگی پہنچا دی جائے گی۔'' وہ ہنسا تو ماہم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

بڑے سبھاؤ سے آتا ہے قتل کرنا تمہیں
دستار بلند رکھتے ہو، دامن تر رکھتے ہو
نرم نگاہوں سے رکھتے ہو نشانے پہ نظر
خنجر چھپانے کا ہنر رکھتے ہو

کاش ۔کاش وہاج حسن! آپ میرے شوہر نہ بنتے ۔کم از کم لوگ میری بات کا یقین تو کر لیتے ،کہ ہاں میں سچ کہہ رہی ہوں ۔کیسی قید میں ڈالا ہے آپ نے مجھے ۔آپ کی ذات کی فصیلیں اتنی بلند ہیں، سر اٹھاتی ہوں تو چکرا کر گر جاتی ہوں ۔چیختی ہوں تو لوگوں تک آواز نہیں جاتی ۔سب اس بلندی کو سلام کرتے ہیں ۔مگر کوئی نہیں جانتا کہ اس کے حصار میں کیا کچھ ہو رہا ہے ۔کس طرح دکھاؤں لوگوں کو آپ کا باطن، کس طرح ،نہ کوئی روزن ہے نہ کوئی دروازہ، نہ کوئی جھروکا ۔کیسے نکلوں، کہ صرف میرا ہی نقصان ہو اور کسی کا نہیں ۔ذلت کی زندگی کے بعد عزت کی موت نصیب ہو ۔کسی پہ کچھ بھی آشکار نہ ہو کیسے ممکن ہے ۔

وہ سب لوگ امی کے کمرے میں بیٹھے تھے ۔کہ وہاج حسن کمرے میں داخل ہوئے ۔

سلام کیا، پھر حسب عادت سر جھکا کر امی سے سر پر ہاتھ پھروایا ۔

''جیتے رہو ۔فراج کو کیوں بھیج دیا تھا، تمہارے بابا اتنے پریشان ہو رہے تھے ۔'' امی نے انہیں اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا ۔

''بس ضرورت ہی نہیں تھی ۔'' انہوں نے جھک کر جوتے اتارتے ہوئے سادگی سے کہا ۔

فراج کی جان میں جان آگئی ۔''مجھے پتا ہے، یہ خود ہی آیا تھا ۔تیری تو عادت ہی ایسی ہے کبھی جو اس کی غلطی پر سختی کی ۔یا شکایت کی ہو ۔'' امی نے پیار سے جھڑکا ۔وہ بس مسکرا دیے ۔

''جویریا بیٹا! ایک کپ چائے کی شدید ضرورت ہے ۔اگر مل جائے تو ۔''

''ابھی لائی بھائی ۔'' جویریہ جھٹ اٹھ گئی ۔

''میں تیرے لیے کھانا گرم کرتی ہوں، تو اتنے میں ہاتھ دھو لے ۔'' امی بھی اٹھ کر چلی گئیں ۔

''سمیعہ ۔! اپنی بھابھی کے ساتھ مل کر پیکنگ کرا دینا ۔کل صبح کی فلائیٹ سے اسلام آباد جا رہے ہیں ۔پھر اسلام آباد سے مری، سوات وغیرہ ۔''

''ونڈر فل ۔تو گویا ہنی مون کے ٹکٹ ساتھ آئے ہیں ۔'' فراج شرارت سے بولا ۔

''یس ۔'' وہ مسکرا کر جیکٹ کی جیب سے کچھ نکالنے لگے ۔

وہ ایک دم چونکی ۔جیسے اسے کرنٹ سا لگا ہو ۔اسے لگا جیسے وہ تھانے سے سینٹرل جیل میں لے جائی جا رہی ہو ۔

''بھائی صبح ۔؟'' سمیعہ اچنبھے سے بولی ۔''آٹھ بج رہے ہیں، کس طرح پیکنگ ہوگی ۔''

''میرا خیال ہے دو گھنٹے میں پیکنگ ہو سکتی ہے اگر کوشش کرو تو ۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا ۔اور کاغذوں میں سے مطلوبہ چیز کی تلاش جاری رکھی ۔

''اور اگر دو بندے مل کر کریں، تو ایک گھنٹے میں بھی ہو سکتی ہے ۔'' فراج نے لقمہ دیا ۔

اشارہ ماہم کی طرف تھا ۔''بالکل'' وہ خوش دلی سے بولے ۔ان کا موڈ بہت خوشگوار معلوم ہو رہا تھا ۔

''چلیں جی۔کام شروع کر دیں۔''

سمیعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں نہیں جا رہی، کہیں۔'' وہ کٹھور، سپاٹ لہجے میں بولی۔ سب چپ ہو گئے۔

وہاج اسی انداز میں کسی کارڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔

بھلا ایک نارمل لڑکی اس طرح کہہ سکتی تھی، پھر شوہر اتنے عرصے بعد دیارِ غیر سے آیا تھا، نہ اس کی غیر موجودگی میں اس کا تذکرہ کیا تھا، نہ ہی ان کی آمد پر کسی بھی خوشی یا کسی بھی احساس کا تاثر تھا۔ جیسے وہ ماحول یا لوگوں سے بیگانہ ہو۔

''کہیں نہیں بھیج رہے ہم تمہیں۔ بس ہنی مون پر بھیج رہے ہیں۔'' سمیعہ نے مسکرا کر ماحول کی تلخی ختم کی۔

بڑی انوکھی بات ہے، وہ سلگ کر رہ گئی۔ کیا وہ نہیں سمجھ سکتی یہ بات۔

''جا چکی ہوں میں کئی دفعہ۔'' اس کا مطلب تھا مری سوات، شمالی علاقہ جات، سب اس کے دیکھے ہوئے تھے۔

لیکن اس کی بات پر فراج کو ہنسی آ گئی۔

حالانکہ وہ لوگ کوشش کرتے تھے، کہ اس کی کسی بھی بات پہ نہ ہنسیں، نہ برا منائیں۔ مگر فراج اپنی فطرت کے آگے لاچار تھا۔

'ہنی مون پر آپ کئی دفعہ جا چکی ہیں؟ سمیعہ نے فراج کو گھورا۔ مگر وہ ہنس رہا تھا۔

وہاج کمرے سے نکل گئے۔ ایسا مصروف انداز تھا جیسے وہ ان کی باتیں سن ہی نہ رہے ہوں، فراج کی ہنسی پر وہ اشتعال سے چلائی۔

''کیا تم لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہو؟''

''سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ سب مجھ پر ہنستے ہیں۔'' کہتے کہتے اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کتنی تلخ ہو گئی تھی وہ۔ حالانکہ یہ اسکی فطرت تو نہیں تھی۔ اسے بعض اوقات تو خود محسوس ہونے لگتا کہ وہ پاگل نہیں تو نفسیاتی مریضہ ضرور بن جائے گی۔ اگر یہی حالات بدستور رہے تو۔

تائی جان نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''کیا ہوا ہے سمیعہ؟'' انہوں نے سمیعہ سے پوچھا۔ سمیعہ نے ساری بات بتا دی۔ انہوں نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ اور خوب صلواتیں سنائیں۔ پھر اسے چمکارتے ہوئے بولیں۔

''کیوں انکار کر رہی ہو تم۔ تمہیں جانا چاہیے۔ تمہاری صحت کے لیے بھی اچھا ہے، پھر یہی تو دن ہوتے ہیں، سیر و تفریح کے۔ اور وہ تو خود ایسا ہی بدھو ہے، اسے کب ہوش رہتا ہے ان باتوں کا۔ سوائے کاروبار کے۔ اسے آتا ہی کیا ہے۔ یہ تو فون پر تمہارے بڑے بابا نے ہی کہا تھا کہ وہ آتے ہی تمہیں گھمانے پھرانے لے جائیں۔ صد شکر کہ اس نے سن لیا۔ اور اگر تمہارا وہاں جانے کا دل نہیں چاہ رہا، تو پھر کہیں اور چلے جاؤ۔''

امی اسے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کے کمرے سے نکل جانے کے بعد فراج امی کے قریب کھسک آیا۔

''یقین کریں امی! اگر میں ہوتا ناں بھائی کی جگہ تو اب تک خودکشی کر چکا ہوتا۔ یا وحشت کتنے سکون سے وہ اس لڑکی کو برداشت کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی صرف آپ لوگوں کی وجہ سے۔''

فراج کو یکا یک بھائی سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔

''بکو نہیں۔ ماہم میری ہی بیٹی ہے۔ کوئی غیر نہیں دیکھنا ایک روز بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور خدانخواستہ وہ بالکل پاگل تو نہیں ہے۔''

''جی ہاں۔ وہ بالکل پاگل نہیں ہیں۔ لیکن ایک روز ہم سب پاگل ہو جائیں گے۔'' فراج نے خوف سے آنکھیں پھیلائیں۔ ''ویسے بھائی کے صبر کی داد دیتا ہوں۔''

''سچ امی! کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے جب بھائی اور بھابی کمرے میں ہوں تو کیمرہ لگا کر اسکرین پہ انہیں دیکھوں۔ خدا کی قسم سمجھ میں نہیں آتا بھائی ہیں کیا۔ کس طرح بھابی سے بات کرتے ہوں گے۔ باہر بھی ان ڈائریکٹ گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی بھی ڈائریکٹ نہیں بولتے۔ مجھے تو بڑا تجسس ہوتا ہے ان کی زندگی کے بارے میں، سوچتا تھا جب ان کی شادی ہو گی تو بھابی سے بھائی کے متعلق پوچھا کروں گا۔ کہ رومانس کرتے ہوئے بھائی کیسے لگتے ہیں۔ مگر بھابی ہی ایسی آئی ہے کہ۔ بس۔''

''بے شرم تجھے شرم نہیں آتی۔ ایسی باتیں سوچتے اور کرتے ہوئے۔'' امی نے جھینپ کر اسے دھموکا جڑا۔

''کوئی بات نہیں امی۔ لگوا دیجیے کیمرہ کل ان صاحب کی بھی تو شادی ہو گی۔ ہم بھی پورے محلے کے ہمراہ انہیں اسکرین پر دیکھا کریں گے۔''

وہاج کے اچانک آن ٹپکنے پر، فراج اچھل کر رہ گیا اور گدی کھجاتے ہوئے ان کے سامنے سے گزر کر چلا گیا۔

''سمیعہ! تم جاؤ، میں پیکنگ خود کر لوں گی۔'' اس نے سمیعہ کو پیار سے منع کیا۔

اچانک ہی کتنا بدل جاتی تھی وہ۔ سمیعہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا پھر مسکرا کے باہر نکل آئی۔

تھوڑی دیر میں وہاج حسن کمرے میں آئے تو وہ اضطراری کیفیت میں ٹہل رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر کہنے لگی۔

''آپ جو کر رہے ہیں، ٹھیک نہیں کر رہے ہیں۔''

''تو پھر آپ ہی بتا دیجیے کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط ہے؟'' دوسری طرف اطمینان ہی اطمینان تھا۔

''دیکھیے وہاج! آپ کو معلوم ہے اور صرف آپ ہی جانتے ہیں کہ میں پاگل نہیں ہوں۔'' وہ مصالحت پر اتر آئی۔

''میرے جاننے سے کیا ہوتا ہے۔ ہر شخص ڈاکٹر کے اس سرٹیفکیٹ پر ایمان لایا ہوا ہے جس میں تم پاگل ہو۔ سو، میں بھی انہی لوگوں میں شامل ہوں۔''

''دیکھو۔ میں کہہ دیتی ہوں۔ میں ہرگز ہرگز تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔ کان کھول کر سن لو۔'' وہ آپے سے باہر ہونے لگی۔

''اس لیے کہ آپ اس سے پہلے دس بار ہنی مون منا کر آ چکی ہیں۔'' وہ بالوں میں برش پھیرتے ہوئے بولے۔

''مگر میرا تو پہلا ہنی مون ہے اس لیے، آپ کو مجبوراً میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' مسکرا کر کہا گیا۔

''دیکھو۔ میں کہہ رہی ہوں۔ اس قسم کی گفتگو کر کے مجھے مشتعل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ نہ تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔ اور نہ میرے سمجھے تم۔''

''تم تو اس طرح مشتعل ہو رہی ہو۔ جیسے۔''

جن نگاہوں سے انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔ وہ خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

ہاں کچھ بھی نہیں تھا اس کے پاس بچانے کے لیے۔

انہوں نے ایک دم سے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔

پھر فوراً ہی ڈریسنگ روم میں لباس تبدیل کرنے چلے گئے۔

وہ سن سی کھڑی رہی۔

انہوں نے کہا تھا وہ چاہے بھی تو ان سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتی اور وہی کر رہے تھے اسے چاروں طرف سے مشکل میں ڈال دیا تھا۔

صرف موت ہی یہ فیصلہ کر سکتی ہے ہاں۔ صرف موت۔ ہو سکتا ہے باہر جانے سے موت کا راستہ آسان ہو جائے ہاں یقیناً بہت سے مواقع مل سکتے ہیں۔

کسی گاڑی کے نیچے آ کر کسی کھائی میں چھلانگ لگا کر ہوٹل کی چھت سے کود کر۔ کچھ خرید کر، کچھ کھا کر۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ کب تک اپنی پامالی کا ماتم کروں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ زہر کا ایک قطرہ کھاؤ یا پوری شیشی موت تو دونوں ہی صورتوں میں واقع ہو جاتی ہے۔ اب زہر سے نہیں ڈرنا بلکہ زندگی کا آخری فیصلہ کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

وہاج حسن ڈرائنگ روم سے نکلے تو اسے انہماک سے پیکنگ کرتے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

''اب تو مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم یقیناً پاگل ہو۔''

وہ اس کے پیچھے آ کر سرگوشی میں بولے تو وہ اچھل پڑی۔ دل پورے وجود میں دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ وہ بالکل اس کے پیچھے ہی کھڑے تھے۔

''سچ سچ بتاؤ۔ تم پاگل ہو یا ٹھیک ہو؟''

''ان کی آواز میں سرمستی اور انداز بہکنے کے لیے تیار تھے اس کے کانوں کی لویں تک سرخ ہو گئیں۔

رخساروں کی تپش فضا کو جھلسانے لگی تھی۔

سانسیں بے ہنگم ہونے لگی تھیں۔ اس سے قبل ایسا خوف ایسی وحشت، ایسی ہچکچاہٹ کسی سے محسوس ہی نہ کی تھی۔ وہ ان چیزوں کی خواہش مند تھی وہ اس کیفیت کو محبت کہتی تھی۔ مگر آج یوں لگ رہا تھا وہاج حسن دو لمحے بھی اس کے پاس کھڑے رہے تو وہ پانی کی طرح بہہ جائے گی۔ یہ محبت نہیں تھی۔ کمزوری تھی۔ آج سے قبل وہ کب اتنی پسپا ہوئی تھی۔ وہ تو محفوظ تھی اپنی انا کے حصار میں۔

اس نے خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش وہاج حسن کو واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی۔

''تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟'' انہوں نے اس کے شانے پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

اس نے بمشکل تمام تھوک نگلا ان کے سامنے وہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے بے حد کمزور محسوس کر رہی تھی۔ سانس کھینچ کر آہستگی سے بولی۔

''آپ سو جائیے۔ مجھے کام کرنے دیجیے۔'' اس نے بغیر سوچ سمجھے کہا تھا۔

''آں۔ ہاں۔ بیویوں والے جملے نہیں چلیں گے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ وہ تڑپ کر ان کے حصار سے نکلی۔

''کتنی بیویاں رکھی ہیں آپ نے بیویاں کیا کرتی ہیں اور کیا نہیں۔ معلوم ہے آپ کو؟''

وہ ڈٹ کر ان کے سامنے کھڑی تھی۔ مگر آواز بے حد پست آنکھیں اشکبار تھیں۔

''ہاں مجھے معلوم ہے میں آپ کی بیوی نہیں ہوں گالی ہوں۔ یہ گالی۔ مجھے ایک بار ہی سرعام دے کر معاف کر دیجیے۔ معاف کر دیجیے مجھے۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی ہم نے زندگی کس طرح گزاری تھی۔ آپ کی عزت کا علم نہیں گرے گا نہیں گرنے دوں گی میں مگر مجھے بار بار اپنی نظروں سے نہ گرائیے۔ خود اپنی ہی نظروں سے۔'' اس نے رو کر التجا کی۔

وہ اسے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''سنو ماہم جاہ جب کوئی مرد درندہ بن رہا ہوتا ہے ناں۔ تو روتی فریاد کرتی عورتیں اسے بہت اپیل کرتی ہیں۔ اس لیے اپنی اداؤں پہ کنٹرول رکھا کرو۔''

وہ کہہ کر اتنی تیزی سے مڑے کہ اس کے حواس تک جھنجھنا اٹھے تھے۔ کچھ سمجھ آیا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز ٹی وی آن کر کے لیٹ گئے۔

وہ حواس باختہ سی کام میں مصروف ہو گئی۔ جب وہ مکمل طور پر کام سے فارغ ہوئی تو رات کے دو بج رہے تھے۔

وہاج سو چکے تھے۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ ریموٹ کنٹرول ان کے سینے پہ رکھا تھا۔ ساری لائٹیں آن تھیں۔ وہ ریموٹ کنٹرول اٹھانے کے لیے جھکی۔ پھر ہاتھ رک گئے۔ اک انجانی سی کشش کے تحت وہ انہیں دیکھتی رہی۔

یہ راکھ راکھ رتیں اپنی رات کی قسمت

تم اپنی نیند بچھاؤ، تم اپنے خواب چنو

بکھرتی ڈوبتی نبضوں پہ دھیان کیا دینا

تم اپنے دل میں دھڑکتے ہوئے حروف سنو

اس کی نگاہیں ہیں ان پر سے پلٹنا بھول گئیں اور یہی ایک لمحہ اس کی تمام زندگی کا حاصل ٹھہر گیا۔ وہ جو جواب جاگتے مردوں سے لینا چاہتی تھی جس جواب میں وہ رسوا ہو کر رہ گئی تھی۔ اس مقام تک آن پہنچی تھی۔

ایک سویا ہوا مرد خاموشی سے دے رہا تھا۔ اسے خود بھی اپنی اس کیفیت پر اختیار نہیں تھا۔ وہ جھنجھلا کر رہ گئی۔

میں اپنے ہی ہاتھوں اپنے دل کا گلا دبا دوں گی

میرے خلاف یہی سازشوں میں رہتا ہے

اس نے بری طرح اپنے آپ کو روکیا۔ ملامت کیا۔ لیکن تقدیر کے قرطاس پر محبت کا وجدان اسی لمحے اسی شخص سے لکھا تھا۔

ایک عجیب ناقابل فہم کشش کے تحت اس کا دل ان کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

کیا یہ تھا وہ شخص جس کی اسے تلاش تھی۔

نہیں۔ یہ محبت نہیں تھی۔ سمجھوتا تھا۔ سودا تھا۔ بے بسی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو جھٹلایا۔ اور کئی بار۔ مگر دل۔ دل گواہی دے رہا تھا۔

ہزاروں حادثے تجھ پر قیامت بن کر ٹوٹے ہیں

تو اس پر بھی سلامت ہے، دل خوش فہم کیا کہنا!

اس نے......آنکھوں سے اشک صاف کیے اور تھکے ماندے سے انداز میں اپنے کمرے میں آ گئی۔

عشق میں بکھرنے تک

حوصلہ نہ ہاری میں

مگر اب تمام حوصلے پست ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

صبح بڑی چمکیلی اور نکھری نکھری تھی۔ لیکن وہ سر سے لے کر پاؤں تک بجھی بجھی لگ رہی تھی۔ حقیقی معنوں میں تو وہ اب لٹی تھی۔ دل روح سب کچھ ویران اور خالی تھا۔

گھر والوں سے مل کر وہ رخصت ہوئے فراج سمیعہ اور جویریہ انہیں ایئر پورٹ تک چھوڑنے آئے تھے۔ فلائٹ وقت پر پرواز کر گئی۔

سارے راستے وہ بالکل خاموش تھی۔ بالکل ایسی ہی خاموشی ایسا ہی سناٹا جیسے تختہ دار پر چڑھتے وقت کسی بھی شخص کی روح میں حلول کر جاتا ہے پھر کوئی بھی خواہش، کوئی بھی احساس زندگی کے زیر اثر نہیں ہوتا۔

جہاز لینڈ کرنے والا تھا۔ تمام مسافر اپنی بیلٹ باندھ چکے تھے اور وہ ایسے ہی بیٹھی تھی۔

''ایکسکیوزمی۔ آپ اپنی بیلٹ باندھ لیجیے۔'' ایئر ہوسٹس کے کہنے پر اس نے نہیں سنا۔ وہاج کی آنکھوں کے آگے میگزین لگا تھا، انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا وہ زمین پر کسی نادیدہ نقطے کو مسلسل گھورتی معلوم ہو رہی تھی۔

''ماہم۔'' انہوں نے قریب ہو کر پکارا۔ اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ جیسے اچانک پکارے جانے پر ڈر گئی ہو آنکھیں سرخ تھیں۔ پلکوں پہ آنسوؤں کی نمی تھی۔

''بیلٹ باندھ لیجیے۔'' انہوں نے اسی انداز میں کہا اور میگزین نگاہوں کے سامنے کر لیا۔ محبت کی وجدان نے اسے اور بھی بے چین، ہراساں اور بزدل کر کے رکھ دیا۔ خاموشی سے بیلٹ باندھ لی۔

دل یہ کہتا ہے ضبط لازم ہے
ہجر کے دن کی دھوپ ڈھلنے تک
اعتراف شکست کیا کرنا
فیصلے کی گھڑی بدلنے تک

☆ ☆ ☆

اسلام آباد میں انہوں نے ایک روز کے لیے کمرہ لیا۔ پھر شام کو ہی مری روانہ ہو گئے۔ موسم کافی ٹھنڈا تھا برف باری عروج پر تھی۔

موسم نے اثر دکھایا اور اسے کھانسی، فلوز کام نے آن جکڑا۔ مری آنے تک اس کا برا حشر ہو چکا تھا۔ طبیعت عجیب گری گری سی محسوس ہو رہی تھی۔

کمرے میں آ کر اسے خوشگوار حیرت کا احساس ہوا۔ تشکر سے ان کی جانب دیکھا۔

وہ سامان رکھ کر پلٹے پھر کہنے لگے۔

''دو بیڈ میں نے اس لیے لیے ہیں کہ تمہیں زکام اور کھانسی ہے اور میں بڑی حساس طبیعت کا مالک شخص ہوں۔ ویسے بھی ان کے اثرات جلد ایک دوسرے پر پڑتے ہیں۔''

ان کی بات پر اس نے تکلیف سے ان کی جانب دیکھا'' اس لحاظ سے تو آپ کو دو کمرے لینے چاہیے تھے۔ وہاج حسن! اتنی سطحی سوچ ہے آپ کی انتہائی خود پسند اور مطلب پرست، ہوس پرست شخص ہیں آپ۔ یہ تلاش تھی میری۔ نہیں۔ تو پھر یہاں آ کر ختم کیوں ہو گئی۔ اس لیے کہ

اب کوئی راہ باقی نہیں چھوڑی آپ نے چلنے کے لیے، آنکھوں میں پانی آ گیا اس کی آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں اب تو ان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ کوئی بھی جواب نہیں دیا۔ بیماری کو غنیمت جان کر بستر میں پڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

پڑتے ہی اسے ہوش نہ رہا۔ صبح اسے تیز بخار تھا۔ وہاج حسن کے پکارے جانے پر وہ اٹھی اور نیم دراز ہو کر بیٹھ گئی۔

''ناشتا کر لو۔ رات بھی تم نے کچھ نہیں کھایا تھا پھر یہ دوا لے لینا'' انہوں نے دوا میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

اسے خواہ مخواہ اپنائیت کا احساس ہوا، بیماری میں انسان بے وجہ حساس ہو جاتا ہے اور پھر اس کی کیفیت تو عجیب ہو رہی تھی۔ بات بات پر رونا آنے لگا تھا۔ دل بالکل خالی ہو کر رہ گیا تھا۔

کاش وہاج حسن اس وقت آپ میرے شوہر ہوتے زندگی اسی ترتیب سے چل رہی ہوتی۔ کتنا اچھا لگتا ہے مجھے یہ سب کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہم پھر سے ایک ہو جائیں۔

اپنی ہی سوچ پر وہ خود پشیمان ہو گئی۔

''دوا لے لو۔ ہو سکتا ہے بخار کے ساتھ غصہ بھی اتر جائے۔'' کس احساس کے تحت وہ اسے دوا پلا رہے تھے۔ اس کے دل میں بے وجہ خوش گمانی نے جگہ لی۔ کیسی خوش گمانی تھی یہ حالانکہ سامنے تو سوائے اندھیرے کے کچھ بھی نہ تھا۔ بلکہ نقصان ہی نقصان تھا۔

''آپ کو اس سے کیا، میں جیوں یا مروں۔'' وہ رکھائی سے چہرا موڑتے ہوئے بولی۔

عورت بھی کیا شے ہے۔ مرد کی ذرا سی ہمدردی اور توجہ پر کتنی شانت ہو جاتی ہے اور مزید کی خواہش کرنے لگتی ہے۔ بے وجہ خوش فہم ہو جانے والی زندہ حقیقت عورت ہی تو ہے۔

''بات یہ ہے کہ میں ساری رات سو نہیں سکا۔'' وہ گھٹنوں پر زور دے کر کھڑے ہو گئے پھر اس کے لیے جگ سے پانی انڈیلا۔ احساس ندامت سے وہ کہنا چاہتی تھی مگر چپ رہی۔ وہ گلاس اور دوا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''تمہاری کھانسی نے مجھے بہت ڈسٹرب رکھا، اس لیے میں سو نہیں سکا۔''

''وہ اپنی جگہ پر کانپ کر رہ گئی، پورے وجود میں جیسے آگ سی بھر گئی۔ ان کا ہاتھ پوری قوت سے جھٹک دیا گلاس اور دوا دور جا گرے۔

''نہیں پینی مجھے دوا نہیں چاہیے مجھے کوئی ہمدردی۔ زہر لا دیجیے مجھے، گلا دبا دیجیے میرا ایک بار ہی کیوں نہیں مار دیتے کیا بگاڑا تھا میں نے آپ کا کیا کیا تھا آپ کے ساتھ۔''

اور پھر نڈھال سی ہو کر ایک طرف کو لڑھک گئی وہاج ڈاکٹر کو لے آئے۔ ڈاکٹر نے انجکشن دیا۔ دوا دی اور چلے گئے۔ شام تک اسے تقریباً ہوش آ گیا۔ وقت خاموشی سے سرکتا رہا۔

وہ بستر میں پڑی رہتی، وہاج ایسے ہی باہر گھوم پھر آئے۔ بخار بھی ختم ہو گیا تھا پھر نزلہ زکام کی شکایت بھی نہ رہی تھی مگر ہر وقت اعصاب پہ

تھکاوٹ کا گمان رہتا۔

دل کی عجیب حالت تھی۔ کبھی تیز تیز دھڑ کنا شروع ہو جاتا کبھی اتنا آہستہ کہ اس کی آنکھوں کے آگے تارے سے جھلملا جاتے کسی بھی چیز میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔

وہاج کا موڈ سخت آف تھا جب ہی مسلسل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج آٹھواں روز تھا۔ اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا یہاں۔ وہاج باہر سے آئے تو وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ پچھلے دنوں کی بہ نسبت قدرے کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ صد شکر تھا کہ اس نے آٹھ دن میں لباس فاخرہ تو اتارا تھا۔ وہاج نے تشکر بھرا سانس خارج کیا۔

وہ پیکنگ کر چکی تھی۔ انہیں دیکھ کر کہنے لگی۔

''ہم گھر کب چلیں گے؟'' انتہائی ملول پژمردہ سا انداز تھا۔

''فی الحال تو ارادہ نہیں ہے۔'' انہوں نے قطعی سے لہجے میں کہا سامان کی پیکنگ دیکھ کر ان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔ اسے اپنا دل......ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔

''حسن! مجھے گھر لے چلیے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' اس کی آواز بھیگتی چلی گئی۔

''کیا ہو رہا ہے۔ بظاہر تو کچھ نظر نہیں آ رہا'' انہوں نے سرسری نگاہ سرتا پا اس پر ڈالی۔

''عورتوں کو ویسے بھی عادت ہوتی ہے بیماری کے بہانے کرنے کی۔'' وہ ناگواری سے بولے۔

''حسن! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے۔ جیسے میرا دل کوئی کھینچ رہا ہو۔ مجھے پاپا کے پاس لے چلیے'' اس کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ آنسو گالوں پر لڑھک آئے تھے۔

ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا۔ انہوں نے چونک کر دیکھا اگر بروقت وہ آگے نہ بڑھتے تو وہ یقیناً زمین پر ڈھیر ہو جاتی۔

☆ ☆ ☆

تائی جان نے اسے دیکھتے ہی دل تھام لیا۔

''ارے ایسی پیلی رنگت ہو رہی ہے۔ کیا ہوا تمہیں۔'' انہوں نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا، اسے ان کی آغوش میں بڑا سکون ملا تھا۔'' اسے تو اب بھی بخار ہے۔'' وہاج کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''کسی ڈاکٹر کو دکھایا تھا کہ نہیں۔''

''دکھایا تھا۔ دوا بھی لی تھی۔ طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی تھی اس لیے جلد واپس آنا پڑا۔'' انہوں نے مختصراً بتایا اور کمرے میں چلے گئے۔

''حد ہو گئی لاپروائی کی بھی۔'' بلقیس کو بیٹے پر زندگی میں پہلی بار شدید غصہ آیا تھا۔

''لو بھلا ڈاکٹر کو بھی دکھایا؟ دوا بھی لی ہو گئے فارغ۔ بچی کا حال دیکھو کیا ہو رہا ہے۔

کب سے ہے تمہاری طبیعت خراب؟ انہوں نے اس سے آہستگی سے پوچھا۔

''جی۔'' وہ کچھ بھی نہیں۔ بلقیس مسکرا دیں۔

''اچھا یہ بتاؤ۔ وہ تمہیں کہیں اونچی نیچی جگہوں پر تو نہیں لے گیا تھا'' وہ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ بلقیس کو یکا یک اس کی کیفیت کا خیال آیا۔ تو اسے پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولیں۔

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ خدا تمہاری گود ہری کرے۔ کل میں تمہیں مہتاب کے ساتھ کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر چلوں گی۔ اب تم آرام کرو۔ اور ہاں کوئی سوچ نہیں لگانا ذہن سے۔ اللہ مالک ہے۔ سب کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔''

تائی جان کی بات پر اس کی اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں اس نے سراسیمگی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب بھی ہونا تھا اس کے تو وہم وگمان میں نہیں تھا۔ کیا ہوگا اب۔

وہ نڈھال سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ وہاج دوپہر کا کھانا کھا کر جو گئے تھے رات تک نہیں لوٹے۔

سمیعہ نے بتایا تھا کہ جرمنی سے پارٹی آئی ہوئی ہے بھائی گھر نہیں آئیں گے۔

اس پر ایک اور مصیبت آن پڑی۔ وہاج آجاتے تو وہ مسئلے کا حل تلاش کر لیتی۔ آج ہی فیصلہ ہو جاتا ان کی سوچ کیا ہے۔ وہ کیا چاہتے ہیں۔ کیا کرنا ہے۔ سارا مسئلہ حل ہو جاتا۔ مگر وہ نہیں آئے تو اس کی فکر مندی میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا۔ رات پریشانی اور اضطراب سے دعائیں مانگتے کٹی کہ خدایا ایسا نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اسے بہت بڑی قربانی دینا ہوگی اور ابھی تو یہ اس کا یک طرفہ فیصلہ تھا۔ جانے وہاج سن کر کیا کہیں اور کیا فیصلہ کریں۔

ناشتے کے بعد ہی مہتاب چچی آگئیں۔ اسے دیکھتے ہی ڈھیروں پیار کر ڈالا۔

''دیکھنا بھابی! بیٹا ہی ہوگا۔'' مہتاب چچی نے رازداری سے کہا تو بلقیس مسکرا دی۔

''اللہ دعائیں قبول کرے۔'' دونوں خواتین اسے لے کر گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر انجم ریاض کے پاس چلی گئیں۔

ڈاکٹر انجم سے مہتاب کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ بے تکلف سی فضا میں رسمی سی بات چیت ہوتی رہی پھر ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے کے لیے اندر لے گئیں۔ وہ بے حد خوفزدہ ہو رہی تھی۔

اسے لب کاٹتے دیکھ کر ڈاکٹر انجم نے اس کا گال تھپتھپایا۔ پھر مسکرا کر بولی۔

''آپ اتنا نروس کیوں ہو رہی ہیں۔ ٹیک ایزی۔'' ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ اتار کر رکھا۔

''اچھا یہ بتائیں۔ یہ جو خواتین باہر بیٹھی ہیں۔ آپ کی کیا لگتی ہیں۔'' اسے مسلسل خاموش دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''ایک میری ساس ہیں اور ایک چچی۔''

''اچھا تو پھر میں آپ کی ساس کو خوشخبری سناتی ہوں وہ دادی بننے والی ہیں۔''

حالانکہ اسے اس بات کا خدشہ تھا لیکن ڈاکٹر کے منہ سے سن کر لگا جیسے اچانک یہ خبر اس پر بم کی طرح پڑی ہو اس نے ہراساں ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو کاغذوں پر فرفر کچھ لکھ رہی تھیں۔ اس کی شکل سے لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی رو پڑے گی۔

''آپ بالکل خوفزدہ نہ ہوں۔ پریشانی کی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ میں آپ کی ساس کو بلاتی ہوں۔'' ڈاکٹر انجم نے انٹرکام اٹھایا تو وہ فوراً بولی۔

''سنیں ڈاکٹر۔'' وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

''آپ پلیز۔انہیں نہ بتائیں کہ میں ماں بننے والی ہوں۔'' انہوں نے انٹرکام رکھ کر حیرت سے اس کا منہ دیکھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' ڈاکٹر انجم کا لہجہ اور انداز یکا یک بدل گیا۔

آج کل کی لڑکیاں اپنی آزادی اور عیش کے باعث چاہتی ہیں کہ وہ جلدی ماں نہ بنیں۔ ہوسکتا ہے وہ بھی ان سے کسی غلط کام کی توقع رکھ رہی ہو۔

ماہم یکا یک ان کے چہرے سے بھانپ گئی کہ وہ اس کے بارے میں غلط رائے قائم کر رہی ہیں۔

''میرا مطلب ہے ڈاکٹر!'' وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

''میرے شوہر بزنس کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں چاہتی ہوں سب سے پہلے یہ خبر اپنے شوہر کو میں خود دوں اس کے بعد سب کو پتا چلے۔''

''وہ مجرموں کی طرح چہرہ جھکا کر معصومیت سے بولی تو ڈاکٹر انجم کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اتنا پیار کرتی ہیں آپ۔'' انہوں نے پین بند کرتے ہوئے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''اینی وے۔آپ گھبرائیں نہیں۔میں نہیں بتاؤں گی۔''

''بائے داوے۔آپ اپنے شوہر سے ہمیں ضرور ملائیے گا۔میں دیکھنا چاہتی ہوں، اتنی پیاری سی لڑکی کس خوش نصیب کو چاہتی ہے۔'' وہ بس خاموش رہی۔

''آپ یہ رپورٹ اور ٹیسٹ رکھ لیجیے، ہاں البتہ احتیاط ضرور کیجئے گا۔'' وہ چہرہ جھکائے ہدایات سنتی رہی، اور جب ڈاکٹر انجم نے بتایا کہ صرف کمزوری ہے، کچھ دوائیں اور بیڈ ریسٹ کے لیے کہا تو دونوں خواتین جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

گھر لوٹتے ہوئے بلقیس نے مہتاب سے پوچھا۔''مہتاب تم نے ڈاکٹر کو تو نہیں بتایا کہ ماہم؟؟؟''

''ارے بھابی! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔اور کیا ضرورت ہے ہمیں یہ بتانے کی اور پھر دیکھیں تو ماہم ویسی رہی ہی کب ہے۔کتنا تو بدل گئی ہے اور انشاء اللہ دیکھنا جب بچے ہو جائیں گے تو کیسے شکایتیں کیا کیا کرے گی۔آپ سے بچوں کی بھی اور بچوں کے باپ کی بھی۔''

مہتاب نے ہنس کر کہا بلقیس بھی مسکرا دیں۔ڈھیروں دعاؤں کے ہمراہ۔

☆ ☆ ☆

دو دن ہو گئے تھے۔ وہاج گھر نہیں آئے تھے۔ تائی جان اسے دیکھ دیکھ کر ہول رہی تھیں، مہتاب چچی کو پھر بلا لیا۔

''مہتاب! مجھے لگتا ہے تمہاری ڈاکٹر کا دماغ خراب ہے۔ لڑکی کا حال تو دیکھو۔ کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کل کلیم بھائی بھی کہہ رہے تھے کہ کسی اچھی سی لیڈی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔''

''توبہ ہے بھابی۔! آپ لوگ تو ناحق پریشان کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کھانا پینا تو دلہن کا اس لیے چھوٹا ہوا ہے کہ میاں صاحب جو گھر نہیں ہیں۔ بیٹے کو تو لتاڑتی نہیں ہو اور بہو کو ہر وقت تاڑتی رہتی ہو۔ بن گئیں ناں روایتی ساس۔''

مہتاب نے ہنس کر کہا۔

''کیا کروں۔ اس کے کاروباری جھنجٹ تو ازل سے ایسے ہی ہیں۔''

معاً وہاج حسن کمرے میں داخل ہوئے۔

''لو آ گیا۔ تم ہی سمجھالو۔''

''السلام علیکم!'' انہوں نے مودب انداز میں حسب عادت سلام پیش کیا۔

''والسلام۔'' چچی چیخ کر بولیں۔

''شریف زادے! تم ہنی مون پر سے آ کر اس طرح غائب ہو گئے، جیسے لڑکی اغوا کر کے لے گئے تھے۔''

''چچی جان! بے تکلف ہوتے وقت بندہ بھی دیکھ لینا چاہیے۔'' فراج نے ہانک لگائی۔

''لو۔ بھیا بندے دیکھنا شروع کیے ناں۔ پھر تو کر لیے مذاق۔ اس کا دل چھوٹا ہے۔ اس کا دل بڑا ہے۔ اس کا دل پتلا ہے۔ اس کا دل لمبا ہے۔ اسے برا نہ لگے۔ اسے اچھا نہ لگے۔' وہ ایک سانس میں بولیں تو سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

وہاج حسن بھی ہنس دیے۔ نہیں۔ آپ مذاق کیا کیجئے۔ سچ میں ہرگز برا نہیں مانتا۔

آفس میں دراصل کچھ اچانک کام آن پڑا تھا، اس لیے اچانک غیر حاضری کی گستاخی پر معافی کا خواستگار ہوں۔'' اچانک انہوں نے شریری سے انداز میں کہا تو امی اور چچی کا غصہ ایک دم ہی اتر گیا۔

''اچھا، اپنے کمرے میں جاؤ۔ ماہم تمہیں بہت یاد کر رہی ہے۔ ہر پہر تمہارا ہی پوچھتی رہتی ہے اور اسے سمجھاؤ، کھایا پیا کرے۔ ورنہ مر جائے گی۔'' چچی کی بات پر انہیں شدید شاک لگا۔

''کیوں پوچھ رہی تھی وہ بار بار ان کے بارے میں۔'' وہ بے یقینی سی کیفیت میں کمرے میں داخل ہوئے۔ پہلی نگاہ اس پر پڑی۔ وہ نماز ظہر ادا کر کے اٹھی تھی۔ جا نماز تہہ کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر چونک گئی، نگاہیں جھک کر ان کے قدموں سے الجھنے لگیں۔

وہ جو بار بار سمیعہ سے ان کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ کب آئیں گے، اب کس طرح ان سے بات کرے گی۔ وہاج حسن نے بھرپور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ عجیب کترایا کترایا سا انداز تھا اس کا۔

اس کے انداز سے ذرا بھی نہ لگ رہا تھا، کہ وہ ان کا انتظار کر رہی ہو گی۔

وہ اس کے انداز پر الجھ کر رہ گئے۔

''گھر والے بتا رہے ہیں کہ تم مجھے یاد کر رہی تھیں۔'' انہوں نے اس کے مدمقابل جا کر عجیب چڑچڑے سے انداز میں پوچھا۔

''جی۔'' وہ مختصراً کہہ سکی۔

''کیوں؟'' ان کا انداز تیکھا تھا۔

وہ اضطراب سے ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔ آنکھیں پہلے ہی اشک بہانے کے لیے تیار تھیں۔

اس کی خاموشی نا قابل فہم تھی۔ پھر اس کا رونا، عجیب سا انداز۔ وہ کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے تھے، اس کی خاموشی پر جھنجلا گئے۔

''کوئی وجہ بھی تھی یا یونہی پریشان کر رکھا تھا سب کو۔''

انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے اوپر کرتے ہوئے بے زاری سے پوچھا۔ وہ رو رہی تھی۔

''حسن۔ حسن۔ میں۔ ماں بننے والی ہوں۔'' وہ لب کاٹ کر بولی، اور اپنے ہاتھوں پر چہرا چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ دم بخود سے اسے کھڑے دیکھتے رہ گئے۔ یہ خبر ان کے لیے ایک دھماکے سے کم نہ تھی۔

کئی لمحے اس کی سسکیوں اور ان کی خاموشی کی نذر ہوئے۔ پھر وہ اس کے سامنے سے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھے۔ ان کی طویل خاموشی اسے بہت پراسرار لگ رہی تھی۔

''گویا فیصلے کی گھڑی آ گئی۔'' وہ انتہائی پرسوچ انداز میں کافی دیر کے بعد بولے تھے۔ چہرا کسی بھی نرم تاثر سے عاری تھا۔

''کوئی بھی سفاک فیصلہ کرنے سے پہلے حسن! میرے بارے میں ضرور سوچ لیجیے گا۔''

وہ تڑپ کر ان کے سامنے آ گئی۔ ''اور کچھ نہیں میری زندگی کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' وہ روتے روتے ہی ان کے قدموں میں بیٹھتی چلی گئی۔

وہاج حسن اٹھے اور مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اس کا دوپٹہ ان کے قدموں سے لپٹ کر پیروں کی دھول بن گیا۔

تجھ کو پایا تو چاک سی لیں گے
غم بھی امرت سجھ کر پی لیں گے

ورنہ یوں ہے کہ دامن دل میں
چند سانسیں ہیں، گن کے جی لیں گے

جانے اس نے کیا کچھ کہہ دیا۔ شام تک وہ ان کا انتظار کرتی رہی۔ وہ کہاں چلے گئے تھے۔ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اگر انہوں نے قبول نہ

کیا تو وہ اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ جائے گی۔

☆ ☆ ☆

تائی جان اس کے کمرے میں آئیں تو اسے اندھیرے میں بیٹھا دیکھ کر ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ لائٹیں جلا کر اس کے پاس آگئیں۔

''ہر وقت کیا سوچتی رہتی ہو۔ جانتی ہو۔ زیادہ سوچنے سے آدمی تنہا ہو جاتا ہے۔ ہنسا بولا کرو۔ جھگڑا کرو۔ کیوں اکیلی بیٹھی رہتی ہو، یہاں سب تمہارے اپنے ہیں۔'' انہوں نے اسے اپنے سے قریب کر کے پیار کیا۔

کتنے پیار کرنے والے تھے اس کے چاروں طرف۔ اگر ان پیاروں کو معلوم ہو جائے کہ وہ انتہائی مفاد پرست اور جھوٹی ہے تو اس پر تھوکنا بھی پسند نہ کریں۔ ہوسکتا ہے اس کی نادانی سمجھ کر اسے معاف کر دیں۔ ماں جیسی ساس۔ بہنوں جیسی نندیں بھائی۔ سب کچھ تو مل گیا تھا اسے، سوائے شوہر کے۔ مگر کچھ بھی اپنا نہیں تھا۔ جب تک شوہر اپنا نہیں تھا۔

''تائی جان! آپ لوگ مجھے چھوڑ تو نہ دیں گے۔ میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔ میں بہت تنہا ہوں آپ لوگوں کے بغیر۔'' وہ خدشوں سے لبریز بھیگے لہجے میں بولی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ اکیلی رہتی ہو ناں۔ اس لیے ایسا سوچتی رہتی ہو اور جانے کیا کیا سوچتی ہو۔ چلو اٹھو، باہر نکلو۔ وہ دیکھو سمیعہ اور فراج نے لان میں کتنے خوبصورت نئے پودے لگائے ہیں۔ تازہ ہوا میں رہنے سے صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ اور دیکھو تو حلیہ کیسا خراب کر رکھا ہے۔ جانتی ہو روزانہ کلیم بھائی تم سے شام کو ملنے آتے ہیں۔ تمہیں خوش دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اور اداس دیکھ کر افسردہ، پھر بھی تمہیں ذرا دھیان نہیں۔

انہوں نے لاڈ سے ڈانٹا۔ اچانک پاپا کا خیال آتے ہی اس کی روح تک شانت ہوگئی۔

''میں آج پاپا سے ملنے خود جاؤں گی۔'' وہ جانے کس دھیان سے پلٹ کر خوشی سے بولی۔

''بالکل آیا جایا کرو۔ انہیں تو اور بھی خوشی ہوگی۔ تیار ہو جاؤ، وہاج آنے والا ہے اس کے ساتھ چلی جانا ورنہ میں ڈرائیور کے ساتھ تمہیں بھجوا دوں گی۔'' تائی جان پیار کر کے چلی گئیں۔

وہ وقت جو انتظار کرتے کرتے لمحوں سے صدیوں میں بدلتا جا رہا تھا، گھر جانے کے احساس سے پر لگا کر اڑنے لگا۔ وہ نہا کر نکلی۔ بال گیلے تھے، انہیں یونہی پشت پر کھلا چھوڑ دیا۔

کاسنی رنگ کے لباس میں وہ کسی چمن کا خوش رنگ پھول لگ رہی تھی۔ سادگی سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ بھیگتی کاجل کی تحریر سارے سنگھار پر بھاری تھا۔ وہ افسردگی سے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

ڈرائیور کے ساتھ گھر آئی تو اسے معلوم تھا پاپا گھر میں نہیں ہوں گے، وہ ایک دو گھنٹے، تنہا اپنے کمرے میں رہنا چاہتی تھی۔ ڈرائیور باہر سے ہی چلا گیا۔

پورچ میں وہاج حسن کی گاڑی دیکھ کر وہ حیرت زدہ بلکہ دم بخود رہ گئی۔ وہاج حسن یہاں کیوں آئے ہیں، کیا پاپا کو ساری حقیقت بتانے۔

''مائی گاڈ'' اس نے خود کو سنبھالا۔ پاپا کو آگاہی دینا مسئلے کا حل تو نہیں تھا۔ اس کی روح تک کانپ گئی تھی۔

الٰہی جان اسے سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس نے سلام کیا۔ الٰہی جان نے گرمجوشی سے جواب دیا۔

سب ملازم اسے بڑی عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ جیسے اس کے سینگ نکل آئے ہوں...... کیا کھیل کھیلا تھا اس نے کہ ہر خاص و عام میں تماشا بن کر رہ گئی تھی۔

''بی بی جی! وہاج صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔''

''اچھا۔ کیا پاپا گھر پر ہیں؟''

''نہیں کلیم صاحب تو نہیں ہیں۔''

''تو پھر کس سے ملنے آئے ہیں۔''

''وہ ہارون صاحب کے ساتھ آئے تھے جی۔ ہارون صاحب کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔'' وہ کسی کام کی جلدی میں تھا کہہ کر چلا گیا۔

کیا وہ یہ معاملہ ہارون سے ڈسکس کریں گے۔

مائی گاڈ! وہ کس عذاب میں پھنس گئی تھی۔ وہ لرزتے وجود کے ہمراہ بمشکل تمام ہارون کے کمرے تک پہنچی۔ جانے ہارون کے کیا تاثرات ہوں گے یہ سب سن کر وہ دروازے کے باہر رک گئی۔

بار حیا سے ایک ایک قدم عذاب ہو رہا تھا۔ کاش، مرنا آسان ہوتا۔ اختیار میں ہوتا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ذرا سا پردہ ہٹا ہوا تھا۔

وہاج اور ہارون صوفے پر بیٹھے تھے، دونوں کی اس طرف سے پشت تھی۔

سینٹرل ٹیبل پر چائے کے ساتھ کافی لوازمات رکھے ہوئے تھے۔ خالی چائے کی پیالیوں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ کافی دیر سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ فی الوقت کمرے میں خاموشی تھی۔ اس کا موضوع کس مقام پر تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھی، توقف سے وہاج کی آواز اس کے اس کے کانوں میں پڑی۔

''ایک تو سب سے زیادہ ڈاکٹر ہاشمی نے پریشان کر رکھا ہے۔ آئے دن چلے جاتے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔''

''جو میں نے تجویز بتائی ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' ہارون نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہو رہا۔'' وہاج کہہ رہے تھے۔

وہ حیران پریشان سی کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیا گفتگو ہو رہی ہے۔

''پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ بات اس طرح کھلے کہ وہ ایک دم شاکڈ نہ ہو۔ کیونکہ آج کل اس کی طبیعت ویسے ہی خراب ہے۔ کہیں الٹا نقصان نہ ہو جائے۔''

''بے فکر رہیے کافی مضبوط ہیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ صاف صاف بتا دیجئے کہ وہ کسی پرائمری اسکول کا سرٹیفکیٹ تھا جو اس نے جلا دیا تھا۔ طلاق

نہیں ہوئی ہے، نکاح بدستور قائم ہے، یہ محض ایک ڈراما تھا۔ البتہ دفاعی طور پر آپ ہیلمٹ اوڑھ لیجیے گا۔ مبادا سنتے ہی آپ کا سر نہ پھاڑ ڈالے۔''

اس بات پر دونوں کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا تھا۔

اور اسے یوں لگا تھا جیسے وہ گہرے پاتال میں جا گری ہو۔ اتنا گھناؤنا مذاق اس کے ساتھ۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ساحل سے آ لگی تھی مگر اپنی عزت کو نیلام کر کے...... یہ سفر طے کیا تھا۔ نہیں نہیں۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔

''اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈالی گئی ہیں۔'' وہاج نے بڑے وثوق سے کہا تھا۔

''کیسی زنجیریں۔ کون سی زنجیریں۔ وہاج حسن'' یکلخت ہی سناٹا ٹوٹا اور وہ زخمی شیرنی کی طرح بپھر کر وہاں سے چلی گئی۔

''کیا سمجھ کر کیا آپ نے میرے ساتھ ڈراما اور ہارون! تم نے ان کا ساتھ دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور جانے کتنے لوگ شامل ہوں گے میری بے بسی پر پیچھے سے بیٹھ کر ہنسنے والوں میں۔ اور اگر یہ نہ ہوتا تو جانے کتنے دن اور مجھے مقتل میں گزارنا ہوتے، بہت خیال ہے اپنی آنے والی اولاد کا۔ کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔ میں تو انسان ہی نہیں تھی، میں تو بیوی نہیں ہوں آپ کی حسن! مجھے ذلیل کرتے رہے، اور ہنستے رہے، میں نے آپ کے ساتھ اپنی ہستی مٹا ڈالی۔ اور مجھے کیا ملا۔ تضحیک، ذلت، بے بسی، میں تو آپ کو ایسا زخم دے کر جاؤں گی حسن! کہ آپ یاد کریں گے۔ آپ نے سمجھا کیا تھا مجھے۔ ہاں۔ سارے کس بل نہ نکال دیے ہوں تو میرا نام بھی ماہم جاہ نہیں۔ صرف ایک شخص نے مجھے اتنی آسانی سے سب کے سامنے تماشا بنا کر ڈال رکھا تھا۔ یاد کرو گے حسن! کس پاگل سے واسطہ پڑا تھا۔ اب ماتم کرنا۔ اپنے آنے والے پر۔'' وہ گاڑی لے کر جو نہی نکلی۔

اس کے جارحانہ انداز پر الٰہی جان ٹھٹک گیا۔ سرپٹ ان لوگوں کے کمرے میں دوڑا۔ گاڑی کی آواز پر وہ بھی باہر آئے تھے۔

''وہاج صاحب! ماہم بی بی۔ آپ کی گاڑی لے گئی ہیں۔''

''کیا۔ کب۔'' دونوں ششدر رہ گئے۔

''وہ جی آئیں تو بالکل ٹھیک تھیں، آپ کے کمرے کی طرف گئیں۔ پانچ منٹ کے بعد واپس آئیں۔ بالکل ویسی ہی حالت تھی جیسے ان دوروں کے وقت ہوتی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے پکارا بھی، پر رکیں نہیں۔ گاڑی میں چابی کیوں لگی چھوڑ دی تھی آپ نے؟'' الٰہی جان بتاتے بتاتے سوال پر اتر آیا۔ بڑے ملال کے ساتھ۔

او مائی گاڈ۔ لگتا ہے اس نے ہماری گفتگو سن لی ہے۔'' ہارون نے کہا، پھر بولا۔

''مگر وہ آئی کیوں تھی یہاں''

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں۔'' وہاج جھنجھلا گئے۔

''تم ایسا کرو گاڑی نکالو۔ الٰہی جان تم نے دیکھا وہ کس طرف گئی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے باہر کی طرف آئے۔

''جی اس طرف۔''

''اس طرف، گویا گھر نہیں گئی۔''

''یہ گفتگوسن کر وہ گھر جا بھی کیسے سکتی ہے۔''

''آپ ایسا کریں گاڑی لے کر اس طرف نکلیں، میں ساتھ والوں کی بائیک لے کر آپ کے پیچھے آتا ہوں۔''

وہاج گاڑی لے کر نکلے۔ہارون۔ان کے پیچھے نکلا۔

''سنو۔الہی جان! چچا آئیں تو انہیں کچھ نہ بتانا سمجھے۔''

''جی اچھا۔''

''اچھا کے بچے، تم سے یہ بھی کہا تھا کہ کسی کو نہ بتانا کہ وہاج بھائی آئے ہوئے تھے۔اور جب ماہم آئی تھی تو ہمیں آ کر کیوں نہیں بتایا تم نے۔''ہارون نے اسے بری طرح جھڑک کر پوچھا پھر اس کا جواب سنے بغیر نکل گیا۔

الہی جان حیرانگی سے ان کا منہ دیکھنے لگے۔کیسی پر اسرار اور مبہم گفتگو کر رہے تھے وہ لوگ۔

وہاج نے گاڑی راستے پر ڈالی۔ہارون ان کے پیچھے تھا۔آگے سڑک تین اطراف چلتی تھی۔اب گاڑی کس راستے پر ڈالی جائے، اتنا بڑا شہر ہے، جانے وہ کس سمت گئی ہے۔ وہاج نے گاڑی کی اسپیڈ ہلکی کرتے ہوئے فکر مندی سے سوچا۔اگر وہ سیدھی جاتی تو ضروری نظر آتی۔صرف پانچ منٹ کا ہی تو گیپ تھا ان کے نکلنے میں۔لگتا ہے وہ دائیں بائیں کی سڑکوں کی طرف نکلی ہے۔ہارون نے قریب آ کر کہا۔

''آپ ایسا کریں، اس طرف جائیں، میں اس طرف دیکھتا ہوں۔''

''آپ فکر مند نہ ہوں۔وہ انشاء اللہ زیادہ دور نہیں نکلی ہو گی۔''انہیں فکر مند دیکھ کر ہارون نے دلاسا بھی دیا۔

''ہاں۔یقیناً ہم دونوں میں سے کسی ایک کو، وہ آگے جا کر مل سکتی ہے۔''وہاج حسن نے تائید کی اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ہارون اپنی سمت نکل گیا۔شام کے سائے پھیل رہے تھے۔رات کی رنگینیاں اور روشنیاں سورج کے ڈوبنے کے ساتھ ساتھ سڑکوں پر جوان ہونے لگی تھیں۔ دونوں طرف سڑک بہت مصروف چلتی تھی۔

لوگوں کے ہجوم میں وہ نگاہیں دوڑاتے جا رہے تھے۔

وہ تو شکر تھا کہ وہ گاڑی لے کر نکلی تھی۔جس سے اسکی تلاش آسان ہو گئی تھی۔ورنہ اتنے بڑے شہر میں اسے ڈھونڈنا بہت مشکل تھا۔شاید حادثے کے بعد ہی کسی ہاسپٹل یا فلاحی ادارے سے اطلاع ملنے پر ہی پہنچ پاتے۔وہاج کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں انکی بے بسی کا حال رقم کر رہی تھیں۔ ادھر ہارون کی بھی حالت کچھ صحیح نہیں تھی، آخر وہ اتنی جلدی نکل کدھر گئی تھی۔دونوں کے ذہن میں بار بار یہی آ رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہاج کا پاؤں یکلخت بریک پر پڑا۔

ان کی سفید نسان پیٹرول۔ثناء ہاسپٹل کے آگے کھڑی تھی۔انہوں نے ذرا آنکھیں سکیڑ کر تیز روشنیوں میں یقین کیا کہ وہ واقعی ان کی گاڑی تھی، یا کسی اور کی۔نمبر دیکھنے کے لیے گاڑی ذرا ریورس کی۔ان کے پیچھے آتی گاڑی۔ان کی گاڑی سے ٹکرائی اور اس کے پیچھے ایک اور۔ آگے پیچھے کئی گاڑیوں کے ٹائر چرچرائے۔ساتھ ہی ہارن کا شور۔کانسٹیبل کی سیٹی۔سارا ٹریفک جام ہو گیا۔

نمبران کی ہی گاڑی کا تھا۔ وہ پھرتی سے نکلے۔ لیکن کانسٹیبل کے ہمراہ۔ دوسرے افراد ان کے سر پر تھے۔ ایسی رش ڈرائیونگ اچانک بریکیں لگانا۔ پھر گاڑی کو بنا کسی اصول کے ریورس کرنا۔ انتہائی غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکت تھی، جو کہ اس سے قبل ان سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔

مگر آج انہوں نے ڈرائیونگ نہیں کی تھی۔ بلکہ اچھی خاصی احمقانہ حرکتیں بھی کی تھیں۔ جن سے نمٹنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ان سے دس منٹ پہلے وہ ڈاکٹر انجم کے ہاسپٹل میں پہنچی تھی۔ لگتا تھا کسی کا خون کرنے آئی ہے۔ ڈاکٹر انجم اس کے تیور دیکھ کر دم بخود سی رہ گئیں۔

پچھلی بار وہ انتہائی خوفزدہ، اور ڈری سہمی سی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

اور اب وہ انتہائی پر اعتماد، خود سر، اور اٹل ارادے کے ہمراہ ہاسپٹل میں آئی تھی۔

اس کی سرکشی اور جارحانہ انداز پر ڈاکٹر انجم بالکل نہ سمجھ سکیں کہ وہ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔ اکیلی، اس وقت اور اس حال میں، یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹر انجم اپنے کمرے میں اسے مل گئی تھیں۔ ابھی چند منٹ قبل ہی وہ ہاسپٹل کا راؤنڈ لے کر آئی تھیں۔

اس نے اپنی کلائی سے سونے کی چاروں چوڑیاں اتاریں۔ اور ڈاکٹر کے سامنے میز پر ڈال دیں۔ جیسے بہت بڑی بازی لگانے آئی ہو۔

اور پھر وہ جو اس نے کہا، وہ ڈاکٹر انجم کے لیے ناقابل فہم۔ ناقابل یقین اور ناقابل برداشت تھا اگر وہ ان کی دوست کی بھتیجی نہ ہوتی تو وہ اس کا برا حشر کر کے رکھ دیتیں۔

انہوں نے اسے رسان سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ لیکن ان کا انداز انتہائی فیصلہ کن اور ہٹیلا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہاج حسن کا ٹریفک کانسٹیبل اور دوسرے افراد سے نمٹنا بے حد مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اس قدر جھنجھلائے ہوئے تھے کہ عالم طیش میں بات کیے جا رہے تھے، اس طرح بات بڑھتی جا رہی تھی۔ غصہ ان کی فطرت تو نہیں تھا۔ مگر اس وقت اس قدر غضب ناک ہو رہے تھے کہ بات سمٹتی مشکل نظر آتی تھی۔ ہر گزرتا لمحہ ان کی روح کھینچ رہا تھا۔ وہ اس قدر ہراساں پریشان اور فکر مند تھے کہ بات کو سلجھانے تک کا سلیقہ بھول گئے تھے۔ کتنی بڑی آزمائش میں ڈال گئی تھی وہ انہیں۔

سارا چین سکون ہوا ہو گیا تھا۔ شاید ان چند لمحوں میں ہی انہیں اسے دی گئی اذیت کا ادراک ہو گیا تھا۔ انہوں نے چکرا کر اپنا سر تھام لیا۔

"دیکھیے صاحب! میری وائف اندر ایمرجنسی وارڈ میں ہے اور اس وقت میری اندر شدید ضرورت ہے برائے کرم آپ لوگوں کا جو نقصان ہوا ہے اس کا بل بنا دیجئے۔ میں پورا کر دوں گا۔ آپ لوگ میرا وقت ضائع نہ کریں۔" انہوں نے عاجزی سے کہا تو باقی افراد کے ہمراہ کانسٹیبل نے ان کی جان چھوڑی، کچھ لے دے کر۔

وہ آنا فانا اندر داخل ہوئے، تیز تیز قدم اٹھاتے کوریڈور عبور کیا۔

''ایکسکیوزمی۔ مسز وہاج حسن آئی ہیں یہاں۔'' وہ ریسپشن پر کھڑی نرس سے مخاطب تھے۔

نرس نے رجسٹر کھول کر دیکھا۔ پھر بڑی رسانیت سے انکار کر دیا۔

''جی نہیں۔''

''مائی گڈنیس۔'' انہوں نے ہتھیلی پر مکا مارا۔

''وہ ابھی تو آئی ہیں۔'' وہ بے چینی سے بولے۔

ڈاکٹر انجم ریاض بمشکل تمام اسے اپنے کمرے میں بٹھا کر باہر فون کرنے آ گئی تھیں کہ اسے پتا نہ لگے۔

وہ اس کا نمبر تو نہیں جانتی تھیں، البتہ مہتاب کو اطلاع کرنا ضروری تھا۔

''دیکھیے ان کی گاڑی کھڑی ہے باہر۔ وہ اندر ہی آئی ہیں۔''

''میڈم! یہ صاحب بہت پریشان کر رہے ہیں۔ مسز وہاج حسن کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔''

ڈاکٹر انجم کے ہاتھ جلدی جلدی ڈائل کرتے نمبروں پر رک گئے، انہوں نے فون واپس رکھا اور ایڑیوں کے بل گھوم کر دیکھا۔ اونچا لمبا، شاندار پرسنیلٹی کا مرد بے حد ہراساں و پریشان ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ آنکھیں تلاش میں سرگرداں تھیں۔ لب ضبط سے بھینچ رکھے تھے۔

آپ کیا لگتے ہیں ان کے؟'' ڈاکٹر انجم نے ان کا سر پا تا...... جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''میں ان کا شوہر ہوں۔'' میرا نام وہاج حسن۔'' وہ جلدی سے بولے۔

''آیئے میرے ساتھ۔'' وہ ڈاکٹر انجم کے قدم سے قدم ملاتے ان کے کمرے میں پہنچے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ماہم، وہاج حسن کو دیکھ کر بپھر گئی۔

''کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟ کیا لگتی ہوں میں آپ کی؟'' وہ شدت جذبات سے چلائی۔

اسکو محفوظ دیکھ کر انہوں نے تشکر بھرا سانس خارج کیا اور ساتھ ہی پیشانی پر سے پسینے کے قطرے اپنی آستین سے صاف کیے۔

''میڈم! ایک گلاس ٹھنڈا پانی ملے گا۔'' وہ ڈاکٹر سے مخاطب تھے۔ پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے اطمینان پر وہ سر تا پا...... آگ سے بھر گئی۔

''میں کہتی ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔ سن لیا تم نے۔''

''ڈاکٹر، شوہر کے اطمینان اور بیوی کے غیض و غضب کو بڑی غیر یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ وہاج حسن کو پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہنے لگی۔

''وہاج صاحب! آپ کی وائف نے مجھے آدھے گھنٹے سے پاگل کر کے رکھا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ بار بار کیوں کہہ رہی ہیں کہ یہ بچہ ناجائز ہے۔''

''ناجائز۔'' وہاج کو ایک دم کرنٹ لگا۔

جب ساری بات اس نے سن لی تھی تو پھر یہ خرافات بکنے کی کیا گنجائش نکلتی تھی۔ انہوں نے تیکھے چتون سے اس کی طرف دیکھا۔

''ڈاکٹر صاحبہ! یہ ابنارمل ہیں۔'' انہوں نے پرسکون انداز میں بتایا تو ڈاکٹر حیران رہ گئیں۔

''میں ابنارمل نہیں ہوں۔'' اس نے پوری قوت سے اس بات کی تردید کی۔ ''ڈاکٹر! میں بالکل ہوش مند لڑکی ہوں۔''

''دیکھیے ڈاکٹر! کوئی ہوش مند لڑکی اپنے آپ کو اتنی گندی گالی دے سکتی ہے'' اسکے لفظ پر انہیں آگ لگ گئی تھی۔ ''ہم لوگ آپ کو بظاہر کسی اچھے خاندان کے ہی نظر آتے ہیں ناں۔'' ڈاکٹر تو اچنبھے سے ان کا منہ دیکھے جا رہی تھی۔

''اور دیکھیے گا ابھی یہ اپنے آپ کو کیا کیا کہیں گی۔ کہ میں انہیں طلاق دے چکا ہوں، اور جانے کیا کیا۔ ڈاکٹر! میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ ہم لوگ کب سے ان کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں ایسے دوروں کی حالت میں تو یہ جانے کیا کچھ کر ڈالتی ہیں۔''

ڈاکٹر انجم، وہاج کی بات پر چکرا کر رہ گئیں۔

''جھوٹ بول رہا ہے یہ۔ جھوٹا ہے ڈاکٹر آپ میری بات کا یقین کریں۔ یہ انتہائی مکار اور مفاد پرست ہے، دغاباز ہے، دوغلا ہے۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالے۔

ڈاکٹر نے اس کی طرف ترحم سے دیکھا۔

''ڈاکٹر! آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، یہ نیم پاگل خاتون ہیں۔ اور اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ڈاکٹر ہاشمی سے فون پر بات کر کے پوچھ لیجئے۔ وہ شہر کے بہت بڑے اور مشہور ترین اسپیشلسٹ ہیں اور یہ ان کے زیر علاج ہیں۔''

''مائی گاڈ!'' ڈاکٹر کبھی اس کا، کبھی ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر!...... ڈاکٹر! میں پاگل نہیں ہوں۔ مگر یہ آدمی مجھے پاگل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے عزائم بہت خطرناک ہیں۔ آپ اس کی کسی بھی بات کا یقین نہ کریں۔''

''مگر پچھلی بار جب یہ آئی تھیں تو بالکل ٹھیک معلوم ہو رہی تھیں۔'' ڈاکٹر وہاج سے مخاطب تھیں۔

''جی ہاں کبھی کبھی تو لگتا ہی نہیں کہ یہ پاگل ہیں کہ نہیں۔'' وہاج جلدی سے بولے۔

اور دیکھیے۔ انہوں نے اپنی سونے کی چوڑیاں اتار کر پیشگی یہاں ڈال دی ہیں، ادائیگی کے لیے۔'' ڈاکٹر انجم نے تاسف سے بتایا۔

''یہی سب سے بڑا ثبوت ہے انکے پاگل ہونے کا، اگر یہ صحیح الدماغ ہوتیں تو ان کا کام صرف ایک چوڑی کی ادائیگی سے بھی ہو سکتا تھا۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔ ہم یہاں یہ کرتے ہیں'' ڈاکٹر انجم ان پر چڑھ دوڑیں۔ وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

''میرا مطلب ہے میں ایک مثال پیش کر رہا ہوں، ان کے پاگل پن کی۔'' برا پھنسا ہوں یار آج انہوں نے ڈاکٹر کو ٹھنڈا کیا تو وہ آتش فشاں بن کر ان کی طرف جارحانہ انداز میں لپکی۔

''حسن! آئی کل یو۔ آئی کل یو۔'' اس نے ہذیانی سے انداز میں ان کا گریبان نوچ ڈالا۔

انہوں نے سختی سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیے۔

مگر وہ آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی، انہوں نے دوسرے بازو سے اسے اپنے حلقے میں لے لیا۔ اس طرح کہ وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئی۔ بہت تیزی سے انہوں نے صورتِ حال کو کنٹرول کیا تھا۔

''سوری ڈاکٹر۔ ہماری وجہ سے آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری مدد کی۔''

''اینی وے۔ یہ تو ہمارا اخلاقی فرض بنتا ہے۔''

ڈاکٹر ابھی تک حواس باختہ تھیں۔ بس مسکرا کر یونہی کہہ دیا۔ ساتھ ہی چوڑیاں اٹھا کر انہیں دیں۔

''تھینک یو۔'' انہوں نے اس کے ہاتھ چھوڑ کر چوڑیاں پکڑیں اور جیب میں ڈال لیں۔

اس نے شانے پر دھرا ہاتھ جھٹکا اور تیزی سے باہر نکلی۔ وہ اس کے پیچھے لپکے، دو قدم کے فاصلے پر چلتے ہوئے وہ گیٹ تک پہنچے باہر جا کر انہوں نے اس کا بازو سختی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ پھر اسے گاڑی میں دھکیلا۔

پھرتی سے لاک لگایا۔ گھوم کر دوسری جانب اندر آ گئے۔ اس نے پلٹ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اسی رفتار سے انہوں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور راستے پر ڈال دی۔

وہ ان کی حرکت پر جز بز ہو کر رہ گئی۔ نفرت سے ان کی طرف گھومی۔

''اگر آپ نے مجھے گھر لے جانے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گی کہ آپ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ سنا آپ نے۔'' وہ پھنکاری۔

''میں کہتا ہوں اگر مزید تم نے تماشا دکھانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔''

''تماشا تو ہو گا۔ وہاج حسن ذرا دیکھنا۔'' اس نے کھڑکی کا شیشہ تیزی سے نیچے کر کے باہر کی طرف پکارنے کی کوشش کی۔ وہاج نے سختی سے اسے اپنی جانب کھینچا۔

''ماہم! میں کہہ رہا ہوں۔ یہ میرے ضبط کی آخری انتہا ہے، جب سب کچھ تم پر عیاں ہو ہی گیا ہے، تو پھر ان باتوں کا کیا مطلب ہے؟''

''ان باتوں کا مطلب اتنی ہی تکلیف پہنچانا ہے آپ کو حسن۔ حسن جتنی آپ نے مجھے پہنچائی ہے۔ بلاوجہ۔ کیا حق پہنچتا تھا آپ کو یہ سب کرنے کا۔''

''بات گھر جا کر بھی ہو سکتی ہے۔'' انہوں نے چیخنے چلانے پر کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔ ''مجھے پاگل سمجھ رہے ہو۔''

اس نے بری طرح بپھر کر اسٹیئرنگ پر سے ان کے ہاتھ ہٹائے، گاڑی بے توازن ہو کر ادھر ادھر ڈول گئی۔

''گھر تو اب میری لاش ہی جائے گی۔''

اگر وہ جلد قابو نہ پاتے، ایکسیڈنٹ کا یقینی احتمال تھا۔ وہ اس کی حرکت پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

ہارون نے بہت دور تک اسے تلاش کیا، پھر بائیک اپنے گھر کے راستے پر ڈال دی۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید وہاج کو وہ مل گئی ہوگی، اس لیے گھر سے فون پر رابطہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

''ماہم! میری بات سنو!'' ان کا انداز قائل کرنے والا تھا۔

''نہیں سننا میں نے کوئی جواز۔ کوئی بکواس۔ صاف کہیے۔ بدلہ لیا ہے آپ نے اپنی بے عزتی کا مجھ سے۔ اتنے گھٹیا انداز میں۔''

''کوئی بدلہ نہیں لیا میں نے تم سے۔ یہ سب تمہارے لیے ضروری تھا۔'' انہوں نے سختی سے تردید کی۔

''اچھا۔ تو کوئی حسرت باقی رہ گئی ہے اب بھی وہ پوری کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ نفرت سے چلائی۔ ''مگر اب حسرت حسرت ہی رہے گی۔''

اس نے ڈیش بورڈ پر پڑا پھل کاٹنے والا۔ خوبصورت سا چاقو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ پر وہاج کا بھاری بھرکم ہاتھ تھا۔ سخت خشمگیں نگاہوں سے انہوں نے اس کی جانب دیکھا۔ گاڑی فل اسپیڈ سے رواں دواں تھی۔ مختلف شارٹ کٹس سے انہوں نے طویل راستہ عبور کیا تھا۔ جھٹکے سے گاڑی گھر کے آگے روکی۔ اسی انداز میں دروازہ کھولا۔

''باہر نکلو۔'' ان کے تیور سخت خراب تھے۔ اس کی مزاحمت پر اور بھی چراغ پا ہو کر رہ گئے۔

ہارون کے فون پر سب گھر والے پریشان ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فراج انہیں ڈھونڈنے ہی نکلنے والا تھا۔ وہ گاڑی سے نہیں نکلتی۔ زبردستی باہر کھینچا۔

''وہ آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی۔ لگتا تھا جب تک من میں آئی بات پوری نہ کرے گی، چین سے نہیں بیٹھے گی۔ اس کے اس عزم پر ان کے تن بدن میں انگارے سے لگ گئے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا کیا کر ڈالے۔

''بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ وہاج حسن! اپنے بچے کے لیے ناجائز کا لفظ سنتے ہوئے۔''

''بکواس بند کرو۔''

سخت اشتعال میں آ کر اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

یکلخت ہی اس کا جنون، دیوانگی، اشتعال، چیخنا چلانا سب کچھ گم ہو گیا۔ اتنا بھاری ہاتھ پڑنے پر وہ چکرا کر رہ گئی۔ ایک لمحہ بھی اسے سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع دیے بغیر وہ اسے بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھے۔

''وہاج بیٹا کیا کر رہے ہو۔'' بلقیس سے بیٹے کی یہ سختی دیکھی نہیں گئی۔ تڑپ کر آگے بڑھیں۔

''ہٹ جائیے امی راستے سے۔'' وہ بھپر کر بولے۔

''بیٹا تم جانتے ہو یہ اپنی حالت میں نہیں ہے۔'' وہ بے بسی سے پکاریں۔

''حالت میں تو لا رہا ہوں اسے۔'' وہ سختی سے بولے۔

سب کے سامنے وہاج حسن کا یہ روپ بہت مختلف اور حیران کن تھا۔

کمرے میں لے جا کر بے دردی سے اسے بیڈ پر دھکیلا مڑ کر دروازے کا لاک لگایا پھر اسی غضب ناک انداز میں واپس پلٹے۔ وہ بیڈ پہ گرتے ہی بے اوسان ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ سارا وجود پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ اسے دیکھ کر دل کٹ گیا۔ سارا غصہ، تلخی، اشتعال ملال میں بدل کر رہ گیا۔ اس کے دائیں گال پر ان کی چاروں انگلیوں کے سرخ نشان واضح تھے۔ اتنے تھکے ماندے سے انداز میں اس کی جانب بڑھے جیسے ساری توانائیاں پچھلے چند لمحوں میں صرف ہو کر رہ گئی ہوں۔ ''آخر تم اتنی جذباتی اور جلد باز کیوں ہو۔'' جھک کر اس کے چہرے پر سے ملائمت سے بال ہٹاتے ہوئے پورے استحقاق اور اپنائیت سے پکارا۔

''ماہم!'' ان کی پوروں کے لمس پر وہ تڑپ کر سیدھی ہو گئی۔

ان کی جانب دیکھا۔ جیسے کوئی ضدی بچہ سزا پانے پر مظلومیت سے دیکھتا ہو۔

کیا کچھ تھا ان آنکھوں میں۔

کتنے تاثر تھے اس نچڑے ہوئے پانی میں۔

شکوے، وحشت، ضبط اور بے پناہ ٹوٹ کر رونے کی چاہت۔

بے اختیارانہ ہنسی ان کے لبوں پر بکھر گئی۔ کھینچ کر اسے اپنے سینے میں چھپا لیا۔ ان کا قرب پاتے ہی وہ نئے سرے سے ان کی باہنوں میں بکھرتی چلی گئی۔

جیسے پھول تیز ہوا کے آگے بے بس ہو کر پتی پتی بکھرتا چلا جاتا ہے۔ جیسے خوشبو مست ہو کر بے سمت راہوں پر رقص کرنے لگتی ہے، جیسے موجیں طوفان کے آگے سربسجود ہو جاتی ہیں۔ کئی لمحے یونہی اشک بہانے میں گزر گئے۔

''آپ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''اگر ایسا نہ کرتا تو تم میرے ہی ظلم پر مجھ ہی میں پناہ لے کر نہ رو رہی ہوتیں۔''

ان کے لفظوں پر یکلخت اسے اپنی پوزیشن کا احساس ہوا تو خود اپنے ہی آپ میں سمٹتی چلی گئی۔

''چھوڑیئے مجھے!'' ادھر ادھر نظریں چرا کر کہا انداز میں اب بھی خفگی کا تاثر تھا۔

''اگر چھوڑنا ہی ہوتا۔ تو اتنے چکر سے تمہیں حاصل ہی کیوں کرتا۔'' وجود کے گرد بازوؤں کا گھیرا تنگ کیا اور شرارت سے کہا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا۔'' بے ساختہ ہراساں ہو کر ان کی جانب دیکھا۔ کچھ بھی نہیں سمجھی تھی۔

''مطلب ان آنکھوں میں پڑھو۔'' جھک کر کہا۔ جن میں محبت کی تپش الاؤ دہکا رہی تھی۔

جذبات کا سمندر موجزن تھا۔

اور جانے کیا کچھ تھا۔ یکلخت ہی اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''کیا بکواس ہے یہ!'' ایسا لگتا ہے جیسے چہرہ ان کی آنکھوں میں تپش سے دہک اٹھا ہو۔ وہ اس کی کیفیت پر بہت محظوظ ہوئے دل کھول کر ہنسے۔ اس نے زبردستی ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنے اور ان کے درمیان فاصلہ رکھا تھا۔

مگر وہ کب چھوڑنے والے تھے۔ اسی انداز میں اسی جذبے سے سرگوشی میں بولے۔

''اگر آنکھیں نہیں پڑھ سکتیں تو دل پر رکھے ہاتھ کے لمس سے محسوس کرو کہ وہ تمہیں کیوں پکار رہا ہے۔'' ان کا انداز دھیما اور شریر تھا۔ وہ سخت جھنجھلا گئی۔

اگر ہاتھ ہٹاتی تو ان سے جا لگتی، ہاتھ رکھتی تو بھی قرب، برقرار رہتا تھا۔

اس سے دلکش نظارہ نہیں دیکھا میں نے

تیرے اختیار سے باہر میری پناہوں سے فرار

وہ مسکرائے۔ وہ اس قدر ہراساں تھی کہ تمام سوال و جواب کرنا بھول گئی تھی۔

''آپ مجھے چھوڑ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔'' ساری ہمت مجتمع کر کے گزارش کی۔

''آں۔ ہاں۔ تمہیں فی الوقت چھوڑنا میرے اختیار میں نہیں۔'' بھاری گمبھیر لہجے میں کہا۔

''پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے۔'' جھنجھلا گئی، سخت چڑ کر پوچھا۔

''کچھ۔ کچھ۔'' ان کا انداز شریر تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اور کس کی وجہ سے کر رہے ہیں۔'' یک بیک پرانے انداز میں لوٹ آئی۔

''اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو میری حالت پر رحم کرتے۔ ایک دن بھی ترس آیا آپ کو میری حالت پر، میرے رونے پر، کیسی محبت تھی یہ، جن سے محبت کی جاتی ہے انہیں یوں اذیت میں رکھا جاتا ہے کیا؟ ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ تماشا بنوا کر ہنسا جاتا ہے۔''

وہ غصے اور ناراضگی سے بولتے بولتے ایک دم چپ ہوئی تو وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرائے۔ پھر اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولے۔

''جن سے محبت ہوتی ہے ناں ان کے ساتھ سب کچھ کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور پھر محبت کا اظہار بھی ٹوٹ کر کرنا جانتا ہوں۔''

انہوں نے مسکرا کر شوخی سے کہا۔ تو وہ اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔ خفت سے چہرہ سرخ ہو گیا۔

''زبردستی اظہار محبت کروایا آپ نے مجھ سے۔'' اس نے اس قدر شکوے سے دیکھا، جیسے ساری جمع پونجی انہوں نے زبردستی چھین لی ہو۔

''جی۔ جناب۔ مجھے بھی ضد ہو گئی تھی کہ اب محبت کا اظہار تمہاری طرف سے ہی ہو گا۔ ورنہ کہانی یونہی چلتی رہے گی اچھا ہوا۔ یہ محبت کی زنجیر تمہارے پاؤں میں جلد پڑ گئی۔ ورنہ تمہیں مقتل سے رہائی کبھی نہ ملتی۔''

انہوں نے پیار سے گھور کر لفظوں پہ زور دے کر کہا۔ تو وہ تحیر سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ پھر انتہائی سنجیدگی اور قدرے سختی سے پوچھا۔

''اور کون کون شامل ہے اس کھیل میں۔''

اس کے بے لچک رویے کا ان پر خاطر خواہ کوئی اثر نہ تھا انتہائی سکون سے مسکرا کر بولے۔

''ہارون اور ڈاکٹر ہاشمی۔''

''واٹ ڈاکٹر ہاشمی!'' اسے گویا کرنٹ لگا تھا۔

''تم نے انہیں بیوقوف بنایا۔ انہوں نے تمہیں، درمیان میں ہم جیسوں کا کام نکل گیا۔'' انہوں نے سرشاری سے ہیڈ لائن دی۔ پھر اس کی آنکھوں میں بے پناہ تحیر اور سوالات رقم دیکھ کر خود ہی تفصیل سے بتانے لگے۔

''ماہم! تمہیں یاد ہے۔ ایک روز میں نے تم سے کہا تھا کہ تم پاگل نہیں ہو۔ تو کامل یقین کے ساتھ کہا تھا۔ پھر اسی روز میں ڈاکٹر ہاشمی سے ملنے گیا۔ چچا نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا علاج انہی سے ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر ہاشمی کے سامنے میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ انہوں نے حیرانگی سے پوچھا کہ میں نے کس طرح اندازہ لگایا کہ تم نارمل ہو۔ شاید وہ میری سوچ تک رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے، میں نے وجہ بتائی کہ تمہاری آنکھیں ویران نہیں ہیں۔ سوچتی ہیں۔ الجھی الجھی......سی معلوم ہوتی ہیں۔ آخر کیوں؟''

''ہونہہ'' انہوں نے پرسوچ انداز میں گہرا سانس خارج کیا اب کی بار ان کے انداز میں حیرانگی نہیں تھی ایسا تاثر تھا جیسے وہ کسی صحیح راہ کا تعین کر کے اصل مقام پر پہنچ گئے ہوں۔ مجھ سے کہنے لگے۔ ''آپ کے علاوہ کسی اور فرد نے ایسا نہیں سوچا۔ اس کا مطلب ہے آپ اس لڑکی میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔'' بات تو صحیح تھی مگر میں خاموش رہا۔

کہنے لگے۔ ''وہ ہر وقت اس کیفیت میں نہیں ہوتی اگر ایسا ہوتا تو میری نگاہوں سے نہیں بچ سکتی تھی بائی چانس ایسا ہوا ہے کہ آپ نے اسے سوچتے ہوئے دیکھا اور راز پالیا۔ یہ اتفاق بھی ہے اور آپ کی ذہانت بھی۔ لیکن میں کسی نتیجے پہ پہنچنے سے قبل ایک بار اچانک اس لڑکی سے ملنا چاہوں گا۔''

پھر اچانک وہ ایک روز تمہارے گھر آئے۔ شاید تمہیں یاد ہو۔ انہوں نے غیر محسوس انداز میں تمہارا عمیق جائزہ لیا اور اسی روز تمہاری شادی کا شوشا چھوڑ دیا۔

ان کی دلچسپی اپنے کیس کو حاصل کرنے کی طرف ہی تھی اور ان کیا خیال تھا کہ تم کسی سے محبت کرتی ہو اور فی الوقت اس کے انتظار میں دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔

انہوں نے بتایا بالکل ایسا ہی کیس پچھلے دنوں اس کے پاس آیا تھا۔ لڑکی کسی بیوروکریٹ کی بیٹی تھی والدین کہیں اور شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر لڑکی جس شخص کو پسند کرتی تھی۔ وہ جیل میں تھا۔ عارضی سزا کی رہائی تک لڑکی نے پاگل پن کا ڈھونگ رچائے رکھا۔

رہائی سے کچھ دن قبل وہ مجھ سے ملی۔ اس نے دیانت داری سے اپنا مسئلہ میرے سامنے رکھا۔ اور مجھے اس بات کا یقین بھی دلایا کہ وہ جس سے محبت کرتی ہے وہ بے قصور ہے۔ اسے کسی سازش کے تحت گرفتار کرایا گیا تھا۔ والدین اسکی پسند پر متفق نہیں تھے۔ اسلیے دلبرداشتہ ہو کر اسے یہ کھیلنا

پڑا اب وہ لوگ کورٹ میرج کر لیں گے۔ لڑکے اور لڑکی کی شدت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر وہ ایک دوسرے کے نہ بن سکے تو خودکشی کر لیں گے۔

اگر میں سارا سچ ان کے باپ کو بتا دیتا تو لڑکی کا باپ بہت بری طرح مشتعل ہو کر کچھ بھی کرا سکتا تھا۔

اس لیے میں نے لڑکے کا اچھا بیک گراؤنڈ اور کریکٹر دیکھتے ہوئے ان کے والدین کو مختلف حیلے بہانوں سے قائل کر کے دونوں کی محبت کا باضابطہ اور مہذب اختتام شادی کے ذریعے کرایا۔

ڈاکٹر سے یہ کہانی سن کر میرے دل نے گواہی دی کہ تمہارے ساتھ یہ مسئلہ نہیں ہے۔ مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ اس لیے میں خاموش رہا۔
اور ہارون کا اس کہانی میں شامل ہونا ضروری اور انتہائی ضروری ہو گیا۔ کیونکہ وہ تمہیں بچپن سے جانتا تھا۔ اور وہی یہ معمہ حل کرا سکتا تھا۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ تم ان سے ملنے کی کوشش کرو گی لیکن ہارون اور میری مشترکہ کوشش سے تم ڈاکٹر سے نہیں مل پائیں۔ ہارون نے ڈاکٹر کو یقین دلایا کہ ایسا ہرگز کچھ بھی نہیں ہے تم اس طرح کی لڑکی ہو ہی نہیں۔ ہاں البتہ اس واقعہ سے قبل تمہاری شادی کا جو مسئلہ چلا ہوا تھا۔ ہارون نے ڈاکٹر کے سامنے رکھا جس سے یہ ظاہر ہوا کہ شادی سے فرار حاصل کرنے کے لیے ایسا کر رہی ہو نا کہ کسی کے انتظار کے لیے ظاہر ہے یہ لامتناعی کہانی تھی اور اس کا اختتام اسی طرح ممکن تھا کہ تمہاری سوچ کو نظرانداز کر کے تمہاری شادی کر دی جائے۔ میں تمہارا طلبگار تھا۔ ازل سے تمنائی تھا۔ یہ سب کچھ بجائے تمہیں بتانے کے مجھے ڈاکٹر کو بتانا پڑا۔

ہارون نے بحیثیت تمہارا بھائی ہونے کے مجھے اس رشتے کے لیے دل سے قبول کیا۔ بے حد خوشی کے ساتھ اور میرا ساتھ دیا۔ ہارون کو تمہاری بیوقوفی پر غصہ بھی آیا تھا اور ہنسی بھی، اس کا خیال تھا کہ اگر تمہیں کوئی کنفیوژن تھی تو تمہیں ہارون سے ڈسکس کرنا چاہیے تھی۔ یقیناً وہ تمہاری مدد کرتا۔ اب تمہاری سزا یہی ہے کہ بہت اچھے سے بندے کے ساتھ تمہاری شادی کر دی جائے۔

مگر مسئلہ یہ تھا کہ بات بھی نہ کھلے اور میں ہی تمہارے حصے میں آؤں۔ کول مائنڈڈ بندے کا انتخاب ضروری رکھ دیا گیا مہم کامیاب ہوگئی۔'' انہوں نے فتح مندی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور کوئین میری میٹ میں آگئی، مگر جس روز تم میرے آفس میں آئیں اور جو کچھ تم نے مجھے کہا۔ اس سے میں وقتی طور پر بے حد مشتعل ہوا۔

میرے اندر تمہارے لیے انتقام کا جذبہ ابھرا۔ میں تو تمہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لیکن محبت سب سے طاقتور جذبہ ہے۔ انتقام کے جذبے پر حاوی آگیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ آخر وجہ کیا ہے کہ اتنے مرد تمہاری زندگی میں آئے اور کوئی بھی تمہیں رام نہیں کر سکا۔ اس بات کا میرے پاس کوئی جواب کوئی حل نہیں تھا۔ ڈاکٹر ہاشمی سے اسپیشلی اسی سلسلے میں ملنا پڑا۔ ان سے ملتے ہی سارا مسئلہ سلجھ کر رہ گیا۔

انہوں نے کہا ایک لڑکی کے لیے اپنے جنون ساتھی کا انتخاب اس وقت مشکل ہو جاتا ہے جب اسے بے جا اختیارات دے دیئے جائیں۔
لیکن یہاں اختیارات کے ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس لڑکی کا کوئی آئیڈیل ہے ہی نہیں۔

اسے چاہنے والے بہت ملے لیکن وہ بھی کسی کو چاہے اسی شدت سے، وہ اس چیز کی خواہاں ہے۔ اس لیے آپ کو اپنی محبت چھپا کر رکھنا

ہو گی۔ کیونکہ اسے ہمیشہ بن مانگے ملا ہے۔ اس لیے وہ اس احساس سے عاری ہے کہ طلب کیا ہوتی ہے......اگر وہ یہ احساس پہلے ہی پا لیتی تو شاید بہت پہلے سے اپنی منزل مل جاتی۔

ضروری نہیں ہوتا محبت سچی ہو تو دلوں کو اسیر کرے خاص طور پر لڑکیوں کے لیے کیونکہ وہ تو جھوٹے بہلاووں میں بھی آجاتی ہیں۔ یہ لڑکی مختلف ہے اور خود کو رکھ کر بھول گئی ہے۔ اسے اپنی نسوانیت پر اپنی خود اعتمادی پر بہت غرور ہے۔ اس لیے کوئی بھی اس کی انا کا حصار نہیں توڑ سکا۔

یہ احساس اگر شوہر بن کر توڑا گیا تو اسے اپنی پامالی کا احساس کبھی بھی نہیں ہوگا۔ وہ اس قدر ٹوٹ کر بھی نہیں بکھرے گی۔ اس کی انا کی کرچیاں کرنے کے لیے اسے بے وقعت اور بے مایہ کرنا ہوگا۔ پاش پاش ہوتے ہی وہ عام سی لڑکی ہو گی۔''

وہ لب بستہ انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

''اسکے علاوہ بھی بہت سے طریقے تھے تمہیں بے وقعت کرنے کے لیے، مگر ایک گھر اور منظم ماحول میں رہتے ہوئے ایسا کرنا بہت مشکل اور ناممکن تھا۔ اسی لیے میں نے وہی لمحے استعمال کیے جن کا مجھ سے کوئی حساب نہیں لے سکتا تھا۔ اور نہ ہی جن کے بارے میں تم کسی کو بتا سکتی تھیں۔'' انہوں نے شرارت سے کہا۔ پھر سرشاری سے بولے۔ ''یہاں بھی تیر نشانے پر لگا۔'' وہ انہیں گھور گھور کر دیکھے جا رہی تھی۔ تندی سے بولی۔

''آپ کی جیت میں سارا عمل دخل میری حماقت کا ہے۔ بڑا ملال ہوا تھا اپنی حماقتوں پر۔ اگر میں طلاق نامہ کھول کر دیکھ لیتی تو؟'' وہ اس کے غصے پر قہقہہ لگا کر ہنسے۔

یہ بھی رکھا تھا ہم نے دھیان میں
تیر پلٹا اگر نشانے سے!!

انہوں نے بے ساختہ شعر پڑھا۔ پھر کہنے لگے۔

''مجھے سو فیصد یقین تھا کہ تم کھول کر نہیں دیکھو گی۔ تم جیسے جذباتی لوگ اس لیے دھوکا کھاتے ہیں کہ ان کی عقل کو غصہ کھا چکا ہوتا ہے اور پھر تمہیں مجھ میں کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس لیے مجھے امید تھی چھٹکارے کا پروانہ لے کر تم خوش نہ سہی مگر مشتعل بھی نہیں ہو گی۔ اور دوسرے یہ کہ تمہارے لیے یہ اقدام بالکل غیر یقینی اور فوری تھا۔ اس لیے جب تمہیں سمجھنے یا سنبھلنے کا موقع ملا۔ وہ کاغذ جل چکا تھا۔'' انہوں نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔

''آئے بڑے کہیں سے۔ دوغلے نہ ہوں تو۔ اگر میں سب کو ساری حقیقت بتا دوں تو پتا لگے گا آپ کو۔''

''ایسا ہرگز نہ کرنا۔'' انہوں نے جلدی سے زور دے کر کہا۔

''جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اگر راز طشت از بام ہوا تو تمہاری قدر و منزلت اس گھر میں وہ نہیں رہے گی جو تھی۔ زندگی کے کسی موڑ پر بھی تمہیں طعنہ مل سکتا ہے کہ تم اول درجے کی ڈرامہ باز ہو۔ پھر اس بات کے بعد لوگوں کو دکھ علیحدہ ہوگا اور جو دکھ تم دے چکی ہو اس کا ازالہ تو کسی طور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے بہتر ہے بتدریج ٹھیک ہو کر زندگی خوش اسلوبی سے گزارو۔

تمہارے ٹھیک ہونے پر تو جشن منایا جاسکتا ہے۔ راز منکشف ہونے پر نہیں۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''اس لیے کہتے ہیں۔ زندگی کے معاملے میں جو لوگ غیر سنجیدہ ہوتے ہیں۔ دکھ اٹھاتے ہیں۔''

''اور جو لوگ حد سے زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں وہ دوسروں کو دکھ دیتے ہیں۔'' وہ کلس کر بولی۔

''جناب وہ محتاط ہوتے ہیں۔'' وہ اترائے۔

''مگر مجھے محتاط لوگوں پر یقین نہیں رہا ہے۔ ہم دوبارہ نکاح کرائیں گے پھر ساتھ رہیں گے۔'' اس نے منہ پھلا کر خفگی سے کہا۔

''مجھے منظور ہے۔ دوبارہ نکاح کے بعد ہنی مون پر جانے کا چانس تو پکا ہے نا!'' وہ جوش سے بولے۔ پھر منہ بنا کر کہنے لگے۔

''ویسے بھی پچھلی دفعہ تم نے مجھے بور ہی کیا تھا۔ بیماری کا بہانہ بنا کر۔''

وہ بار حیا سے سرخ ہو گئی۔

''تہمت لگاتے ہوئے آپ کو شرم آنی چاہیے۔'' نظریں چرا کر بولی۔

''شرم تو لڑکیوں کے وصف ہیں۔ بقول تمہارے میرا ان سے کیا تعلق۔'' وہ ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر ہنسے۔ پھر اس پر جھکتے ہوئے بولے۔

''چلو گی ناں ہنی مون پر۔'' ان کی بے اختیاری پر وہ تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے حیا اور جھنجھلاہٹ سے بولی۔

''میں آپ کا سر پھاڑ ڈالوں گی۔''

''ہونا پھر پگلی۔'' فرطِ جذبات سے چور ہو کر انہوں نے سرگوشی سے کہا۔ اور اپنا تمام تر استحقاق استعمال کرتے ہوئے اسے بانہوں سے آزاد کر دیا۔

اور وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے سوچ رہی تھی واقعی نکاح ایک اٹوٹ اور پاک بندھن ہے۔ اور اس کی برکت اور تقدس سے میرے دل میں وہاج کے لیے محبت کے سوتے جاگے ہیں۔ اس رشتے کے سامنے تمام تعلق بے معنی اور مادی ہیں۔

☆ ☆ ☆

ختم شد